انجمن پنجاب





تاریخ و خدمات



ڈاکٹر صفیہ بانو

کفایت اکیڈمی

انجمن پنجاب

تاریخ و خدمات

ڈاکٹر صفیہ بانو

کفایت اکیڈمی

اردو بازار۔ کراچی

فون:۔ ۲۱۱۷۲۲

طبع اوّل : ——— ۱۹۷۸ء

تعداد : ——— ایک ہزار

طابع : ——— تنویر پروسس - کراچی

کتابت : ——— محمد عالم زیدی

زیر اہتمام : ——— امان اللہ نقوی

قیمت :-

مجلد لائبریری ایڈیشن - ۔۔ روپے

اسٹوڈنٹ ایڈیشن 48 روپے

ناشر : ——— مصنف
۷۷۵ - پیر الٰہی بخش کالونی - کراچی
(پاکستان)

اِنتساب

میں اِس کتاب کو اپنی پیاری آپا (والدہ)
محمودہ بیگم کی نذر کرتی ہوں
جنہوں نے بادشاہی میں فقیری کی۔

نمبر شمار	تفصیل موضوعات	صفحات

تعارف

۱۸۳۵ء میں جب لارڈ میکالے نے فارسی اثرات کو ختم کرنے اور انگریزی زبان کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا تو اِس لِسانی تبدیلی کے حکم پر پورے برصغیر میں بے چینی پھیل گئی۔ خاص طور پر یہ زد مسلمانوں پر تھی اور مسلمانوں میں عام بے چینی اور غیر یقینی کی حالت پیدا ہو گئی۔ لہٰذا اِن کی اشک شوئی کے لیے ۱۸۴۹ء میں کچھ مدت کے لیے اُردو کو سرکاری اور دفتری زبان قرار دیا گیا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوؤں اور انگریزوں کی سازش نے اُردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت شروع کر دی اور بنگال، سی پی، بہار اور یو پی میں ناگری رسم الخط کو سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن پنجاب میں اُردو زبان نے اتنی گہری جڑیں پکڑ لی تھیں کہ اِس صوبے سے اُردو کو ختم کرنا مشکل ہو گیا۔ انجمن پنجاب نے ڈاکٹر لائٹنز کی سرکردگی میں جو کارنامے سرانجام دیئے وہ ناقابل فراموش ہیں۔ انجمن پنجاب ہی کی کوششوں کی وجہ سے آج بھی صوبۂ پنجاب، اُردو ادب کی خدمت میں پیش پیش ہے۔

اُردو زبان کا پنجاب سے جتنا گہرا تعلق رہا ہے وہ کسی وضاحت کا محتاج

نہیں۔ برصغیر کے تمام ممتاز مورخوں اور ادیبوں نے اِس کا ذکر کیا ہے اور اہلِ پنجاب کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان کی ترویج و اشاعت میں اہلِ پنجاب نے ہر زمانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اِس حد تک کہ برصغیر پاک و ہند میں کسی صوبے سے پیچھے نہیں رہے۔

اگر ہم انجمن پنجاب کو بھی فورٹ ولیم کالج، مرحوم دہلی کالج وغیرہ کی طرح تک کلرک ساز ادارہ کہیں تو یہ سخت ناانصافی ہوگی۔ کیوں کہ اس انجمن کے روح رواں ڈاکٹر لائٹنر اگرچہ برطانوی نژاد نہیں تھے اور انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی کا بیشتر حصہ اسلامی ممالک میں گزارا تھا اِسی لیے وہ اسلامی تہذیب و ثقافت اور روایات سے واقف تھے۔ اِس کے علاوہ انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت کے عائد کردہ نظامِ تعلیم سے ہمدردی نہیں تھی بلکہ درحقیقت وہ اہلِ ہند کو ان کے تمدنی، ثقافتی اور تہذیبی ورثے سے محروم کرنا نہیں چاہتے تھے اِس لیے انجمن پنجاب میں علوم السنۂ شرقیہ کے احیاء کی پوری پوری حمایت کی۔ برطانیہ صرف سنسکرت کی سرپرستی کر رہی تھی لیکن انجمن پنجاب نے اورینٹل کالج قائم کر کے ثابت کر دیا کہ اِس کو کلکتہ یونی ورسٹی کی ماتحتی سے علیحدہ کر کے ایک الگ اورینٹل یونی ورسٹی کی شکل دی جاسکتی ہے جس میں برصغیر پاک و ہند کی تہذیب و روایات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُردو زبان میں جدید علوم پڑھائے جاسکتے ہیں۔ اِس تجویز کی حمایت کا اندازہ ۲۷ر ستمبر ۱۸۶۵ء کے جلسۂ خاص سے لگایا جاسکتا ہے۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اِس جلسہ میں ان تعلیم یافتہ انگریزوں کی کثرت تھی جو اورینٹل یونی ورسٹی قائم کرنے کے حامی تھے۔ جس کی تعلیم کی روشنی میں برصغیر پاک و ہند کی تہذیب و روایات کو برقرار رکھا جاسکتا تھا۔ اِس کے علاوہ ۳ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو لاہور کے کمشنر براَنڈرتھ نے اورینٹل یونی ورسٹی کی تجویز کو لیفٹیننٹ گورنر سر میکڈانلڈ میکلوڈ کے سامنے پیش کیا جس پر انھوں نے برطانوی حکومت سے مشورہ کرنے کے بعد یونی ورسٹی قائم کرنے کی سفارش کا وعدہ تو کر لیا لیکن گورنر کو محتاط رہنے کی ہدایت کی اور

اپنی نظامت تعلیمات میں تو کوئی نہ ملی کی نا ہی مدد کا وعدہ پورا کیا۔ البتہ اہل پنجاب کو عطیات کے ذریعے اورنٹیل کالج قائم کرنے اور اسناد دینے کی اجازت دے دی اور اسے یونی ورسٹی کا مرتبہ دینے سے انکار کر دیا۔

احیائے علوم مشرقی کے سلسلے میں انجمن پنجاب نے جو کردار ادا کیا ہے نہ صرف مستشرقین بلکہ برصغیر پاک و ہند کے تمام ممتاز مورخوں اور ادیبوں نے اس کا اعتراف اور تذکرہ کیا ہے۔ اگرچہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں فورٹ ولیم کالج مرحوم دہلی کالج سائنٹفک سوسائٹی اور مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ کے ساتھ انجمن پنجاب کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ لیکن انجمن کے متعلق مکمل معلومات حاصل نہ ہو سکیں چند بکھرے ہوئے مضامین ضرور دستیاب ہوئے جو انجمن پنجاب کے مکمل کوائف جمع کرنے کے سلسلے میں ناکافی تھے

صوبائی اور سرکاری لائبریریوں کے علاوہ جب ذاتی کتب خانوں سے رجوع کیا تب بھی بڑی ناامیدی ہوئی اور جب آغا باقر نبیرۂ آزاد کے متعلق حالات دریافت کئے گئے تو ان کی پیرانہ سالی اور بیماری کی وجہ سے لوگوں کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں۔ اور کس حال میں ہیں۔ آخر مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی وساطت سے آغا صاحب مرحوم کے یہاں پہنچی۔ وہ بیمار تھے۔ جب میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو مرحوم بہت خوش ہوئے ان کی دلی مسرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ باوجود بیماری کے ان میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ انجمن پنجاب کے متعلق مکمل مواد جو ایک بڑے چوبی صندوق میں بند تھا میرے حوالے کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ انجمن پنجاب سے متعلق اتنی معلومات دنیا میں کہیں موجود نہیں کیوں کہ ان کے پاس مولانا آزاد کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تمام تفصیلات اور انجمن پنجاب کے رسائل موجود تھے۔

اسی عرصے میں اورنٹیل کالج میں انڈیا آفس لائبریری لندن سے بھی انجمن پنجاب سے متعلق خط آچکا تھا جس میں انجمن پنجاب کی تفصیلات طلب کی گئیں تھیں جس سے اندازہ ہوا کہ وہاں بھی انجمن کے متعلق معلومات موجود نہیں بہر حال آغا صاحب

مرحوم کے پاس جو مواد موجود تھا وہ اِس قدر مکمل تھا کہ اِس کی افادیت کے ساتھ میرا جمع کیا ہوا مواد بہت کم مایہ ثابت ہوا۔ آغا صاحب مرحوم کے پاس مکمل کوائف کے علاوہ نادر مخطوطات طویل مقالے کرنل ہالرائیڈ کا انجمن پنجاب کی تحریک سے متعلق غیر مطبوعہ خط، نو مشاعرے، دسویں مشاعرے کے دو شاعروں کی غیر مطبوعہ نظمیں وغیرہ موجود تھیں۔ انجمن پنجاب ابھی تک صرف مشاعروں کی وجہ سے جدید اُردو شاعری کی محرک سمجھی جاتی ہے لیکن انجمن پنجاب کے رسالوں میں جدید نثر نگاری کے متعلق اتنا مواد موجود ہے کہ وہ بذاتِ خود تحقیق کے لیے ایک جامع عنوان کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ یہ مضامین نصابی، ادبی، سائنسی اور عام معلوماتی ہیں جو طبع زاد بھی ہیں اور ترجمہ بھی۔ ساتھ ساتھ مضمون سے متعلق نقشے اور خاکے بھی دیئے گئے ہیں۔ یہ مضامین اِس اعتبار سے بھی اہم ہیں کہ ہر شعبہ زندگی پر نہایت عام فہم اور خاص اسالیب کے حامل ہیں۔ انگریزی کے لاتعداد الفاظ جو نامانوس تھے اِن مضامین میں استعمال کر کے نیا اسلوبِ بیان اختیار کر کے اُردو زبان کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ مصنفین اور مترجمین نہ صرف مشہور و معروف شخصیتیں تھیں بلکہ ان میں طالب علم، اہلِ سیاست اور تجارت پیشہ اشخاص بھی تھے۔ یہ مضامین کبھی مکمل اور کبھی قسط وار شائع ہوتے تھے۔ یہ تمام مضامین نہ صرف ہمارے تہذیبی ثقافتی اور معاشرتی ورثے کی آئینہ دار ہیں بلکہ زندگی کی رفتار تیز کرنے میں اِن کا بہت بڑا ہاتھ ہے اس کے علاوہ خاص طور پر پنجابی مسلمان جو تین صدیوں سے ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں کی حکمت عملی سے کچلے ہوئے تھے انھیں ابھرنے کا موقع نصیب ہوا۔ جب ہم انجمن پنجاب کے ابتدائی ممبروں پر نظر ڈالتے ہیں تو چند معروف لوگوں کے نام ملتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ انجمن پنجاب کی سعی و کاوش سے پنجاب میں علم کو فروغ حاصل ہوا۔ خود سرسید،

ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، شبلی، حالی اور دیگر مصلحین و ادیب علی گڈھ کالج قائم کرنے کے لیے چندہ جمع کیا نے لاہور آئے اور انجمن کی کارکردگی کو خود دیکھا اور اِس سے استفادہ حاصل کیا۔ اور اس طرح سرسید کی تعلیمی تحریک کو زبردست تقویت حاصل ہوئی۔ آج پنجاب اور اس کے گرد و نواحی علاقوں اور دیہاتوں میں جو اردو زبان رائج ہے وہ انجمن پنجاب کی رہین منت ہے۔

عام طور پر ایک اور غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ کہ سنہ ۱۸۷۴ء میں "رسالہ انجمن پنجاب" بند ہوگیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ انجمن کے مشاعروں کی روئیداد جو اِس رسالہ میں شائع ہوتی تھی اسے ضمیمہ کے طور پر "گلدستہ" کے نام سے شائع کیا جاتا تھا۔ اور انجمن کے جلسۂ خاص و عام میں جو مضامین پڑھے جاتے تھے وہ "رسالہ انجمن پنجاب قصور" میں شائع ہوتے تھے۔ جو رسالہ انجمن پنجاب ہی کی ایک شکل تھی جس نے بعد میں "رسالہ انجمن قصور" کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اِس کے علاوہ جب لاہور کے مشاعروں میں حکومت برطانیہ کے استبداد اور سنہ ۱۸۵۷ء کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی گئی اور سرکاری اخباروں نے مشاعروں کی مخالفت شروع کی اور مشاعرے بند ہوگئے جس کا ثبوت آخری دو مشاعرے ہیں جو شائع نہ ہوسکے "رسالہ انجمن پنجاب" اپنی اولین شکل میں شائع ہونے لگا۔

"انجمن پنجاب" کے سرکاری عہدے دار جن کا تبادلہ دوسرے صوبوں یا شہروں میں ہو جاتا تھا وہ وہاں پہنچ کر انجمن کی شاخیں قائم کرتے اور لاہور کی طرح وہاں بھی تعلیمی درسگاری کے اداروں کے قائم کرنے کے علاوہ رفاہِ عامہ کے سلسلے میں اہم اقدامات کرتے اور مقامی باشندوں کو ممبر بنا کر ادب، معاشرت ثقافت وغیرہ کے ہر اہم مسئلے پر مضامین لکھ کر "انجمن پنجاب لاہور" کو بھیجتے تھے جہاں پھر ان کو جلسۂ عام میں پڑھ کر رائے لی جاتی اور انھیں شائع کیا جاتا۔ آخر کار مولانا آزاد کے زمانۂ جنون میں یہ رسالہ بند ہوگیا۔ لیکن "انجمن پنجاب" کی

کارکردگی جاری رہی جس کا ذکر سرکاری گزیٹرز اور ایجوکیشنل رپورٹس میں درج ہے۔

مقالے کی ابتداء میں آریاؤں کی آمد سے لے کر محمد بن قاسم کے زمانے تک، پراکرتوں اور اپ بھرنشوں پر عام بحث کی گئی ہے پھر صوفیائے کرام کی مقامی زبانوں میں تبلیغ کا ذکر کیا گیا ہے جس میں صوبہ سرحد اور کشمیر بھی شامل ہے بابا فرید گنج شکر اور گرونانک کے زمانے تک فارسی اور ہندی کے الفاظ فارسی شاعری کے اثرات اور زبان کی تشکیل کا ذکر کیا گیا ہے اور ۱۸۵۷ء تک قدیم وجدید پنجابی کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے اور دیگر صوبوں میں بھی زبان کی ابتدائی ترقی کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں فورٹ ولیم کالج۔ دلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ یونی ورسٹی کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرا باب انجمن پنجاب کے سیاسی اور سماجی پس منظر پر مبنی ہے۔ برصغیر پاک وہند کے اس تاریک دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم، زرکشی، بدعہدی مسلم کشی اور ہندوؤں کی سرپرستی کا احوال درج ہے اس کے علاوہ اس زمانے کے رائج علوم مسلمانوں کی بے چارگی اور بے کسی کے ساتھ ان کی اخلاقی اور تہذیبی کمزوریوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی جدید ادب اور سرسید اور سید محمود کی تعلیمی مساعی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے باب کا تعلق انجمن پنجاب کے قیام، مقاصد اور تاریخ سے ہے۔ اور اس کی کارکردگی کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ جلسۂ خاص اور جلسۂ عام کی روئیداد تاریخ وار بیان کی گئی ہے۔ جس میں مذہبی، معاشی، زرعی سائنسی اور ادبی مضامین پر بحث ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شہروں میں انجمن کی شاخوں کا احوال کتب خانے کھولنا، زرعی اور دست کاری کی نمائشیں منعقد کرنا، اسکول کھولنے اور ان کے متعلق رپورٹ، دیہاتوں میں پنچائتیں قائم کرنا نئے

ممبروں کو نامزد کرنا اور حکومت اور انجمن کے مابین جو خط و کتابت ہوئی تھی اس پر جلسۂ عام میں بحث کر کے حکومت کو مطلع کرنا غرض ہر شعبۂ حیاتِ زندگی کو زیر بحث لا کر انجمن کا حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ بن جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں احیائے علومِ مشرقی کے سلسلے میں اورینٹیل کالج کے قیام کی ابتدائی کوششوں سے یونیورسٹی کے قیام تک کے حالات اور اس سے متعلق حکومت اور انجمن کے درمیان خط و کتابت کا حال درج ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادبیات کے فروغ کے لیے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے مل جل کر جو کوششیں کیں اور جو مخالفتیں ہوئیں وہ زیر بحث لائی گئیں ہیں خاص طور پر تقریباً تین سو ساٹھ مضامین اور کتابیں جو نصابی اور غیر نصابی موضوعات پر لکھی گئیں ان کا مختصر احوال درج ہے۔ جو اردو زبان و ادب، تخیلات اور اسالیب کے انقلاب کا ذریعہ ثابت ہوئیں اور جن کی وجہ سے اردو لغت میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

پانچویں باب میں انجمن پنجاب کے مشہور مشاعروں کی تفصیل اور ہر مشاعرے کے کلام سے انتخاب دیا گیا ہے، یہ دس مشاعرے ہیں ان مشاعروں کی نظموں اور مثنویوں میں جدید خیالات اور موضوعات کا ذکر ہے اگرچہ حکومت وقت کی طرف سے سیاست کے موضوع کو ممنوع قرار دیا گیا تھا لیکن وہ شعرا جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ وہ چپ نہ رہ سکے سرکاری اخباروں کی مخالفت اور شعراء کی آپس کی چشمک کی وجہ سے دسواں مشاعرہ شائع نہ ہو سکا۔ البتہ دو شاعروں کا کتابت شدہ کلام حاصل ہو گیا تھا جسے اس باب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

چھٹے باب میں اردو ادب کے تنقیدی مضامین کا ذکر ہے جس میں سب سے زیادہ مضامین مولانا آزاد کے ہیں اس باب میں تذکرہ نگاری سے لے کر

آبِ حیات تک کے تنقیدی مضامین کی نشاندھی کی گئی ہے۔ اِس کے علاوہ انجمن کے جلسوں میں جو اُردو زبان کے ادبی مضامین پڑھے گئے۔ اِن کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

ساتویں باب میں انجمن کی لسانی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں نئے اسالیب، نئے الفاظ کا مناسب استعمال اور ان سے متعلق مضامین کا ذکر موجود ہے۔

آٹھویں باب میں رسالہ انجمن پنجاب کے جاری ہونے کی تاریخ، اِس کے اسباب اور رسالے کی افادیت کا ذکر ہے۔

نویں باب میں پنجاب اور دیگر صوبوں میں انجمن پنجاب کے مرتب شدہ اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اِس کے علاوہ سرسید کی علمی تحریک کو انجمن نے کس طرح متاثر کیا اور کون کون سے ایسے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل تھے جن کی وجہ سے انجمن کی کارکردگی میں رفتہ رفتہ انحطاط شروع ہوا اور کس طرح یہ انجمن ختم ہو گئی، ذکر کیا گیا ہے۔

مندرجات مقالہ کے بعد نامناسب نہ ہوگا اِس نوبت پر میں اپنے مشفق اساتذہ کرام یعنی ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر عبدالقیوم اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحبان کی اس مقالے کی افادیت، اہمیت اور وقعت کے بارے میں وقیع و مستند آراء کو پیش کروں

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب تحریر فرماتے ہیں :

بدقسمتی سے اب تک اُردو ادب کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے جو صرف اکابر شعراء ادباء کے ناموں اور کاموں کا مجموعہ نہ ہو بلکہ جس میں اُردو ادب کے مختلف رجحانات اور اسالیب کی نشان دہی مختلف ذہنی، ادبی اور لسانی تحریکوں اور اداروں کے حوالے سے کی گئی ہو۔ خوش قسمتی سے بعض اہم اداروں پر اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں، اور اِن کتابوں کے مطالعے سے

اردو ادب کی تاریخ کے مراحل پڑھنے والوں پر واضح ہو جاتے ہیں۔ بعض ادباء و شعراء کے سوانح اور کارناموں کے ایسے جائزے بھی گزشتہ برسوں میں شائع ہوتے ہیں جن میں اُن اداروں اور تحریکوں کے اثرات کی نشان دہی کی گئی ہے جن سے وہ ادباء شعراء وابستہ ہوئے۔

افراد اور تحریکوں اور اداروں کا باہمی رشتہ بہت سے مسائل اور نکات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایک طرف تحریک، افراد کو کسی بڑے مقصد سے وابستہ کرکے اُن کے فکر و فن کی دنیا بدل دیتی ہے۔ اور دوسری طرف یہ لکھنے والے اُس تحریک کی علامت اور اشارہ بن جاتے ہیں۔

اِن معروضات کی روشنی میں جب آپ صفیہ بانو کے تحقیقی مقالہ انجمن پنجاب کا مطالعہ کریں گے تو انیسویں صدی میں اُردو ادب کے سفر کے نقوش واضح تر ہوتے جائیں گے۔ "جدید نظم" کے حوالے سے ادب کے عام قاری "انجمن پنجاب" کے نام سے آشنا رہے ہیں۔ پھر ڈاکٹر اسلم فرخی نے محمد حسین آزاد پر اپنے تحقیقی کام میں انجمن پنجاب کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ایک ایسے تفصیلی مطالعے کی ضرورت تھی جو انجمن پنجاب کی خدمات کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کر سکے۔ ڈاکٹر صفیہ بانو نے اِس ضرورت کو پورا کیا ہے اور اِس طرح کہ صرف انجمن پنجاب کی خدمات کا مرقع ہی تیار نہیں ہو گیا بلکہ یہ کتاب دوسرے اداروں پر کام کرنے والوں کے لیے نمونہ کا کام دے گی۔

ڈاکٹر صفیہ بانو نے انجمن پنجاب کا مطالعہ برِاعظم کی تاریخ کے پس منظر میں صحیح تناظر کے ساتھ کیا ہے۔ برِعظیم کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اردو کے اولین ادارے بھی ان کے تناظر کا حصہ ہیں۔ فورٹ ولیم کالج، دلی کالج اور سائنٹفک سوسائٹی کی علمی خدمات کو انھوں نے اختصار اور سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اِس پس منظر میں مصنفہ نے "انجمن پنجاب" کی خدمات کے نقوش کو ابھارا ہے۔ انجمن پنجاب کے نام کے ساتھ ادب کے عام قاری اور طالب علم کے ذہن میں مشاعروں کا خیال آتا ہے۔ وہ مشاعرے جو "جدید" طرز کی شاعری کا مطلع بنے اِس مقالے میں اِن مشاعروں کے علاوہ انجمن پنجاب کے دوسرے کارناموں کا ذکر صحت، تفصیل اور علمی تجزیہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اردو زبان و ادب کے علاوہ علوم مشرقیہ کے احیاء میں "انجمن پنجاب" کا حصہ ایسا نہیں جس سے صرفِ نظر کیا جا سکے۔

محترمہ صفیہ بانو کے اِس مقالے کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی اور "انجمن پنجاب" کے ایک تقابلی مطالعہ اور تجزیہ کی ضرورت ہے۔ صفیہ بانو صاحبہ نے اِس باب میں سمت نمائی کی ہے اور اِن اداروں کے باہمی تعلق کو کسی نہ کسی حد تک اجاگر کیا ہے۔ ایسا مطالعہ محض ادبی اور لسانی ہی نہیں ہوگا بلکہ اس سے اُردو میں سائنسی ادب اور ہمارے معاشرہ میں سائنسی نقطۂ نظر کی تاریخ بھی مرتب ہو سکے گی۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ ہمارے اسلاف نے روایتی زندگی کے سانچے کو بدلنے کے سلسلہ میں زندگی کے ساتھ سائنس اور نئے علوم کی پیوندکاری کس طرح کی۔

ڈاکٹر صفیہ بانو نے "انجمن پنجاب" کی خدمات اور دائرہ کار کے ہر پہلو کو اپنے اِس مقالے میں یوں سمیٹا ہے کہ نئی معلومات ہمارے سامنے آئی ہیں۔ احیائے علوم مشرقی زبان و ادب کے بارے میں انجمن کا کام، مشاعرے، لسانی خدمات اور انجمن کے اخبار کا جائزہ۔ اِن تمام پہلوؤں کے جائزے کے بعد انھوں نے ہماری زبان و ادب پر "انجمن پنجاب" کے اثرات کو پیش کیا ہے۔ اِس باب سے اُن کی قوتِ تجزیہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر اِس مطالعے کی نمایاں اور بنیادی خصوصیت اِس کا تسلسل ہے۔ ڈاکٹر صفیہ بانو نے "انجمن پنجاب کی روئداد، ایک تاریخی کہانی کی طرح پیش کی ہے، اور اس طرح کے موضوعات اور اِفرادِ کردار، دونوں کے ساتھ انصاف کیا ہے

اِس مقالہ کے ضمیمے تحقیقی قدر و قیمت کے حامل ہیں، مگر طباعت و اشاعت کی دشواریوں کی وجہ سے غالباً مصنفہ نے انھیں کتاب میں شامل نہیں کیا ہے تاکہ اخراجات طباعت میں کمی ہو سکے۔ یہ صورت حال نہایت افسوس ناک ہے۔ اِس سے ہمارے ادبی، علمی، اداروں کی کارکردگی بھی سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر صفیہ بانو نے کئی ایسے اداروں کے دروازے پر اِس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں دستک دی جنھیں معقول سرکاری امداد ملتی ہے اور جو کسی منصوبہ بندی کے بغیر کتابیں شائع کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ادارہ اِس کی اشاعت پر رضامند نہیں ہوا۔ اور حیلہ جوئی کے طور پر بعض اعتراضات اٹھائے گئے۔ تکمیل اور خطا سے بلند تر ہونا مقدر انسانی نہیں، لیکن اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ ڈاکٹر صفیہ بانو کا یہ مقالہ اپنے دور میں نہایت اہم ادبی اور تاریخی مطالعہ ہے۔

ابوالخیر کشفی

ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب فرماتے ہیں۔:

محترمہ ڈاکٹر صفیہ بانو مقالہ "انجمن پنجاب" میں نے شوق سے پڑھا تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے یہ مقالہ قابلِ توجہ ہے۔ اِس انجمن نے اُردو شاعری میں ایک نئے انداز کو روشناس کرانے میں جو خدمت انجام دی ہے وہ اُردو ادب کی تاریخ کا اہم باب ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں اُردو ادب میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اس میں "سرسید تحریک" اور "رسالہ تہذیب الاخلاق" کے ساتھ انجمن پنجاب کی کوششوں کو بھی دخل ہے۔ اِس لحاظ سے یہ انجمن ادبی تاریخ میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

اگر یہ مقالہ شائع ہو جاتے تو اس سے ادب کے طالب علموں کو فائدہ پہنچے گا۔ خاص کر ایم اے کے طالب علموں کو ادب کی تاریخ پڑھنے اور سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

(ڈاکٹر) عبدالقیوم جامعہ کراچی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے تاثرات حسبِ ذیل ہیں۔ :

انجمن پنجاب "نہ صرف صوبۂ پنجاب بلکہ برصغیر پاک و ہند میں خاص اہمیت کی مالک ہے۔ یہ پہلی انجمن ہے جس نے ڈاکٹر لائٹنر کی رہنمائی میں مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی حفاظت و ترقی کی طرف توجہ کی اور حکومت کی توجہ مبذول کرائی، اس انجمن کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوؤں کی مسلسل مخالفت کے باوجود، صوبہ پنجاب کے سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اُردو برقرار رہی ۱۸۴۹ء میں پنجاب۔ انگریزوں کی عملداری میں داخل ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۸۳۷ء کے سرکاری احکام کے مطابق ۱۸۴۹ء کے بعد پنجاب میں بھی فارسی کی جگہ اُردو کو رائج کر دیا گیا ۱۸۵۷ء کے ہندوؤں اور انگریزوں کی متحدہ سازش نے اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت شروع کی اس نے ہندو اور مسلمان کے درمیان اختلاف کی ایسی خلیج حائل کر دی کہ سرسید جیسے صلح پسند کو ۱۸۶۷ء میں مجبوراً کہنا پڑا کہ اب ہندو اور مسلمان مل جل کر نہیں رہ سکتے۔ سرسید کا بیان اِس دو قومی نظریے کا نقطۂ آغاز تھا جس نے آخر پاکستان کو جنم دیا۔ ہندوؤں نے اُردو کی مخالفت میں جو آواز بلند کی تھی وہ اِس میں خاصے کامیاب ہوئے انیسویں صدی کے آخر تک وہ بنگال، سی پی، بہار اور یو پی سب میں ناگری رسم الخط کو سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن انجمن پنجاب کی کوششوں کی بدولت وہ صوبہ پنجاب میں کامیاب نہ ہو سکے وجہ یہ تھی کہ انجمن پنجاب کے سربراہ اور بانی ڈاکٹر لائٹنر غیر برطانوی تھے اور ان کا نقطۂ نظر ان انگریزوں سے بہت مختلف تھا جو سیاسی طور پر ہندی کو اُردو پر غالب کرنا چاہتے تھے۔ اِس پس منظر میں اِس بات کی سخت ضرورت تھی کہ انجمن پنجاب کا تحقیقی جائزہ لیا جائے۔ اس کی تعلیمی، سیاسی، لسانی، سماجی اور ثقافتی جائزہ لے کر اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے، ساتھ ساتھ یہ دیکھا جائے کہ اس نے بالواسطہ، تحریک پاکستان

اور مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ میں کیا اہم کردار ادا کیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صفیہ بانو نے بہ حسن وخوبی اِس کام کو انجام دیا۔ انھوں نے انجمن کے ہر پہلو اور ہر شعبے پر بنیادی ماخذوں کی روشنی میں بحث کی ہے۔ اور نتائج اخذ کیے ہیں ان کا کام کئی لحاظ سے قابل توجہ ہے اور اِس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اِس مقالے کو جلد سے جلد شائع کیا جائے تاکہ اِس سے عام وخاص خصوصاً اُردو کے وہ طلباء جنھیں تحقیق وتنقید کا ذوق ہے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

فرمان فتح پوری۔

آخر میں اِس مقالے کی تدوین وتبویب میں جن جن مکرم حضرات نے میری رہنمائی اور امداد فرمائی اِن میں سب سے پہلے میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی بے حد شکر گذار ہوں جنھوں نے میری رہنمائی کی ورنہ میں قلم اٹھانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ نیز آغا محمد باقر مرحوم خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے جن کی عنایت خاص سے مجھے وہ مواد حاصل ہوا جس کی مدد سے مقالے کی تکمیل ممکن ہو سکی۔ اِن کے علاوہ مولانا غلام رسول مہر، شیخ اسمٰعیل پانی پتی، ممتاز حسن صاحب اور پروفیسر حمید احمد خاں مرحومین کو اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے جنھوں نے میری ہر طرح ہمت افزائی کی۔

میں اپنے مشفق اساتذہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے اپنے قیمتی مشوروں سے مجھے سرفراز کیا۔ میں خاص طور پر جناب مشفق خواجہ صاحب کی ممنون ہوں جنھوں نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے کتب خانۂ خاص سے استفادہ حاصل کرنے کی آسانیاں بہم پہنچائیں۔ ان کے علاوہ کرنل مجید ملک مرحوم اور پیر حسام الدین راشدی صاحب کی بھی احسان مند ہوں جنھوں نے مجھے اپنے کتب خانوں سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔

اِس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں پروفیسر شبیر علی کاظمی صاحب کی ممنون

احسان ہوں کہ ان کی امداد کے بغیر یہ تمام تحقیقی کاوشیں منظر عام پر نہیں آسکتی تھیں اور امان علی نقوی صاحب اگر اِس مقالے کو ٹائپ کرنے کے علاوہ دیگر ذمہ داریاں قبول نہ کرتے تو اِس مقالے کی طباعت ناممکن ہو جاتی۔ اِس مقالے میں جتنی غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں ان سب کا میں اعتراف کرتی ہوں لیکن یہ ایک کوشش ہے جو اس سلسلے میں کام کرنے والوں کے کچھ کام آسکے گی۔

صفیہ بانو

تمہید

اردو کی ابتدا اور ترویج واشاعت میں

پنجاب کا حصّہ

تمہید

اُردو کی ابتدا اور ترویج و
اشاعت میں پنجاب کا حصّہ

ہندوستان میں آریاؤں کی آمد سے قبل نیگرائڈ، پروٹوسٹرالائڈ اور خاص طور دراوڑ قومیں اپنا قدم جما چکی تھیں جن کی تہذیب کے حیرت انگیز آثار ہمیں ہڑپا اور موہن جو داڑو میں ملتے ہیں[1]۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اور دیگر محققین نے مذہب اور رسم و رواج میں اِن کی بدلتی ہوئی تہذیب کی نشاندہی کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے قبل اِن قوموں پر زوال آچکا تھا۔ آریا قوم وسط ایشیا سے ایران پہنچی، یہاں سے تہذیبی اور لسانی اثرات لیے ہندوستان میں وارد ہوئی اور مختلف اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ یہ لوگ ۲۵۰۰ سنہ قبل مسیح سے لے کر سنہ ۱۵۰۰ قبل مسیح تک مختلف اوقات میں مختلف گروہوں کی شکل میں ہندوستان آتے رہے۔ چند گروہ شمالی ہند کی طرف چلے گئے، کچھ پنجاب اور سندھ کے مضافات میں پھیل گئے اور کچھ گنگا کی وادی سے بڑھ کر بنگال تک پہنچ گئے۔ اِن

---

[1] چٹرجی، ایس کے "بھارتیہ آریہ بھاشا اور ہندی" دہلی: راج پرکاش، سنہ ۱۹۵۴ء

کی اصل زبان کے متعلق اب تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ البتہ لسانیات کے محققین کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ آریوں کی جو اصل بنیادی زبان تھی اس کے مشترکہ آثار مختلف زبانوں میں ملتے ہیں۔ چناں چہ ایران کی قدیم اوستائی اور ہندوستان کی قدیم ویدک سنسکرت میں اِس طرح کا اِشتراک واضح ہے۔

جن مقامی لوگوں سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے یہ آگے بڑھے ان میں کول اور دراوڑ قومیں پیش پیش تھیں۔ اِن قوموں نے آریاؤں کی تہذیب اور زبان کو بہت متاثر کیا۔ یہاں تک کہ قدیم ترین قواعد نویسی "پانِنی"ؔ[1] کو اِس زبان کے محفوظ کرنے کے لیے قواعد وضوابط بنانے پڑے ادبی حیثیت سے یہ زبان نکھر کر سنسکرت کی شکل میں ہمارے سامنے آئی۔ عوام سے اِس کا ناطہ ٹوٹ گیا۔ یہ ادبی اور پڑھے لکھے طبقے کی زبان تو ضرور بن گئی اور اسے مذہبی حیثیت بھی حاصل ہو گئی لیکن اب یہ محض فاتح طبقے کی زبان بن گئی جو اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی زبان سنسکرت کے علاوہ مفتوحین کی ہر بات کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور خود کو مفتوح قوموں سے بالکل علاحدہ رکھتا تھا لیکن زندگی کی ضروریات کے باعث علاقائی زبانیں وجود میں آئیں جو پراکرت کہلائیں اور پورا ہندوستان اِن پراکرتوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ شمال میں پشاچی دوابہ میں شورسینی، جنوب میں مہاراشٹری بہار و بنگال میں ماگدھی اور ارماگدھی عوام میں رائج ہو گئیں۔ یہاں تک کہ یہ مختلف مذاہب کے پیشروؤں کی پسندیدہ اور عوام کی مقبول زبانیں قرار پائیں اور آخر یہ بھی ادبی زبانیں بن کر محدود ہوتی چلی گئیں۔ عام بول چال

---

[1] "پانِنی" اِس اعتبار سے قدیم ترین ہے کہ اِس سے پہلے کی لکھی ہوئی مرتب قواعد موجود نہیں۔ ورنہ خود "پانِنی" نے اپنے بکثرت پیش روؤں کا ذکر کیا ہے۔

میں اِن کے عوامی روپ اپبھرنش شکلوں میں باقی رہ گئے۔ پراکرتوں کے اصلی نام اپنی جگہ برقرار رہے اور اپ بھرنش نچلے طبقے کی زبان بن گئی۔ اِس زمانے کے ناٹکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہم کرداروں کی زبان سنسکرت یا ادبی پراکرت ہوتی تھی لیکن نچلے طبقے کے کردار اپ بھرنش بولتے تھے۔

اب اپ بھرنش بھی پانچ حصوں میں تقسیم ہوگئی لیکن اِن کے نام وہی تھے جو پراکرتوں کے تھے۔ یہ نام جدا جدا علاقوں کی وجہ سے تھے۔ پشاچی اپ بھرنش تقریباً سندھ سے لے کر سرسوتی ندی تک بولی جاتی تھی۔ شورسینی متھرا، قنوج، دہلی اور انبالہ تک کی زبان تھی۔ مہاراشٹری مہاراشٹر کی زبان تھی جس کی یادگار موجودہ مرہٹی زبان ہے۔ ماگدھی علاقہ مگدھی کی اردھماگدھی — بہار اور بہار سے ملتے ہوتے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ پشاچی اور شورسینی اپ بھرنشوں کی حدود آپس میں ملتی تھیں اِسی لیے ایک دوسرے سے متاثر تھیں۔ شورسینی اپ بھرنش کی دو شاخیں برج بھاشا اور اودھی تھیں اور پشاچی کی بھی دو شاخیں کی گئی اور ٹکی ہیں۔ یہ پنجاب کی دو مقامی بولیاں تھیں دورِ حاضر کی پنجابی ٹکی بولی کی جانشین ہے۔ نتیجتاً شورسینی اور پشاچی کے میل سے اردو زبان کی ابتدا ہوئی۔

مولانا محمد حسین آزاد اُسے شورسینی اپ بھرنش کی شاخ برج بھاشا سے منسوب کرتے ہیں لیکن پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اسے شورسینی اپ بھرنش کی شاخ بتاتے ہوتے تحریر کرتے ہیں:

"اول یہ خصوصیت ہے کہ شورسینی اپ بھرنش کی جتنی آمیزش پنجابی میں پائی جاتی ہے اتنی کسی اور ہند آریائی زبان میں نہیں ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کی مہمان نوازی جتنی پنجابی

نے کی ہے وہ شاید ہی کسی دیگر ہند آریائی زبان کے حصے میں آئی ہو۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ جتنے غیر ملکی الفاظ پنجابی قدیم و جدید ادب میں مستعمل ہیں اور کسی بھی ہند آریائی زبان میں نہیں۔ خاص کر پنجابی زبان میں برقی آمیزش اسلام کے حملے کے ساتھ ہوتی ہے۔[1]

تاریخی شواہد سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہندوستان و عرب کے درمیان تجارتی سلسلہ مدت دراز سے قائم تھا۔ عربی تاجر سمندری راستوں سے ہندوستان کی مغربی بندرگاہوں پر آتے اور مال بیچتے اِس کا عربی نام چھوڑ جاتے اور جو چیزیں یہاں سے خریدتے ان کے ہندی نام ساتھ لے جاتے۔

سنہ ۷۱۲-۱۳ء میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کر لیا اور مسلمان دریائے سندھ کے دہانے سے لے کر ملتان تک قابض و متصرف ہو گئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ کچھ عرصے بعد قرامطہ اور دیگر عرب کے قبیلوں کی جماعتیں بھی یہاں آکر آقامت گزیں ہو گئیں۔ مسعودی اور ابن حوقل نے ان مقامات کا سفر کیا ہے لکھتے ہیں کہ مسلمان سارے صوبے پر قابض و متصرف تھے ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات نہایت خوش گوار تھے۔[2]

محمد بن قاسم کا مقابلہ کرنے والے راجہ داہر کے باپ کے متعلق تاریخ "معصومی" میں لکھا ہے کہ وہ ہندوی زبانوں کا نہ صرف ماہر تھا بلکہ اِن کے

---

[1] ہلال احمد زبیری (مترجم) "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"،
از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف، کراچی یونی ورسٹی
سنہ ۱۹۶۷ء، ص ۳۷-۳۴

[2] طالب، محمد فدا علی (مترجم) "تاریخ فرشتہ"، از محمد قاسم فرشتہ، حیدر آباد دکن: سن ندارد ج اول

رسم الخط سے بھی واقف تھا۔ یہاں اِس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان سندھ کے علاوہ باقی علاقہ جات کو ہند کے نام سے پکارتے تھے۔ اور چوں کہ اِن کی آبادی میں پنجاب بھی شامل تھا لہٰذا پنجاب ہی کی زبان کو زبانِ ہندوی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مسعودی ہی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ پانچ دریاؤں کے درمیانی علاقے کا نام پنجاب بھی مسلمانوں ہی کا دیا ہوا ہے۔[۲]

محمود غزنوی کے عہد میں پنجاب میں اِسلامی حکومت قائم ہوئی اور اِسی کے عہد میں مشہور شاعر مسعود سعد بن سلمان نے اپنا دیوان ہندی میں مرتب کیا جس کا ذکر ہی قدیم نسخوں میں ملتا ہے لیکن اصل دیوان ناپید ہے۔ اِس عہد کی سرکاری زبان فارسی تھی لیکن عوام اب بھی مقامی اپ بھرنش میں گیت اور دوہے لکھتے رہے۔ اِس عہد کی تصانیف دستیاب نہیں مگر مسعود سعد بن سلمان کے فارسی دیوان سے پتا چلتا ہے کہ "بارہ ماہ" "اٹھوارہ" وغیرہ اصنافِ سخن پنجابی زبان میں مستعمل تھے اور پنجابی زبان اپ بھرنش کی جگہ لے رہی تھی۔

جب ہم فارسی اور اپ بھرنش پر ایک غائر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اِن دونوں کے امتزاج سے پنجابی زبان تشکیل پا رہی تھی جو درحقیقت اُردو ہی کی ایک شکل تھی اور یہی زبان پورے ہندوستان میں مختلف ناموں کے ساتھ پرورش پا رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اُردو میں ہمیں ایسے ضمائر اور افعال یکساں طور پر مل جاتے ہیں جو رواج پا

---

[۱] اختر رضوی (مترجم)، "تاریخ سندھ المعروف بہ معصومی"، از معصوم بھکری، میر محمد، حیدرآباد، سندھ، سندھی ادبی بورڈ، سن ندارد

[۲] برعظیم پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ، محولہ بالا، ص ۳۵

چکے تھے۔

یہ مشترک عناصر دراصل پنجابی اور اُردوئے قدیم کے علاوہ دوسری[1] قدیم وجدید زبانوں میں بھی ملتے ہیں۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی مشہور تصنیف "معراج العاشقین"، جو دکن کی تصنیف ہے اِس میں اور پنجاب میں مولانا عبدی کی تصنیف "رسالہ فقہ ہندی" کے اکثر الفاظ یکساں ہیں یہ اورنگ زیب عالم گیر کا عہد ہے۔

مولوی عبدالحق، محمود خاں شیرانی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور دیگر محققین اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ خانقاہ نشینوں ہی نے اُردو زبان کو اس قابل کیا کہ عوام ان سے قریب تر ہو جائیں۔ اِن بزرگوں کا تعلق عوام سے تھا۔ مقامی اور پردیسی اِن سے فیض حاصل کرتے تھے۔ اِس کے علاوہ صوفیائے کرام اکثر سیاح اور جہاں گرد ہوتے تھے۔ اِدھر اُردو پورے ہندوستان پر چھائی ہوئی تھی۔ لہٰذا سیاحوں، صوفیوں اور سپاہیوں کے لیے اِس زبان کا جاننا نہایت ضروری تھا۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صوفی، خدا پرست اور اہل علم مسلمان جہاں بھی پہنچے وہاں انھوں نے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچایا مگر اظہارِ خیال کے لیے مقامی بولی کو اپنایا۔ سندھ میں جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو ابتدا ہیں منصورہ اور ملتان علماء اور ادبا و صوفیائے کرام کا ملجاو ماوا تھا۔ مگر جب غزنوی حکومت پنجاب پر قائم ہوگئی تو لاہور علمی وادبی مرکز بن گیا۔ شیخ ہجویری داتا گنج بخش، مسعود سعد بن سلمان، ابوریحان البیرونی اور سلطان سخی سرور وغیرہ کا دور تھا۔ ملتان میں شیخ فرید نے بھی جدید زبان کا سنگِ بنیاد رکھا۔ بابا فرید

---

[1] محمود خان، شیرانی، "پنجاب میں اُردو"، لاہور: مکتبہ معین الادب، طبع سوم، سن ندارد، ص ۲۹۵

گنج شکر عربی و فارسی کے متبحر عالم تھے۔ لیکن عوام تک روحانی پیغام پہنچانے کے لیے یہی جدید زبان اختیار کی جو ہندو اور مسلمانوں کے اتصال سے پیدا ہوتی تھی۔ آپ اُردو کے اولین ریختہ گو کہے جا سکتے ہیں دوسرے الفاظ میں ۱۱۷۳ء سے ۱۲۶۵ء تک جدید زبان کا سنگ بنیاد اِن ہی صوفی بزرگ کے ہاتھوں رکھا گیا۔

مولوی عبدالحق کی تصنیف "اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ"، پاکستان ایڈیشن میں صفحہ ۱۱ پر بابا فرید گنج شکر سے منسوب یہ غزل موجود ہے:

وقت سحر وقت مناجات ہے　　خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا　　خسب چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
با تن تنہا چہ روی زیر زمیں　　نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج کہ بدل جاں شنو　　ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

اگرچہ آپ کا پورا کلام موجود نہیں لیکن گرو نانک کی مذہبی کتاب "جنم ساکھی" میں ان کی اولاد میں شیخ فرزند ثانی کا کلام ایک حد تک محفوظ ہے۔ "گرو گرنتھ میں راگ آسا" کے آخر میں خواجہ فرید کے دو شبد درج ہیں۔ دوسرے شبد سے اقتباس یہ ہے:

بولے سیکھ پھرید (شیخ فرید) پیارے اللہ لگے
ایہ تن ہوسی کھاک (خاک) نمانی گور کھرے
آج ملاوا سیکھ پھرید (شیخ فرید)
ٹاکم کو جرڑیاں، منہہ چھرڑیاں،
جے جانا مر جاییے گھوم نہ آییے
جھوٹی دنیا لگ نہ آپ ونجاییے

بولیے سچ دھرم جھوٹ نہ بولیے
جو گو لو سے واٹ مرید ان جو لیے
جھیل لنگھند سے پار گوری میں دھریا
کنچن ونے پا سے کلوت چیریا
سیکھ دیشخ، ھیاتی حیاتی جگ نہ کوئی تھر رھیا
سنہ ۱۱۷۳ء سنہ ۱۶۰۶ء[1]

آپؒ کے متعلق مشہور ہے کہ جب شیخ جمال الدین کا انتقال ہوا تو ان کی خادمہ مولانا برہان الدین کو لے کر جو ابھی بچے ہی تھے بابا فرید کی خدمت میں حاضر ہوئیں بابا فرید نے اُنھیں اپنا خلیفہ قرار دیا تو مادر موموناں حیران ہو کر بولیں "خواجہ بالا ہے" اِس پر بابا فرید نے جواب دیا "بولوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے"۔ یہ ہے وہ زبان جس میں پنجابی کا " وا " کے بجائے " کا " استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن سکھوں کا بیان ہے کہ وہ فرید الدین ابراہیم کا کلام ہے۔ جو گرو نانک کے معاصر تھے۔ اس کا ذکر "سیرۃ الاولیاء" میں بھی موجود ہے۔

مولوی عبدالحق نے ایک پرانی بیاض سے بابا فرید کے چند اشعار بھی نموننتاً دیتے ہیں جن میں سے دو یہ ہیں:[2]

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک
پیش رو اصفیا کے ہوتے حوک
ریش سبلت سے گر پڑتے ہوتے
یو کڑواں سے نہ کوئی پڑے ہوتے

---

[1] عباد اللہ گیانی، "گرو گرنتھ اور اُردو"۔ لاہور: مرکزی اُردو بورڈ
[2] محمود خاں شیرانی، "پنجاب میں اُردو"، محولہ بالا، ص ۳۰۰

اِدھر دہلی میں امیر خسرو اور بہار میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری جیسے بزرگ بھی اسی زبان میں جادو جگا رہے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ امیر خسرو نے اپنی مثنوی "نو سپہر" میں زبان لاہوری کا ذکر کیا ہے۔ یہی وہ زبان ہے جسے کبھی ہندوی، جدید پنجابی، ریختہ اور اُردو کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ امیر خسرو کے بعد کبیر داس اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز دونوں ریختہ گو شاعر ہیں اور دونوں کی زبان ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔ کبیر، گرو نانک، جائسی، تلسی داس، بہاری، کنک بھوشن وغیرہ نے کثرت سے فارسی وعربی الفاظ اپنے اپنے کلام میں استعمال کئے ہیں مگر چند مسلمان اور ہندی شعرا نے عربی و فارسی کے بجائے مقامی الفاظ کو ترجیح دی جیسے مبارک اور ملک محمد جائسی۔ اِن کی زبان نے اُردو کے اِرتقاء میں کافی مدد دی۔ گرو نانک کی اہمیت اس لحاظ سے بہت بڑھی ہوئی ہے کہ وہ ایک تو اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ تھے دوسرے انھوں نے اہل پنجاب کو مادری زبان (اُردو) کی رغبت دلائی۔

گرُو نانک کی زبان اُردو اور پنجابی کی مخلوط زبان ہے۔ اِن کی "جنم ساکھی" کی زبان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِس عہد تک اُردو کا ڈھانچہ بالکل تیار ہو چکا تھا۔ انھوں نے "دا، دے، دی" کی بجائے "کا، کے، کی" استعمال کیا ہے۔ "ہور" کے بجائے "اور" کا لفظ اُردو کے نکھرنے کا بین ثبوت ہے۔

پنجاب میں اُردو شاعری دکن کے بعد اور دھلی کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے۔ ابتدائی نمونے کم یاب ہیں اور جس قدر اِس کے نمونے ملتے ہیں اِن میں تخلص موجود نہیں، یہ قدیم ریختہ کی شکل میں ہیں۔ اِن میں فارسی اور مقامی اثرات ہم وزن ملتے ہیں۔ قافیہ کی پابندی ضروری نہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے پیر بھائی حضرت شیخ عثمانی جالندھری

کی یادگار ایک ریختہ کا نمونہ ملاحظہ ہو :

عاشق دیوانہ ام آ دپیارے حبیب　　از ہمہ بے گانہ ام آ و پیارے حبیب
اے دل وجان من درد تو درمان من　　ذکر لو سامان من آو پیارے حبیب

پنجاب میں اسی زمانے کے ایک اور بزرگ کا کلام یہ ہے جس کا نمونہ محمود خان شیرانی نے دیا ہے :

ملا غافل چہ می خسپی کہ اپنی میچ تھیں ڈریے
جو روز مرگ در پیش است اتنی نیند کیوں کریے

۱۰۷۴ھ مطابق ۶۴-۱۶۶۳ء میں فقہ ہندی" نامی ایک رسالہ بعہد عالمگیر پنجاب میں لکھا گیا اِس پر نگر نے فہرست کتب خانہ اودھ میں اس کو محشر نامہ کے نام سے موسوم کیا ہے یہ رسالہ اِس قدر پنجابی آمیز ہے کہ مولانا شیرانی نے اِس کو "پنجابی اردو" کا نام دیا ہے۔ مندرجہ ذیل کے اشعار سے اِس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے :

حمد سب رب کون خالق کل جہاں　　لائق حمد و ثنا کے اور نہ کوئی جان
علم شریعت نال کے بھیجا رسول پاک　　جو کچھ بھیجا رب ہنیں سب ہم کیا قبول

محمد شاہ کے عہد میں یا اس کے بعد کی لکھی ہوئی بیاضوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر علی سرہندی اپنے وقت کے اتنے مقبول شاعر تھے کہ ان سے اور اِن کے ہم عصر مشہور شاعر ولی دکنی میں ادبی چوٹیں چلتی تھیں ولی کا یہ شعر ناصر علی سرہندی ہی کے لیے ہے :

اچھل کر جا پڑے جوں مصرع برق　　اگر مصرع لکھوں ناصر علی کون

ولی کے ابتدائی کلام میں وہ الفاظ جو بعد میں انھوں نے دہلی سے واپس آنے کے بعد ترک کر دیے تھے مثلاً کون، ہمیں، ہستی، تمن، تائیں غیچہ تمام الفاظ ناصر علی سرہندی کے یہاں موجود ہیں :

دو نین کاری تھیں کی جانی حیران کرتی لوگوں کے تائیں
خراب ہوگا تمام عالم جب اِن نین سوں کجل پڑے گا [۱]

پنجاب میں اِس عہد کی یہ بات قابلِ قدر ہے کہ یہاں فارسی تراکیب مثلاً آن، شوخ، بے پروا، چو چشم نرگس، چو تیر، ناوک وغیرہ عام ہیں جو قدیم شعرائے دہلی کے یہاں بہت کم ہیں لیکن پنجاب کے شعرا ایسی تراکیب کو بڑی روانی سے اپنے اشعار میں استعمال کرتے ہیں۔

اسی [۲] طرح شیخ ابوالفراج محمد فاضل بٹالوی (متوفی ۱۱۵۱ھ) جنھوں نے تصوف میں چالیس کتابیں اور رسالے یادگار چھوڑے ہیں اُردو میں بھی اشعار کہا کرتے تھے یہ بھی ولی کے ہم عصر ہیں:

ناہیں مراچھٹ تم کوئی انظر بحالی یا بنی
ہے رین دن غفلت بڑی انظر بحالی یا بنی
میں ہوں خرابی میں پڑا اطفل اسو، الخلق حیف
اِس غم ستی چھاتی سڑی انظر بحالی یا بنی

دہلی کا مرکز کمزور ہو جانے کے سبب سے پنجاب میں طرح طرح کی آفتیں نازل ہوئیں۔ سکھوں کا تخت و تاراج کرنا، نادر شاہ کی آمد احمد شاہ دُرانی کے حملے یہ ایسے واقعات ہیں کہ یہاں کے باشندے دنیا سے بے زار ہو کر خدا سے لو لگاتے ہوئے تھے۔ اور اپنی زبان میں حمد و مناجات کے ذریعے پناہ مانگتے تھے۔ شیخ نور محمد، حضرت غلام قادر شاہ، شیخ نصیر الحق، شاہ مراد۔ شعرا جو ولی کے ہم عصر ہیں، ان سب کا کلام صوفیانہ ہے۔ جس میں دنیا سے بے زاری، عشق الٰہی، دینی اصول کی پیروی کی نصیحت

۱۔ محمود خاں شیرانی "پنجاب میں اُردو"، محولہ بالا، ص ۳۰۴
۲۔ ایضاً، ص

اور غوث الاعظم سے دعائیں وغیرہ شامل ہیں۔ کہیں کہیں عشق مجازی کی جھلک ملتی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد پنجاب کا وہ دور شروع ہوجاتا ہے جسے سیاہ ورق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے کہ اُردو زبان صوفیاے کرام سے نکل کر عوام کی ترجمانی کرنے لگی تھی اور اس قابل ہوگئی تھی کہ اس کو ادب کا درجہ دیا جائے۔ اِس وقت تک اُردو زبان خطِ نسخ میں لکھی جاتی تھی اکثر مثنویوں کا وزن عروض خالص ہندی تھے۔ اور پنجابی لہجے کی خصوصیات بھی موجود تھیں۔ پنجاب کی اُردو شاعری دکنی شاعری سے اِس معنوں میں مختلف تھی کہ بحریں زیادہ تر مقامی ہیں۔ ردیف کی پابندی ہے۔ جذبات فارسی سے مختلف ہیں۔ اِن نظموں میں عاشق عورت ہے۔ فارسی صنائع و بدائع اور تشبیہات سے یہ نظمیں مُبرّا ہیں۔ ایہام کا دور دور پتا نہیں۔ پروفیسر شیرانی اِس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ دہلی اور پنجاب میں اُردو کی تحریک ساتھ ساتھ چلتی ہے لیکن ایک کو دوسرے کی خصوصیات کا اندازہ نہیں۔

اِس سلسلے میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۷۵ھ) کا کلام نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

دھن کارن آپے آپ سنورا — بن دھن سکھی کنت کنھارا
جدہر دیکھوں ہے سکھی دیکھوں اور نہ کوئی — دیکھا بوجھ بچار منہ سبھی آپیں سوئی
رہسی کیو تھ ناچوں ناچوں سکھی پی جی رنگ چڑھایا — تن من جیو ایک رنگ دیکھا توہیں آپ گنوایا

اٹھارھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دہلی کی تحریک پنجاب پہنچ گئی مختلف نظمیں اِس کی آئینہ دار ہے۔ جذبات کے اظہار اور زبان میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ پرانے الفاظ متروک ہوگئے۔ تکلف رفتہ رفتہ غالب آنے لگا۔ قدیم سادگی

برطرف، تصنع پیدا ہو گیا۔ فارسی بحروں کے ساتھ ردیف و قافیہ لازم و ملزوم ہو گیا۔ اِس رنگ میں محمد جان کا نام سرِفہرست ہے:

رد رو کے عبث دل کے جل جانے کون کیا کہیے
بسمل ہو تڑپتا ہے مر جانے کون کیا کہیے

احمد شاہ ابدالی اور سکھوں کی لائی ہوئی تباہی پورے پنجاب پر چھا گئی۔ اِس وقت شاہ عالم ثانی جو الہ آباد میں ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوتا ہے۔ دہلی پہنچا۔ اہلِ پنجاب اپنی بربادی کو دیکھتے ہوئے شاہ عالم ثانی سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں اور اشعار کے ذریعہ اِس کا اظہار کرتے ہیں۔ ولی محمد دل شاد کی شاعری اِس زمانے کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ اگرچہ یہ فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے لیکن اُردو میں بھی اپنی کیفیات بیان کرتے ہیں۔ اقتصادی ماحول ضرورت، دوستوں کی فرمائش کے زیرِ اثر وہ شعر کہتا ہے اِسی لیے اِس کا دیوان اِس عہد کے واقعات کا آئینہ دار بن گیا ہے۔ ہجویات کہنے کے باوجود لطیف اور نازک جذبات کے اظہار پر قدرت رکھتا ہے۔

وارث شاہ پنجابی کے بہترین شاعر ہیں لیکن اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اگرچہ مصحفی نے تذکرۂ ہندی گویاں میں شاہ مراد سے پہلے لفظ "اردو" استعمال کیا ہے۔ لیکن حضرت شاہ مراد کا نام اِس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ جس طرح تحسین نثر میں زبان کے لیے لفظ "اردو" استعمال کرتے ہیں۔ اِسی طرح شاہ مراد نے صوبہ پنجاب میں زبان کے لیے لفظ "اردو" استعمال کیا ہے

وہ اُردو کیا ہے ہندی زبان ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہان ہے[1]

نظم کی بہ نسبت نثر کم لکھی گئی۔ شیرانی نے اٹھارویں صدی عیسوین

---

[1] محمود خاں شیرانی، "پنجاب میں اُردو"، محولہ بالا، ص ۳۹۶
اورنٹیل کالج میگزین بابت مئی ۱۹۲۲ء

کے ایک رسالہ کا حوالہ دیا ہے جو ایک فرس نامہ ہے۔ دس فصلوں اور تیرہ اوراق پر مبنی ہے کاتب کوئی غیر مسلم ہے جس نے بسم اللہ کی بجائے ست گر رو پرشاد لکھا ہے۔ مصنف حروف و اضافت میں کبھی پنجابی اور کبھی اُردو حروف استعمال کرتا ہے۔ اِسما اور افعال بعض جگہ پنجابی ہیں۔ اگرچہ رسالہ اُردو میں لکھا گیا ہے لیکن لہجہ پنجابی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں "اردو" اِسی جدید زبان کا نام ہے جو ہندو اور مسلمانوں کے اختلاط سے ہندوستان میں پیدا ہوئی تھی اور اب اِس درجہ تک پہنچ چکی تھی اور اتنی وسعت پیدا ہو گئی تھی کہ یہ سرکاری زبان بننے کی لائق تھی۔ بازاری زبان بھی تھی اور علماء کا دست راست بھی۔ خواص کی بھی اور عوام کی بھی۔ نظم و نثر کے لیے موزوں۔ اِس میں عوام کی بولی اور ادب کی زبان بننے کی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ اِس کے ارتقا اور ترویج میں ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر طبقے نے برابر کا حصہ لیا تھا۔ مدارس میں بھی یہ ذریعۂ تعلیم تھی۔

پورے ہندوستان میں ادبی کوششوں کے علاوہ جب ہم مدرسوں کے نصاب پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیسی زبان میں نصاب لکھے جانے کی تحریک تقریباً ایک ہی زمانے میں پورے ہندوستان میں نمودار ہوتی ہے اُردو میں نصاب تیار کرنے کی تحریک کو پنجاب نے بے حد فروغ دیا۔

پنجاب میں اُردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ہندو مسلم اور سکھوں کا اتحاد نہایت مبارک تھا۔ اگرچہ یہ اتحاد سیاسی مجبوریوں کی بناء پر تھا۔ کیوں کہ سکھوں نے اگرچہ اپنے آپ کو ایک مضبوط طاقت بنا لیا تھا مگر وہ اب تک انگریزوں کے مقابلے میں بہت کم استحکام رکھتے تھے۔

پٹھان اپنی حدود کے اندر سکھوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ لہٰذا سکھ پنجاب ہی کے علاقے میں ہندو اور مسلمانوں سے رابطہ قائم کئے ہوتے تھے اور لسانی اور مذہبی اعتبار سے بھی اُردو سے اِن کو لگاؤ تھا۔ خالص مذہبی عناصر کو مدِنظر رکھتے ہوئے بھی یہ ایک خوش گوار اور قابل تعریف بات تھی کہ مختلف عقائد کے بعد وہ مل جل کر اُردو کی خدمت کر رہے تھے۔ مقامی مختلف حکومتوں کے جبر و استبداد نے انھیں ایک ہی تمدنی رشتے میں باندھ رکھا تھا۔ یہ سب ہی ایک زبان بولتے تھے۔ اور اِسی میں کاروبار کرتے تھے۔

ہندوستان میں مغل سلطنت کا زوال ہوا تو حقیقتاً یہ ایک پورے نظام کا زوال تھا۔ اِس کی جگہ رفتہ رفتہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے لے لی تھی جس نے زراعت اور صنعت کو تباہ کر دیا۔ اور یہاں کے لوگوں کی اخلاقی اور روحانی زندگی کو نئے راستوں پر ڈال دیا۔ نئے حاکموں کے ساتھ نباہ کرنے کے لیے ایک نیا متوسط طبقہ پیدا ہوا۔ جس نے قدیم تہذیب کو مدّنظر رکھتے ہوئے جدید تہذیب کا بڑی گہری فکر سے مطالعہ کیا۔ نئی تعلیم جاری ہوئی۔ نئی قسم کی ملازمتیں ملنے لگیں اور اِس طرح قدیم و جدید کی آمیزش شروع ہوئی۔ کہیں اِس نے مذہبی اصلاح کی تحریک کی شکل اختیار کی اور کہیں نئی تعلیم حاصل کر کے وہ طبقہ وجود میں آیا جو کم سے کم کلرک بننے کی صلاحیت رکھتا اور نئے نظام کو قائم رکھنے میں مدد دے سکتا تھا۔

اگرچہ پنجاب میں سکھوں کے دورِ حکومت میں پنجابی سکھوں کی زبان قرار پائی اور اِس کا رسم الخط گورمکھی سکھوں کے لیے مخصوص ہوا

ؔ ہلال احمد زبیری (مترجم) "برعظیم پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ"، محولہ بالا، ص ۲۵۰

اور مسلمانوں کی علمی اور تہذیبی زبان فارسی رہی پنجابی کے نمونے بھی فارسی رسم الخط میں ہیں۔ اِس کے علاوہ خود پنجابی زبان سکھوں اور مسلمانوں کی مختلف ہے لیکن جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے اِس کی ترویج و اشاعت میں سکھوں نے اپنے سیاسی مفاد کی خاطر پورا پورا حصّہ لیا۔

دیگر صوبوں کی طرح پنجاب میں بھی نئے صنعتی تصورات اور سائنسی کی تعلیمات کی طرف ذہن منتقل ہوا۔ اِس افراتفری کے دور ہی میں اُردو زبان نے نئی زندگی کا ذائقہ چکھا۔ نئی ضرورتوں کے تحت نئے نئے الفاظ اُردو زبان میں جذب ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ فارسی کا دور مغل سلطنت کے ساتھ ختم ہو چکا تھا لیکن اِس کی جڑیں پنجاب کی سرزمین میں بڑی گہری تھیں۔ کوئی شخص اُس وقت تک تعلیم یافتہ نہیں کہلا سکتا تھا۔ جب تک کہ عربی اور فارسی پر پورا عبور نہ رکھتا ہو۔ دہلی کی تباہی کے ساتھ ہی بہت سے شرفا ترکِ وطن کر کے پنجاب میں آ بسے تھے جو زمانۂ قدیم سے مغلوں کا محبوب صوبہ رہ چکا تھا۔ مشرقی اور وسطی ہندوستان سے ہندو اور مسلمان گھرانے بڑی تعداد میں پنجاب میں آ کر بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ اِس کے علاوہ خود انگریزوں کو لسانی تفریق پیدا کرنے کے باوجود اُردو زبان پر بھروسہ تھا لہٰذا اِن ہی لوگوں کو خاص طور پر تحصیلدار، کلکٹر، اور اساتذہ کے عہدوں پر فائز کیا گیا جو اُردو زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ سکھوں اور ہندوؤں نے بھی زمانہ کا رنگ دیکھ کر انگریزوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ انگریز مہاراجہ دلیپ سنگھ کو انگلستان روانہ کر کے پنجاب پر قابض ہو چکے تھے اور اپنے ساتھ انگریزوں کے علاوہ پولیس اور فوج کی بھاری جمعیت کو اپنے ساتھ پنجاب لاتے تھے۔ پنجاب میں اگرچہ بظاہر امن و امان تھا لیکن لوگ ایک طرف تو اپنی پرانی اِمداد

اور تہذیب کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور دوسری طرف اِس نئی حکومت کی طرف بھی اِن کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں جو ان ہی تعلیم یافتہ لوگوں کی تعلیم سے مستفید ہو رہے تھے۔ ان سب کی زبان اُردو ہی تھی کچہریوں، ذیلی عدالتوں اور پولیس کی رپورٹیں اُردو ہی میں لکھی جاتی تھیں۔

چھاپہ خانوں کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں ریل اور تار کا جال بچھایا جا چکا تھا جس کی وجہ سے رسل و رسائل کی آسانیوں کے ساتھ ساتھ خیالات و افکار سے واقفیت بڑھتی جاتی تھی عوام کو ایک صوبے سے دوسرے صوبوں کے علاوہ غیر ممالک کا حال بھی معلوم ہوتا رہتا تھا، اُردو زبان کی لغت میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی ہندوستان سے ربط پیدا کرنے کے لیے اِسی زبان کو وسیلہ بنانا پڑا۔ یہاں تک کہ اپنے مذہب کی تبلیغ کے سلسلہ میں پادری جو مدت دراز سے اپنی کوششوں میں مصروف تھے۔ اِن کو بھی اپنے تبلیغی مشن کے لیے اُردو ہی کے سہارے کی ضرورت ہوئی اور انجیل کا ترجمہ آسان اور سلیس اُردو میں کیا گیا۔

دھلی میں میر، سودا، میر حسن، انشا، مصحفی، آتش و ناسخ کی زبان کا مطالعہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو رفتہ رفتہ غزل کے محدود دائرے میں نئے نئے خیالات اور نئی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نئے نئے الفاظ جذب کر رہی تھی۔

یہی وہ زمانہ ہے کہ جب وارن ہسٹنگز ۱۷۷۵ء میں ہندوستان کا

۱۔ سید محمود، "در باب اشاعت و موجودہ حالت اعلیٰ تعلیم انگریزی کی مسلمانوں میں بعہد انگریزی سو برس کے گذشتہ زمانے میں یعنی من ابتدائے ۱۷۹۳ء لغایت ۱۸۹۳ء" آگرہ: مفید عام پریس، سن ندارد، (لیکچر)، ص ۵

پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا اور ۱۷۸۱ء تا ۱۷۹۱ء تک بنگال اور بنارس میں کالج قائم کئے گئے جس میں اُردو کو بھی اہم مقام حاصل تھا تاکہ محکمہ مال گزاری کا کام آسان ہو جائے۔ ہندوستان کی اٹھارویں اور انیسویں صدی کی پوری تاریخ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اِس وقت انگریز زبان کے معاملے میں ہر طرح اُردو کے محتاج تھے اور انھوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ تمام ملک میں ملکی علوم کی تعلیم کا وسیع نظام قائم کرنے کے لیے وہ اُردو کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا ۱۸۳۷ء میں ہی انھیں اُردو کو محکمہ جاتی زبان کا مرتبہ دینا پڑا۔ وارن ہسٹنگز، لارڈ ولزلی اور بعض دوسرے گورنروں نے اُردو زبان سے دل چسپی لی اور نئی تعلیم کے لیے پنجاب میں بھی تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ اِس سلسلے میں "کوہ نور" کا شمارہ نمبر ۹ مطبوعہ یکم مارچ، ۱۸۵۰ء کا ضمیمہ قابلِ ذکر ہے جس میں ابتدائی مدرسوں کے السنۂ شرقی کے مدرسوں کے قوانین شائع کیے گئے تھے۔

شمالی ہند میں یوں تو اٹھارویں صدی ہی میں اُردو شاعری کی گرم بازاری کی ابتدا ہوتی لیکن سترھویں صدی بھی ایسے شعرا سے خالی نہیں جنھیں اُردو ادب میں خاص مقام حاصل ہے اِس سلسلے میں سب سے اہم نام محمد افضل جھنجھانوں کا ہے جنھوں نے "بارہ ماسہ" یا "بکٹ کہانی" لکھ کر ادبی سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا۔ اِس نظم کے متعلق پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں:

> "محمد افضل کی "بکٹ کہانی" ایک "بارہ ماسہ" یا دوازدہ ماسہ ہے جس میں ایک فراق دیدہ عورت اپنے خاوند کی جدائی میں اپنی سکھیوں اور سہیلیوں سے خطاب

لہ محمود خان شیرانی "پنجاب میں اُردو" حوالہ بالا، ص ۲۴۵

کرکے اپنی بے تابی اور دردِ جدائی، اَلم سناتی ہے
اور جیسا کہ ہمارے ملک میں دستور ہے ہر ہندی ماہ
کے عنوان کے ذیل میں اپنا قصۂ غم ایک گداز پیرائے
میں دھراتی ہے۔ اِس کی زبان دکنی سے بہت مختلف
ہے اور صاف ہے۔ اِس نظم میں فارسی بندش جا و
بے جا باندھی گئی ہے...... فارسیت کے باوجود
یہ نظم جذبات کے لحاظ سے بالکل ہندی ہے اِس میں
ہندوانہ زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ دہلی میں اُردو شاعری ولی کے تتبع میں شروع ہوئی لیکن یہ درست نہیں شیخ بہاء الدین برنادی، افضل جھنجھانوی اور جعفر زٹلی کی موجودگی میں اِس خیال کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ جعفر زٹلی کو فحش نگار قرار دے کر انھیں ادب میں جگہ نہیں دی گئی لیکن شمالی ہند میں اُردو کے ارتقا کی کہانی ان کی قدرت بیان، تنوع اور عوام پسندی کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ زندگی کی پریشان حالی بدحالی کا ابتذال اور دہلی کی تباہ حالی جو مغل حکومت کے زوال کا نتیجہ تھی ایک مخصوص انداز میں اُن کی شاعری میں منعکس ہوگئی۔

اگر اُردو ادب میں میر اور سودا کو مروجہ مفہوم سے علاحدہ کرکے مطالعہ کریں تو ان مخمسوں، شہر آشوبوں، مثنویوں اور ہجوؤں کی شکل میں مسائل حیات پر دل کش نظمیں ملتی ہیں۔ اِن میں اجتماعی، داخلی اور خارجی، فطری اور سماجی و تاثراتی اور فلسفیانہ سب ہی جگہ پاتے ہیں اور اُردو زبان وادب میں نئے الفاظ اور نئے اسالیب کا اضافہ ہوتا ہے۔ ان کا سماجی موضوع، شاعرانہ حسن تعبیر، گہری انسانیت اور وسیع النظری پورے ہند کی عکاسی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اُردو ادب کی

ترقی و ترویج کی یہ لہریں یکے بعد دیگرے مسلسل پنجاب میں پھیلتی نظر آتی ہیں۔

احیائے علوم مشرقی" باب چہارم میں اِس کا ذکر تفصیل سے دیا گیا ہے۔

باب اول

اُردُو کی ترویج واشاعت کے اِداروں کی تاریخ

باب اوّل

فورٹ ولیم کالج

انگریزوں کے لیے اُردو کی اہمیت :

۱۷۱۵ء کے قریب ایک انگریز ڈاکٹر ہیملٹن نے بادشاہ فرخ سیر کے لڑکے کا کامیاب علاج کیا اور اس کے عیوض انگریزی مال کو چنگی سے آزاد کرالیا اس واقعہ کے چالیس سال بعد تجارت کرتے کرتے کمپنی اس قابل ہوگئی تھی کہ ۱۷۵۷ء میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں شکست دی۔ اِسی اثناء میں کمپنی کے تجارت کا معاہدہ ختم ہو رہا تھا لیکن حکومت برطانیہ نے اس معاہدہ میں توسیع کر کے دو ایسے قوانین نافذ کر دیے جو ہندوستان میں زبردست انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے، وہ یہ تھے۔ :

۱۔ بنگال کے گورنر کے محدود اختیارات میں توسیع کر کے اسے گورنر جنرل کا عہدہ دے دیا۔

۲۔ کلکتے میں ایک عدالت بنام سپریم کورٹ قائم کر دی گئی۔

گویا اِس طرح بمبئی اور مدراس وغیرہ میں انگریزوں کی جو عملداریاں تھیں وہ اب مرکز کے تحت آگئیں جس کا صدر مقام بنگال تھا۔

بنگال کو ختم کرنے کے بعد انگریزوں کو فرانسیسیوں کے مقابلے میں پولی پور کے میدان میں شکست اُٹھانی پڑی۔ یہ واقعہ ۱۷۸۱ء کا ہے انگریزوں کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ انھیں مزید فوجی کمک کی ضرورت ہے، لہذا انگلستان سے فوجی کمک ہندوستان کے ساحلوں پر پہنچنے لگی۔ یہ فوجی ہندوستان کی مروجہ زبانوں سے ناواقف تھے۔ وارن ہسٹنگز جو پہلا بااختیار گورنر جنرل تھا اس نے پوری طرح بھانپ لیا کہ جب تک برطانوی فوجی اور دیگر پیشہ ور کارکن اُردو زبان نہیں سیکھیں گے اس وقت تک ان کے قدم ہندوستان میں نہیں جم سکیں گے اِن چند صدیوں میں یہ نہ صرف غیر ملکیوں کے لیے سب سے بڑی ضرورت بن چکی تھی بلکہ اس نے ایسی ہندوستان گیر زبان کا مرتبہ حاصل کرلیا تھا جو پورے ہندوستان کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ یہ شرفا اور ادبا اور عوام میں یکساں طور پر مقبول تھی۔ بقول ڈاکٹر سین:

> "اِس تمام ہندوستان کی جو مسلمان بادشاہوں کے زیر حکومت تھا "لنگوا فرنیکا" بن گئی تھی۔ یہ وہی اُردو تھی جسے فارسی سے امتیاز کرنے کے لیے ہندی زبان یا ہندوی کہا جاتا تھا۔ اِس کی اہمیت کی ایک نہایت واضح مثال یہ ہے کہ بنگال کے راجہ ندی کے مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی کہ پیشی میں یہ درخواست کی گئی [1]،،
>
> ۸ رجون ۱۷۷۵ء کے دن وکیل کے میجسٹریٹ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ مدعی اور مدعا علیہ کو اجازت

---

[1] وفا راشدی صاحب، بنگال میں اُردو، حیدر آباد (پاک): اشاعت اُردو، س ن، ص ۸

دی جائے کہ وہ اپنا اپنا بیان ہندوستان کی زبان
اردو میں دیں کیونکہ یہ ایک ایسی زبان ہے جسے بنگال
میں ہر شخص بولتا اور لکھتا ہے۔"

اردو زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے وارن ہسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کا سنگِ بنیاد رکھا جس میں مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ مدرسہ اگرچہ اپنے طور پر کام کرتا رہا لیکن کمپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی تھا، لہٰذا اس نے ہندوستان کی عنان اقتدار ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے اہلِ ہند سے ثقافتی اور تمدنی اتحاد کی طرف توجہ دی۔

وارن ہسٹنگز کے آخری دور میں ڈاکٹر جان گل کرائسٹ بمبئی سے کلکتے پہنچے کمپنی میں ان کا تقرر ہو گیا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے ذہن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملکی ضرورتوں کے ساتھ ہندوستان میں ایک ایسے تعلیمی ادارے کا تصور بھی موجود تھا۔ جو محض اپنے ہم وطنوں کی اغراض ملک گیری ہی کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں بلکہ ایک ایسی ہندوستان گیر تہذیب و تمدن کو بھی اپنے دامن میں سمولے جو ہر قسم کے طبقاتی کش مکش سے پاک ہو۔ لہٰذا ۱۷۹۸ء میں ڈاکٹر گل کرائسٹ نے پہلی مرتبہ کمپنی کے سامنے اپنی تجاویز پیش کیں۔ اس ہندوستان گیر خواہش میں خلوص ہو یا نہ ہو لیکن سیاسی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس کی شدید ضرورت تھی کہ جو انگریز کمپنی کی ملازمت میں ہندوستان پہنچ رہے ہیں انھیں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی تہذیب و معاشرت سے نزدیک تر کر دیا جائے۔

بڑھتے ہوئے انقلابات کی تیز روی اور برطانوی باشندوں کے مسلسل اضافے نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی تجاویز میں اچھا خاصا وزن پیدا کر دیا تھا

۱۷۸۵ء میں وارن ہسٹنگز کے بعد سر جون میکفرسن قائم مقام گورنر جنرل مقرر ہوا جو پہلے ہی ڈاکٹر گل کرائسٹ کی تجاویز سے متفق اور متحد الخیال تھا۔ اس نے اپنے عہدے کو سنبھالتے ہی ڈاکٹر گل کرائسٹ کو اس لیے ایک طویل رخصت دی کہ وہ ہندوستان کے خاص خاص شہروں میں رہ کر مشرقی علوم دینیات کا گہرا مطالعہ کرے تاکہ جب ان تجاویز پر عمل ہو تو کوئی مشکل سامنے نہ آئے اور اس طرح ڈاکٹر گل کرائسٹ اپریل ۱۷۸۵ء میں اپنے مشن پر روانہ ہو گیے۔ فیض آباد، لکھنؤ، دہلی وغیرہ میں کبھی اپنے ملکی اور کبھی ہندوستانی لباس میں داڑھی بڑھا کر ہندوستان کے مستند اساتذہ اور علماء سے ملے اور ہندوستانی مشرقی ادبیات کا گہرا مطالعہ کرتے رہے۔ ۱۷۹۸ء میں لارڈ ولزلی کلکتے پہنچا اور ساتھ ہی گل کرائسٹ کی بھی واپسی ہوئی۔ چناں چہ فوراً ہی فورٹ ولیم میں ایک مدرسہ "اورنٹیل سیمی نری" کے نام سے قائم کر دیا گیا جس میں تعلیم حاصل کر کے انگریز ملازمین کے لیے امتحانات پاس کرنا لازمی قرار دیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ طالب علموں کا ایک سال کے بعد امتحان لیا جائے گا اور اس وقت تک ذمہ دار اور استاد کے مخصوص عہدوں پر کمپنی کے کسی سول ملازم کو اس وقت تک متعین نہیں کیا جائے گا جب تک اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ اس نے تمام آئین و قوانین نیز مقامی زبانوں سے پوری واقفیت حاصل کر لی ہے۔

گورنر جنرل نے ۳۱ر دسمبر ۱۷۹۸ء کو یہ تجویز بھی پیش کی کہ بنگال میں یکم جنوری ۱۸۰۱ء کے بعد مندرجہ ذیل عہدوں کے لیے اس وقت کسی کا تقرر عمل میں نہیں آئے گا جب تک کہ قوانین و آئین و ضوابط اور ہندوستانی

C. C. Home Public January 31-179, No. 43

زبانوں کے امتحان جس کے اصول بعد میں وضع کیے جائیں گے پاس نہ کرلیے جائیں۔ اشتہار ہذا کے ذریعہ اعلان کیا جاتا ہے کہ مندرجہ بالا علوم سے واقفیت عہدوں کی اٹل شرطیں ہیں:

۱۔ بنگال، بہار، اڑیسہ، بنارس کے صوبوں کی عدالتوں کے جج یا رجسٹرار کے عہدوں کے لیے فارسی و ہندوستانی زبان سے واقفیت۔

۲۔ بنگال و اڑیسہ کے صوبوں میں مال و چنگی کے محصلوں کے لیے نیز تجارتی رزیڈنٹ اور نمک کے ٹھیکے داروں کے لیے بنگلہ زبان کی واقفیت۔

۳۔ بہار و بنارس کے صوبوں کے مال و چنگی کے محکموں کے محصلوں نیز تجارتی رزیڈنٹ یا افیون کے ٹھیکے داروں کے لیے ہندوستانی زبان سے واقفیت۔

۴۔ جہاں تک آئین و ضوابط کا تعلق ہے مندرجہ بالا عہدوں کے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے جن آئین و ضوابط کی واقفیت ضروری ہے ان میں بھی امتحان لیا جائے گا۔

۵۔ رائٹ آنریبل گورنر جنرل نے یہاں کے عملے کو اِس پیشگی اطلاع دے دی ہے تاکہ وہ سول ملازمین جو ترقی کرکے اِن عہدوں کو حاصل کرنے کے متمنی ہوں ان کو امتحان کی تیاری کے لیے کافی وقت مل سکے۔

اور اِس طرح ۳۱ جنوری، ۱۷۹۹ء کو ۳۱ طالب علموں کے ناموں کی فہرست سے اِس مدرسہ نے کام شروع کیا۔ ابتدا میں چھ مہینے اُردو

زبان کی تعلیم پر صرف کیے جاتے تھے اور روز مرہ گھریلو قصوں کو پڑھ کر عربی فارسی کی استعداد مہیا کی جاتی تھی۔ مدرسہ کے نصاب کی کوئی واضح تصویر ہمیں نہیں ملتی۔ خیال ہے کہ گل کرائسٹ کی کتاب "مشرقی زباندان" پڑھائی جاتی تھی جو انھوں نے مدرسے کے شروع ہونے سے قبل ہی مکمل کر لی تھی۔ اسکول کے دستور العمل میں اِس کتاب کا جا بجا ذکر ملتا ہے۔ اِس کے بعد قصوں اور مکالموں کا حصہ پڑھایا جاتا تھا جو "مشرقی زبان داں" ہی کا ایک حصہ ہے۔ یکم جون ۱۸۰۰ء میں اِس مدرسے کا پہلا اور آخری امتحان ہوا۔ گورنر جنرل کی ایک کمیٹی جس میں پانچ انگریز ممتحن تھے اور اس کمیٹی کے سکریٹری گل کرائسٹ تھے امتحانات لیے گئے اور پاس ہونے والے طالب علموں کو طلائی تمغے اور تیرہ سو روپے تک انعامات تقسیم کیے گئے۔

تکمیل کے ذرائع :

۴ مئی ۱۸۰۰ء کو لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔ لارڈ ویلزلی نے انگریزوں کے لیے اُردو کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور اس کی باضابطہ تعلیم کا انتظام بھی کر دیا اور یہ اندازہ بھی لگا لیا کہ فرمانروائی کے لیے علوم و فنون کی مہارت ضروری ہے۔ اس لیے اس نے چاہا کہ یہ فورٹ ولیم کالج علوم و فنون کی اعلیٰ درس گاہ ہو جس میں علمی زبانیں عربی، فارسی و سنسکرت بھی پڑھائی جائیں اور ملکی زبانیں اُردو، بنگالی، مرہٹی وغیرہ بھی اور یورپین زبانیں انگریزی، لاطینی اور یونانی بھی۔ علوم و فنون کے سلسلے میں تاریخ عالم تاریخ ہند، جغرافیہ، اصول قانون شرع اسلام، دھرم شاستر وغیرہ۔ لیکن کمپنی نے ایسے عظیم الشان منصوبے کی تکمیل کے اخراجات برداشت کرنے سے

انکار کر دیا۔ اس لیے کالج کو صرف اُردو زبان کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ لہٰذا ۳ ستمبر ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کو صرف السنہ مشرقی کا مرکز قرار دیا گیا اور اس کی علمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک سرشتہ تالیف و تراجم قایم کیا گیا اور اطراف ملک سے قابل افراد کو چن چن کر کلکتے میں یک جا جمع کیا اور ان سے نثر میں کتابیں لکھوائی گئیں۔ قصص و حکایات، تاریخ و تمدن کی کتابوں کو جو ہندوستان میں مقبول تھیں اُردو میں منتقل کر دیا گیا۔ اِن کتابوں کا بڑا حصّہ اخلاقی اور افسانوی ہے تاریخی حصّہ نسبتاً کم ہے اور اب یہ بات بھی سب پر بخوبی واضح ہو چکی تھی کہ نظام حکومت کے کاموں میں کبھی مستعدی نہیں آسکتی جب تک اُردو زبان کو بے جا تشبیہوں اور استعاروں سے آزاد نہیں کیا جائے گا۔ اور یورپین ملازمین جن کو یہاں کا ملکی انتظام سنبھالنا ہے۔ اگر مسجع اور مقفہ عبارتوں میں الجھ گئے تو ان کی حکومت کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ لہٰذا شاعرانہ تعلیوں اور مبالغہ آمیز تشبیہات اور استعارات سے قطع نظر ایک ایسا نظام درسی مقرر کیا جس پر قدرت حاصل کر کے تمام افسر زیادہ کارآمد ہو سکتے تھے۔

لارڈ ویلزلی نے ہندوستان پہنچتے ہی انگریزوں کو تعلیم دینے کے لیے گل کرائسٹ کا انتخاب کیا۔

فورٹ ولیم کالج کا تذکرہ اِس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کا نام اس سے منسلک نہ کیا جائے۔ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اُردو زبان کی لطافت اور وسعت و گیرائی نے اِن کو ملتفت کر لیا۔ اِس حقیقت کا اعتراف انھوں نے اپنی تصنیف کردہ "لغت اور قواعد" کے ضمیے میں ان الفاظ میں کیا ہے:

۱۷۸۳ء میں بمبئی وارد ہوتے ہی میں نے یہ محسوس کر

لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام، خواہ اِس کی نوعیت جو بھی ہو، اس وقت تک نہ تو میرے ہی لیے خوش گوار ہو سکتا ہے اور نہ میرے آقاؤں ہی کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے، جب تک کہ اس ملک کی مروجہ زبان میں پوری دست گاہ میں نہ حاصل کروں...... کچھ دنوں اپنے طور پر کوشش کرنے کے بعد مجھے تو توقع سے زیادہ کام یابی ہوئی۔ اسی بحرانی دور میں خوش قسمتی سے اپنے دوست کپتان جان ریٹ رے John Rattray سے جواب کرنل ہو چکے ہیں سودا کا کلیات مجھے مل گیا۔ ہندوستانی زبان میں اِس وقت ۱۷۹۶ء تک جو مہارت میں نے حاصل کی ہے اس کے لیے سودا کے کلیات اور اسی کریم النفس انسان (جان ریٹ رے) کے مشوروں کا نیز اس کی ہمت افزائی و امداد کا میں بے حد ممنون ہوں۔"

گل کرائسٹ نے اردو زبان کی طالب علمی ہی کے دور میں ہندوستانی زبان کی قواعد اور لغت مرتب کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ فیض آباد میں اپنے قیام کے دوران اپنی ادبی تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں جب ہندوستانی زبان کے قواعد و لغت کی کتابوں سے متعلق لوگوں سے سوال کیا تو وہ "حیرت سے منہہ تکنے لگے"، ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ اِس واقع کے بائیس سال اور گل کرائسٹ کی قواعد کی اشاعت کے گیارہ سال بعد انشا اللہ خان انشا نے "دریائے لطافت" لکھی جس کا سن تالیف ۱۸۰۷ء ہے۔

۸ رستی، ۱۷۹۶ء میں دوسری کتاب ہندوستانی زبان کے قواعد A Grammar of Hindustani منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب ہندوستانی لسانیات کی پہلی جلد کا تیسرا حصہ تھی۔ اس کا پہلا حصہ "انگریزی ہندوستانی لغت" ۱۷۸۶ء اور دوسرا حصہ ۱۷۹۰ء میں شائع ہو چکا تھا۔ قواعد و لغت کا مقدمہ و ضمیمہ ۱۷۹۸ء میں شائع ہوا۔ اسی سال گل کرائسٹ نے اپنی چوتھی کتاب "مشرقی زبان دان" Oriental Linguist شائع کر دی ان کتابوں کی اشاعت کی وجہ سے گل کرائسٹ کی اردو دانی کو کمپنی نے تسلیم کر لیا اور ان کی دھوم مچ گئی۔ اس میں ہندوستانی زبان کے قواعد، انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی لغت کے ساتھ ساتھ عام فہم اور مفید مکالمات، قصے، نظمیں تھیں۔ "مشرقی زبان دان" کا پانچواں باب فوجی آئین کی دفعات Article of War ہے۔ اس باب میں فوجی آئین کی دفعات کے ترجمے کے ساتھ انگریزی عبارت بھی درج کی جس کی وجہ سے انگریزوں کو ہندوستانیوں کے فوجی آئین اور دفعات سے واقفیت حاصل ہوئی اور انھوں نے ان ہی کی روشنی میں ہندوستانیوں سے جنگ کرنے میں مدد لی۔

۵۔ اردو زبان پر مختصر مقدمہ: یہ مشرقی زبان دان کا خلاصہ ہے۔ ۱۸۰۰ء میں شائع ہوا۔

۶۔ ہندی کی آسان مشقیں: یہ فورٹ ولیم کے ابتدائی اور آخری امتحانات کی تیاری کرنے والے امیدواروں کی سہولت کے لیے مرتب کی گئی تھی، ۱۸۰۱ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔

۷۔ فارسی افعال کا جدید نظریہ: افعال کی بحث پر یہ کتاب مبنی ہے۔ انگریزی اور اردو میں مترادفات بھی دیئے ہیں۔

۸۔ اجنبیوں کے لیے رہنمائے اُردو:۔ یہ کتاب انگریزوں کو اُردو زبان میں جلد سے جلد دست گاہ پیدا کرنے کے لیے لکھی ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔

۹۔ بیاضِ ہندی:۔ فورٹ ولیم کالج کے مشاہیر اہلِ قلم کے کارناموں کا بیان ہے۔

۱۰۔ علمی خاکے:۔ اُردو الفاظ کی قرات اور اُن کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے کے اصول پر ایک مختصر رسالہ جو ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔

۱۱۔ ہندی الفاظ کی قرات:۔ اِس کی تعریف نام سے ظاہر ہے۔ ۱۸۰۲ء میں طبع ہوئی۔

۱۲۔ اتالیق ہندی:۔ اِس کے مطالعے سے اُردو نوشت و خواند میں آسانی اور فارسی کی ابتدائی استعداد پیدا کرنا تھا۔ فارسی صرف و نحو پر بحث ہے۔ فارسی کے سلیس مضامین کے ترجمے بھی شامل ہیں ۱۸۰۳ء اور پھر ۱۸۲۱ء میں شائع ہوئی۔

۱۳۔ ہندی عربی آئینہ:۔ عربی کے ایسے الفاظ کی جڑیں جو اُردو زبان کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہیں ۱۸۰۲ء میں طبع ہوئی۔

۱۴۔ مکالمات انگریزی و ہندوستانی:۔ اِس کتاب میں اہلِ یورپ کو ہندوستانیوں کے ساتھ روز مرہ کی ضروریات کے متعلق گفتگو کرنا سکھایا ہے۔

۱۵۔ مشرقی قصے:۔ حکایات نقصان اور حکایتوں اور افسانوں کا ذخیرہ انگریزی، فارسی، برج بھاشا اور سنسکرت کی کتابوں سے ترجمہ کر کے جمع کیا گیا۔ یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔

۱۶۔ ہندی داستان گو:۔ اِس میں فارسی اور دیوناگری رسم الخط

اور اردو میں ان کے استعمال پر بحث کی گئی ہے ۱۸۰۶ء میں طبع ہوئی
گل کرائسٹ کی یہ تصانیف دیگر کتب کے ساتھ کالج میں
پڑھائی جاتی تھیں۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ مورخہ ۲۰ر جنوری،
۱۸۰۱ء کے ایک خط سے جس میں انھوں نے ہندوستانی شعبے کے
لیے خود کتابیں چھاپنے کی تجویز پیش کی تھی، اندازہ ہوتا ہے کہ چارلس
ولکنس کے بنائے ہوتے ہندی بنگلہ اور اردو کے ٹائپ کو عملاً
طباعت کے لیے کام میں لانے والے ڈاکٹر گل کرائسٹ ہی تھے۔
فورٹ ولیم کے مصنفین و مرتبین کی کتابیں اُردو ٹائپ ہی میں چھپتی
تھیں جس کا مطبع "ہندوستانی پریس" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ
مطبع بھی گل کرائسٹ نے فورٹ ولیم کالج ہی میں قائم کیا یہ ایک
ایسا انقلابی قدم تھا جس کی نظیر نہیں ملتی اور صحیح معنوں میں
ٹائپ کے رواج ہی کی وجہ سے ہندوستان نے صحافت میں قدم
رکھا اور اُردو اخبارات بھی گل کرائسٹ کے مرھون منت ہیں۔

۲۳ر فروری، ۱۸۰۴ء کو گل کرائسٹ نے شدید علالت کا حوالہ دیتے
ہوتے یورپ واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ نادم سیتاپوری، محمد عتیق صدیقی
اِس بات پر متفق ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے تدریسی و انتظامی اخراجات
کی زیادتی اور کتابوں کی طباعت پر زیادہ خرچ ہو جانے کی بناء پر
کالج کونسل اور حکومت نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی پذیرائی نہیں کی
جس سے وہ دل برداشتہ ہو کر اپنے وطن واپس چلے گیے۔ لیکن علمی
مشاغل اور اُردو ادب کی خدمت کا شوق کسی طرح کم نہ ہوا۔ وطن
سے وہ ۱۸۱۶ء میں لندن آگئے اور یہاں ایک ذاتی درس گاہ قائم
کی جس میں اِن نوجوانوں کو تعلیم دی جاتی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی
میں ملازمت کے امیدوار تھے۔ دو سال کے بعد خود ایسٹ انڈیا کمپنی

نے لیسٹر اسکوائر میں ایک ادارہ مشرقی علوم کے لیے Oriental Institute کے نام سے قائم کیا اور اس کا سرپرست ڈاکٹر گل کرائسٹ ہی کو مقرر کیا گیا۔ ۱۸۲۵ء میں یہ ادارہ بھی ختم ہو گیا لیکن انھوں نے یہ کام اپنے طور پر جاری رکھا۔ اور لندن میں اردو دانوں کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار کر دی۔ پیرانہ سالی کے باوجود وہ ہر طرح اردو کی خدمت کرتے رہے اور آخر پیرس میں ۱۸۴۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

فورٹ ولیم کالج کی تحریک کے اثرات:

ایسٹ انڈیا کمپنی اور فورٹ ولیم کالج کے منتظمین کے درمیان کالج قائم ہونے کے دو سال بعد ہی اختلافات شروع ہو چکے تھے ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کسی نہ کسی طرح اپنے ذاتی ذوق و شوق کی وجہ سے ان مخالفتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد یہ کش مکش اور بڑھ گئی۔ مصنفین، مولفین اور مترجمین سکون سے کام نہ کر سکے۔ بعض لوگوں کو تو کالج میں مستقل ملازم بھی نہیں رکھا گیا تھا وہ محض معاوضہ پر اپنا کام کرتے رہے۔ دوسرے مشاہیر جو کالج سے منسلک تھے وہ بھی رفتہ رفتہ علاحدہ ہوتے گئے لیکن ۱۸۲۰ء تک دس سال پندرہ سال کا یہ عرصہ کالج کے عروج کا زمانہ ہے، ہندوستان کے سیاسی مدوجزر کی وجہ سے حکمرانی کے طور طریق بدلے۔ مالیاتی پالیسی میں بھی ردو بدل ہوا اور آخر ۱۸۵۴ء میں اسے مد فضول قرار دے کر اسے ختم کر دیا۔

فورٹ ولیم کا ۵۴ سالہ دور اردو ادب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک ہندوستانی شعور کی سب سے پہلی

اجتماعی تحریک تھی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اِس تحریک کی وجہ سے نثر اُردو اِس قابل ہوئی کہ ۱۸۳۷ء میں اُسے سرکاری زبان کا مرتبہ دیا گیا اور اِس میں وہ صلاحیتیں پیدا ہوگئیں کہ تمام سیاسی اور سماجی تحریکیں اظہار خیال کے لیے اِس کو استعمال کرنے لگیں۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے محدود ہونے کے باوجود اِس قدر کامیاب ہوئی کہ ہندوستان کے ادبی رجحانات کا رخ بدل گیا۔ اور اٹھارویں صدی ہی سے غیر ملکی علوم و فنون کا ادبی ذخیرہ اردو ادب میں منتقل ہونے لگا۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف "اُردو پر انگریزی لیٹریچر کا اثر" میں تحریر کرتے ہیں:

> "فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات ہی کی بدولت ایک بڑے درجے تک۔۔اُردو نثر کا معیار اِس بلند مقام تک پہنچا ہے جو حال کے زمانے میں اُردو مصنفین کو میسّر ہوا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اِس کالج کی بنیاد رکھنے والے اور سرپرست ایک ایسی قوم تھی جس کا اپنا ادب بہترین تھا اگر وہ ادب یعنی انگریزی ادب اُردو میں اس وقت منتقل کیا جاتا تو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہند کے دانشور اپنی صلاحیتوں کے باوجود مغربی علوم سے ناآشنا تھے۔ کالج کی فوری ضروریات کے پیش نظر اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ فارسی اور ہندی کی کتابوں کو اُردو میں منتقل کیا جائے۔ اُردو نثر نویسی پر انگریزی کا بہت ہی خفیف اثر پڑا لیکن اُردو زبان پر انگریزی اثر کی ابتدا فورٹ ولیم کالج ہی سے ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد اکثر مصنفین نے بطور خود علی گڈھ کی سائنٹیفک سوسائٹی، دیگر ملکی اور علمی انجمنوں نے بھی اجتماعی طور

پر اردو کی نثر کو وسیع سے وسیع تر کیا۔ اِس سے قبل عوام کا علمی مذاق زیادہ بلند نہ تھا۔ علم و فن سے کوئی خاص رغبت نہ تھی۔

اردو میں مذہبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا عام شوق بھی بالواسطہ اِس کالج کی تحریک کا مرہون منت ہے۔ قرآن مجید اور انجیل کا آسان اُردو میں ترجمہ ہوا اور اہل یورپ اُردو زبان کی تکمیل کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور خیالات سے واقف ہوئے۔ عیسائی مبلغین کے اسلام پر حملوں کے جواب میں مسلمانوں کو اُردو زبان ہی استعمال کرنی پڑی اور مناظرات کا اچھا خاصا ادب مرتب ہوگیا۔

اِس کالج کی کتابیں اُردو کے قدیم اسلوب بیان میں عظیم الشان انقلاب کا باعث ہوئیں۔ انھوں نے صفائی، سادگی کی مشترکہ خصوصیات کے ساتھ آئندہ مصنفین کے لیے اسالیب کے نئے راستوں کا تعین کیا۔ سادگی کی خصوصیت کے علاوہ ایسے گوناگوں دلآویز اسلیب پیش کئے جن پر اُردو کے تمام اسالیب بیان کی بنیاد قائم ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی تحریک سے نہ صرف اُردو کا نثری ادب پیدا ہوا۔ بلکہ اس کی عام اشاعت کے کامیاب ذرائع بھی مہیا ہوگئے۔ کلکتے میں کالج نے سب سے پہلے ٹایپ پریس قائم کیا۔ اور اس کے مصنفین کی کتابیں اِسی مطبع میں چھپنے لگیں اور پورے ہندوستان میں عام ہوگئیں۔ اِس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی نمایاں اور قابل تعریف خدمت شعرائے اردو کے دوادین کے عمدہ انتخابات شائع کرنا ہے۔

اِس کالج نے ہندی کی سرپرستی بھی کی موجودہ معیاری ہندی کی بنیاد بھی اسی کی سرپرستی میں رکھی گئی۔

الغرض متاخرین اور موجودہ اُردو اور ہندی مصنفین کی ساری

علمی جدوجہد کی بنیاد اسی کالج کی سرپرستی میں ہوئی اور ان زبانوں کی ترقیوں کا نقطۂ آغاز یہیں سے ملتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ:

کلکتہ گزٹ کی فائل میں ۲۹ ستمبر ۱۸۰۰ء کی تاریخ کا ایک غیر معمولی شمارہ دستیاب ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف شعبوں کے لیے حسب ذیل پروفیسروں کا تقرر ہوا:

۱۔ عربی زبان اور اسلامی فقہ:۔ جان بے لی ولیم کرک پیٹرک

John Baillie W. Kirk Patrick

۲۔ فارسی زبان و ادب فرانسس گلیڈون اڈمانسٹن

Francis Gladwin N. B. Edmonstone

۳۔ ہندوستانی زبان گل کرائسٹ

(Gilchrist)

۴۔ ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کے لیے گورنر جنرل باجلاس کونسل کے نافذ کردہ قوانین جارج بارلو

G. H. Barlow

۵۔ یونانی، لاطینی اور انگریزی کلاسیکی ادب پادری بگھانن

Rev. Buchanen

اسی گزٹ سے معلوم ہوا کہ کالج کے انتظامی امور سرانجام دینے کے لیے گورنر جنرل نے ایک کونسل بھی بنائی تھی جو حسب ذیل حضرات پر مشتمل تھی:

۱۔ پادری ڈیوڈ براؤن (D. Brown) پرنسپل

۲۔ پادری بگھانن (C. Buchanan) وائس پرنسپل

۳۔ جارج بارلو	ممبر
۴۔ ایڈمانس ٹن (Edmanstone)	ممبر
۵۔ کرک پیڑک (Kirk Patrick)	ممبر

ہندستانی شعبے کے منشی (اساتذہ):

کالج کونسل کی کارروائی مورخہ ۲۹ر اپریل، ۱۸۰۱ء سے معلوم ہوتا ہے کہ کالج کے ہندستانی شعبے میں حسب ذیل منشیوں (اساتذہ) کا تقرر عمل میں آیا:

۱۔ میر بہادر علی حسینی	چیف منشی
۲۔ تارنی چرن متر	سیکنڈ منشی
۳۔ مرتضیٰ خان	منشی
۴۔ غلام اکبر	منشی
۵۔ نصیر اللہ	منشی
۶۔ میر امن	منشی
۷۔ غلام اشرف	منشی
۸۔ علاء الدین	منشی
۹۔ محمد صادق	منشی
۱۰۔ رحمت اللہ خان	منشی
۱۱۔ غلام غوث	منشی
۱۲۔ کندن لال	منشی
۱۳۔ کاشی راج	منشی
۱۴۔ میر حسین بخش حیدری	منشی
۱۵۔ سید جعفر	منشی

۱۶۔ محمد تقی — منشی
۱۷۔ مبارک الدین — منشی
۱۸۔ اسد علی خاں — منشی

۷؍ جون، ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل نے ہندوستانی شعبے کے عملے میں حسب ذیل اضافہ کیا :

۱۔ میر شیر علی — مترجم
۲۔ کاظم علی جوان — مترجم
۳۔ مظہر علی خان — مترجم
۴۔ میر بہادر علی — مدرس خاص
۵ تارنی چرن — سیکنڈ مدرس
۶۔ ۲۰ ماتحت مدرس اور ۲۰ سندھی منشی
۷۔ سری للو لال کب — بھاکا منشی
۸۔ قصہ خواں
۹۔ محمد (مہانند ؟) — ناگری نویس
۱۰۔ عبداللہ مسکین
۱۱۔ فطرت لکھنوی

مندرجہ بالا اشخاص صرف استاد ہی نہیں تھے بلکہ اِن تصانیف، تالیفات اور مرتب کردہ کتب فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں داخل تھیں۔

فورٹ ولیم کالج کا نصاب :

ڈاکٹر گل کرائسٹ کی ۱۶ تصانیف کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب نصاب میں شامل تھیں۔ مرثیہ مسکین، سنگھاسن بتیسی، شکنتلا ناٹک، اخلاق ہندی، قصہ نل و دمن اور کام کنڈلا، بے تال پچیسی، چہار درویش (باغ و بہار

مثنوی میر حسن، باغ اُردو یا ہندوستانی گلستان، توتا کہانی، ہفت گلشن، حکایات متفرقہ، نقلیات لقمانی، پند نامہ (نظم)، اخلاق محسنی (گنج خوبی)، راج نیت، گلدستہ حیدری، حسن اختلاط، نقلیات جلد دوم، قرآن شریف کا ترجمہ، حاتم طائی (آرائش محفل)، پریم ساگر، نثر بے نظیر، گل بکاؤلی، بارہ ماسہ، تواریخ بنگلہ، ہندوستانی بوستان (نثر)، قصہ حسن و دل، الف لیلیٰ، جامع القوانین۔ بحری وطبی ہندوستانی لغت

یورپ میں اُردو کا تعارف:

فورٹ ولیم کالج کی ادبی، تالیفی اور تصنیفی جوش و خروش کی وجہ سے ۱۸۰۵ء میں لندن میں ہیلے بری کالج قائم ہوا جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدے داروں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۸۱۸ء میں لیسٹر اسکوائر میں ایک ادارہ شرقیہ اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا جس میں ڈاکٹر جان گل کرائسٹ نے بھی کام کیا اور اُردو کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا۔ گارسین دتاسی نے پیرس میں ایک ادارہ قائم کیا اور اُردو سے متعلق تقریباً ایک سو پچیس کتابیں اور رسالے لکھے اور ۱۸۲۸ء سے ۱۸۷۸ء تک اُردو زبان کی خدمت کرتے رہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اردو کی جو گراں بہا خدمات انجام دیں اردو زبان اِس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اب اردو کی مقبولیت اِس قدر بڑھ چکی تھی کہ یورپ کے مختلف شہروں میں اِس کے لیے مدرسہ قائم کیے گئے اور ساتھ ہی یورپین علما نے اِس زبان سے دل چسپی لے کر اس کی اشاعت کے لیے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے چھ مشاہیر کے نام یہ ہیں:۔

"کپتان جوزف ٹیلر، گلیڈون، کپتان ٹامس رُدبک، جان

شکسپیر، ولیم ٹینٹ، یس ڈبلیو برٹن، جیمس آر بالن
ٹائن، انیوز نڈایونگ، ایچ۔ انڈرس، پیٹر برٹن، آرتھر
کوک، جیمز آر۔ بیلنٹائن، ناتھے برائس، گراہم بیلی، ایچ
سلوک مین، ولیم پرائس، کپتان بورادیل، جان پلیٹس،
پولک ڈبلیو۔ ایل۔ تھابرن، ٹی۔ ڈبلیو۔ تالبورٹ،
کپتان رابرٹ شیڈون ڈوبی، جے۔ ٹی۔ تھامس، ڈبلیو
سینٹ کلیر ٹسڈول، ایس۔ رسوسہ کارل میکل سمیتھ،
ڈنکن فاربس، ڈیڈمل وغیرہ۔،،

اِن مشاہیر میں اکثر وہ لوگ تھے جنھوں نے اُردو زبان سیکھنے کے لیے کتابیں اور لغت و قواعد تصنیف کیے اور کئی اردو دانوں نے اُردو زبان پر یہ احسان اور کیا کہ اُردو زبان کی مشہور کتابوں کے انگریزی فرانسی اور دیگر زبانوں میں ترجمے کیے۔ مثلاً" ڈنکن فاربس اور پلیٹس سے مل کر بیتال پچیسی کا انگریزی زبان میں منتقل کیا اِس کے علاوہ قصہ حاتم طائی اور باغ و بہار کو معہ فرہنگ کے ترجمہ کر کے شائع کر کے کپسن نے ڈپٹی نذیر احمد کی مشہور تصنیف توبتہ النصوح کا انگریزی میں آزاد ترجمہ کیا۔ کپتان ایچ۔ بی۔ ہینٹ" ترجمہ ریلفتہ گیت" میں سے چھ غزلیات کا ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے گلستان سعدی کا ترجمہ کیا۔

اِن یورپین علما کی کاوشوں سے اُردو زبان یورپ میں متعارف ہوئی اور اس نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ آج اٹلی، برطانیہ، چیکوسلواکیہ فرانس، جرمنی، بلجیم، ڈنمارک اور پرتگال میں اُردو زبان پڑھائی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو کی ہندوستان اور غیر ممالک میں مقبولیت کا سہرا فورٹ ولیم کالج کے سر ہے۔

دہلی کالج

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق مدرسہ غازی الدین کی ابتدا ۱۷۹۲ء میں ہوئی۔ مسٹر ٹامس وزیر اورینٹل کالجز ممالک مغربی شمالی کی تعلیمی رپورٹ کے مطابق ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ کالج میں تبدیل ہوگیا اور دہلی کالج کے نام سے مشہور رہا۔

دہلی کالج کے قیام کا مقصد بڑا دور رس تھا اور اس کا پس منظر قابل غور ہے۔ فرانس سے تصادم کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم ہندوستان میں جم چکے تھے۔ برطانوی رنگروٹوں کی تعلیم کے لیے فورٹ ولیم کالج قائم ہو چکا تھا، انگریزوں کی پالیسی یہ تھی کہ ہر وہ طریقہ اختیار کیا جائے جس سے ہندوستانیوں میں راہ و رسم زیادہ سے زیادہ بڑھے اور اعتماد پیدا ہو لہٰذا انھوں نے یہاں کی تہذیب کا احترام کیا۔ یہاں کی زبانیں سیکھیں اور یہاں کی تہذیب و تمدن اور معاشرے کو اپنانے کی کوشش کی۔ لیکن سامراجی مقاصد متعین ہو جانے کے بعد اُن کا انداز فکر بدل گیا اور تعلیم کی طرف سے بے توجہی برتی جانے لگی۔ لارڈ میکالے[1]

---

[1] طفیل احمد منگلوری، "روشن مستقبل"، نظامی پریس بدایوں، صص ۴۳-۱۴۲ باب اول، مقالہ ہذا، ....

کو یہ یقین تھا کہ اگر اِس کی نافذ کردہ تعلیمی پالیسی کا جس میں مشرقی علوم کو فضول اور بے کار کہا گیا تھا، عمل کیا گیا تو ہندوستان میں عیسائیت کو فروغ ہوگا اور انگریزوں کی لسانی، علمی اور مذہبی برتری کا سکہ بیٹھ جائے گا۔ میکالے کی اِس پالیسی نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ مشرقی علوم سرپرستی سے محروم کر دیے گئے لیکن دہلی کالج کو باقی رہنے دیا گیا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ دہلی سلطنت مغلیہ کا مرکز تھا اگرچہ اس کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں لیکن اس کے باوجود ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی ثقافتی روایتوں میں شریک ہوتے تھے۔ سب ایک ہی رنگ میں اِسی طرح رنگے ہوتے تھے کہ ان کا پہچاننا دشوار تھا۔ یہ شہر صدہا سال سے تہذیب و شائستگی اور علوم و فنون کا مرکز رہا تھا۔ یہاں کی ہر بات قابلِ تقلید تھی۔ یہ لوگ اردو اور فارسی کے شیدائی تھے۔ اب جب کہ فارسی ختم ہو چکی تھی لہٰذا اس کی قائم مقام اُردو ہو گئی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ دہلی کالج کو فروغ حاصل ہوا۔ اِس کالج کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ جتنے علوم داخل نصاب ہوتے ان کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔

۱۷ر جولائی ۱۸۲۳ء کو ایک جنرل تعلیمی کمیٹی کی تشکیل ہوئی اور ایک لاکھ روپے کی رقم اِس کے تصرف میں دے دی گئی۔ دہلی کے تعلیمی جائزے کے لیے مسٹر جے ٹیلر کو منتخب کیا گیا۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ "دہلی میں تعلیم کی حالت بڑی افسوس ناک ہے۔ ..... عمارتیں اور مدارس موجود ہیں اگر تعلیم کی از سرِ نو تنظیم کی جائے تو اچھے نتائج نکل سکتے ہیں"۔

مسٹر ٹیلر کی سفارش پر ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج قائم کیا گیا اور وہی اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ یہاں انگریزی زبان کی حیثیت ثانوی تھی لیکن اہلِ دہلی کے اشتیاق کے پیشِ نظر انگریزی کی جماعتیں علٰحدہ

بھی قائم کی گئیں۔

دہلی کالج انگریزوں کی اِس تعلیمی پالیسی کی بدولت وجود میں آیا جس پر مشرقی علوم کے حامی عمل پیرا تھے اس کے علاوہ یورپ میں ہندوستانی علوم کی بڑی قدر تھی۔ گوئٹے کے توصیفی اشعار، سرولیم جونس کے تحقیقی مقالات اور ولیم رابرٹس کے تہذیبی انکشافات نے اِن کی مقبولیت کو بڑھا دیا تھا لہٰذا جنرل کمیٹی نے جو تعلیمی پالیسی بنائی اس کو ایسی شکل دی کہ مشرقی علوم سوسائٹی کے اونچے طبقے سے شروع کی جائے اور اس کے فوائد و برکات ادنیٰ طبقے تک پہنچیں۔ انھیں اِس بات کا بھی پورا احساس تھا کہ اچھے نتائج مشرق و مغرب کی آمیزش ہی سے مرتب ہو سکتے ہیں اور اِسی صورت میں اِن ہندوستانی زبانوں کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے جو بعد میں ذریعہ تعلیم بنیں گی۔ دوسرے ہندوستان جیسے قدیم وسیع ملک میں مغربی آگاہیوں کی بنیاد صرف مشرقی علوم ہی پر رکھی جا سکتی ہے۔

دہلی کالج کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اِس نے اُردو کے ذریعہ مغربی سائنس، ہیئت، ریاضی، نیچرل سائنس، فلاسفی، وغیرہ کی تعلیم کا انتظام کیا اور شمالی ہند میں سب سے پہلے مشرق اور مغرب کے صحت مند عناصر کو سمونے کی کوشش کی۔ اِس کالج نے نہ صرف اُردو زبان میں تسلیم کی شان دار روایات قائم کیں بلکہ ایک اور ایک نئی شش جہت پیدا کی۔ تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت، مشرق و مغرب کا امتزاج اور آزاد نقطۂ نظر کا اولین احساس اِسی کالج نے پیدا کیا۔ رواجی تصورات سے نجات دلاکر ماضی کا تنقیدی شعور، حال کا نیا احساس اور مستقبل کی پذیرائی کی۔ اس کی اولیات میں تنقید شعر و ادب، ترجمہ و تاریخ، سیرت و سوانح، مضمون نگاری

اور صحافت کو اہمیت حاصل ہے۔

کالج کے ابتدائی دور میں یہ کوشش کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئی لیکن ۱۸۳۶ء میں دلی کالج کی تعلیمی حالت اطمینان بخش ہوگئی۔ اگرچہ ابتدا میں انگریزی اور مشرقی شعبے علاحدہ علاحدہ تھے لیکن جب مسٹر بروس کا پرنسپل کی حیثیت سے تقرر ہوا تو دونوں شعبوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا۔ ۱۸۴۲ء میں اِس پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ دونوں شعبوں کی تعلیم کو ایک کر دینے کا مقصد یہ تھا کہ تاریخ، اخلاقی اور سائنٹیفک مضامین کی تعلیم یکساں طور پر دی جائے۔ اِن مضامین کے ذیل میں حساب، جیومیٹری، الجبرا، نیچرل فلاسفی، جغرافیہ، تاریخ ہند، معاشیات اور اصول قانون کا خاص طور پر ذکر کیا گیا تھا۔ مسٹر بروس کا خیال تھا کہ جب موجودہ جدید تعلیم یافتہ نسل کے اساتذہ رخصت ہو جائیں گے۔ اور ان کے جانشین وہ ہوں گے جنھوں نے جدید طریقے پر تعلیم پائی ہے تو روشن خیالی بڑھ جائے گی۔

۱۸۳۵ء میں ایک مبارک کام یہ بھی ہوا کہ اُردو زبان کی تعلیم و تکمیل کے لیے "ورناکیولر سوسائٹی" [1] کا قیام عمل میں آیا۔ مغربی علوم کو اُردو زبان میں منتقل کرنے کے لیے قواعد و ضوابط بنائے گئے اور مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر کو اس کا نگراں مقرر کیا گیا۔

۱۸۴۵ء تک کی کالج کی سالانہ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو

---

[1] قدوائی، صدیق الرحمٰن، (ایم اے علیگ، ریسرچ فیلو شعبہ اُردو دہلی یونی ورسٹی،) "ماسٹر رام چندر" دہلی: ادبی پرنٹنگ پریس، بمبئی، ۱۹۶۱ء، ص ۴۶ (اِس سوسائٹی کا دوسرا نام "انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی" تھا)

زبان کے ساتھ ساتھ دلی کے طالب علموں میں انگریزی پڑھنے کا ذوق بھی بڑھنے لگا۔ طلباء کی تعداد ۴۶۰ ہوگئی انگریزی کے ۲۴۵، عربی کے ۷۵، فارسی کے ۱۰۹ اور سنسکرت کے ۳۱ طالب علم تھے جن میں ۱۵ عیسائی، ۱۴۶ مسلمان اور ۲۹۹ ہندو تھے۔ اِس تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴۶۰ میں سے ۴۱۸ طالب علم اُردو پڑھتے تھے اور ۴۲ ہندی۔

اِس زمانے میں دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسپرنگر تھے۔ اِن کی رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ فارسی سنسکرت اور ہندی کے شعبوں کی حالت اطمینان بخش نہیں تھی۔ ڈاکٹر اسپرنگر چونکہ عربی زبان سے واقف تھے لہٰذا اِن کی معتدلانہ کوششوں کے ذریعہ کالج کے مشرقی شعبے کے طلباء میں یورپین ادب و علم کا ذوق پیدا ہوگیا اور دونوں شعبے پورے جوش و خروش سے کام کرنے لگے۔ امتحان کے مضامین دونوں شعبوں میں تقریباً یکساں تھے مثلاً تفرقات Differential Calculus علم مثلث Trignomettary / اقلیدس، نیچرل، فلاسفی، الجبرا، جغرافیہ، مضمون نویسی۔ البتہ تاریخ کے مضمون میں کچھ فرق تھا۔ انگریزی شعبے میں مارشمین، ہیوم فین وغیرہ کی تاریخیں تھیں اور مشرقی شعبے میں مختصر خاکہ، تاریخ اور جامع التواریخ تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ جو تاریخیں انگریزی شعبے میں پڑھائی جاتی تھیں اُن کا ترجمہ اردو میں موجود نہ تھا۔

اس سلسلے میں مسٹر کارگل کے الفاظ بڑی اہمیت کے حامل ہیں وہ کہتے ہیں۔ .... مشرقی شعبے کا طالب علم سائنس کی تعلیم میں آگے بڑھ رہا ہے اور کسی طرح اپنے حریف یعنی انگریزی شعبے کے تعلیم علم سے پیچھے نہیں۔ ... حال ہی میں کالج کا معائنہ بعض نہایت قابل توجہ افسروں اور مشنریوں نے کیا جو معاملات تعلیم سے بخوبی واقف

تھے۔ انھوں نے مشرقی شعبے کے طلباء کا امتحان لیا اور ان سے علم ہیئت جنرل سائنس اور اخلاق اور مذہبی مسائل پر گفتگو کی۔ اِن سب کا یہ بیان ہے کہ اِس شعبے میں قطعی طور پر بہت ترقی پائی جاتی ہے۔ [1] اور مختصر یہ کہ تمام ہندوستان میں کسی جگہ ترقی کے ایسے آثار نظر نہیں آئے۔

لہٰذا اب یہ طے ہوا کہ طلباء زبان اردو کے ذریعہ حساب، جبر و مقالہ جیومیٹری، تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم حاصل کریں اور انگریزی، عربی، فارسی زبانوں کے لیے علاحدہ جماعتیں قائم کی جائیں اور ان زبانوں سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی مشق کروائی جائے۔

اِن تجاویز پر عمل کیا گیا اور اِس کے بہترین نتائج پیدا ہوئے۔ اِس کامیابی کا راز یہ تھا کہ ذریعہ تعلیم اُردو تھا۔ فارسی، عربی، سنسکرت زبانیں بھی اُردو کے ذریعہ پڑھائی جاتی تھیں اور دوسرے علوم جو داخل نصاب تھے۔ ان کا ذریعہ تعلیم بھی اردو ہی تھا۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء بروز پیر، دہلی میں غدر برپا ہوا۔ اور دہلی کے ساتھ دہلی کالج اور اِس کی لائبریری بھی لٹ گئی۔ ۱۸۶۴ء میں اِس کالج کو دوبارہ جاری کیا گیا اور یہ ۱۸۷۷ء تک برابر کام کرتا رہا لیکن اب اِس کی روح بدل چکی تھی اُردو کی جگہ انگریزی پر زور دیا جانے لگا۔ کالج اگرچہ بظاہر پنجاب یونی ورسٹی سے ملحق تھا مگر طلباء کلکتہ یونیورسٹی میں امتحان دیتے تھے۔ اور جب ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونی ورسٹی تسلیم کرلی گئی تو گورنمنٹ کی نامعلوم پالیسی کے تحت ۱۸۷۷ء میں اس کالج کو ختم کردیا گیا۔ ڈاکٹر لائٹنر اِس وقت گورنمنٹ کالج لاہور

---

[1] عبدالحق۔ ڈاکٹر، مولوی، "سرسید احمد خان" حالات و افکار"، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۵۹ء، مرحوم دہلی کالج)، صص: ۱۰۰!! ۔ ۔ ۔

کے پرنسپل تھے وہ گورنمنٹ کالج کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ لیفٹیننٹ گورنر کا منشا بھی یہی تھا لہٰذا دہلی کالج کے اساتذہ کو لاہور میں منتقل کر دیا گیا اور اِس طرح دلی اپنے عزیز کالج سے محروم ہوگئی۔

دہلی ورناکیولر سوسائٹی:

یہ سوسائٹی ۱۸۳۵ء میں قائم ہوئی۔ اِس سے قبل اسکول بک سوسائٹی نے بہت سی مفید کتابیں دیسی زبان میں تیار کی تھیں لیکن یہ محض ابتدائی کتابیں تھیں۔ اگرچہ انگریزی کی فوقیت تسلیم کی جا چکی تھی لیکن اِس بات کا بھی اعتراف کیا جاتا تھا کہ دیسی زبانوں میں مغربی علوم کا ترجمہ ہونا چاہیئے۔ ایجوکیشن کمیٹی نے اپنی سالانہ رپورٹ ۱۸۳۵ء میں صاف طور پر یہ اعلان کیا کہ لارڈ اکلنڈ نے اس مسئلے میں خاص دل چسپی لی اور ایک ذیلی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس میں سر ایڈورڈ ریان، مسٹر پرنسپ، مسٹر ملٹ اور مسٹر سندرلینڈ شریک اور خاص قابل تنخواہ دار اشخاص کو منتخب کر کے تدریسی کتابوں کا ایک سلسلہ جاری کیا گیا تاکہ اخلاقی اور ذہنی ضروریات پوری ہوسکیں۔ اِس انجمن کے بانی ہندوستانی اور انگریز دونوں تھے ۱۱۶ ہندوستانی اور ۵۲ انگریز اور شاہ اودھ اور حیدرآباد دکن کے امراء نے چندے دیے۔

مجلس انتظامی کے ارکان ٹی منگاف، سی گرانٹ، ای سی ریونشا، ڈبلیو سین، کونٹین، دوار کا ناتھ ٹیگور اور سیکریٹری و پرنسپل دہلی کالج مسٹر تیروس تھے۔ انجمن نے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کے لیے یہ قواعد وضع کیے:

۱۔ جب سائنس کا ایسا لفظ آئے جس کا مترادف اردو

میں نہیں تو ایسے الفاظ کو بجنسہٖ اُردو میں لے لیا جائے۔ ایسے خطابات اور القابات جو ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ان کو بھی جوں کا توں اردو میں مدغم کر لیا جائے۔ مثلاً ڈیوک، بشپ، ارل، کلکٹر وغیرہ۔

۲۔ اگر سائنس کا کوئی ایسا لفظ ہے جس کا مترادف اُردو میں موجود ہے تو اردو لفظ استعمال کیا جائے۔

۳۔ اگر لفظ مرکب ہے اور ہر دو لفظ انگریزی میں ہوں تو ان میں بس بجنسہٖ اردو میں منتقل کر لیا جائے۔ جیسے ہائڈرو کلورک اور ساتھ ساتھ انگریزی اردو کے مرکبات بھی تیار کیے جائیں مثلاً جسٹس آف پیس کو اردو میں جسٹس پیس اور ملٹری آرڈر آف دی باتھ کو لشکری جماعت باتھ اور ملٹری اینڈ ریلیجس آرڈر آف مالٹا کو مذہبی و لشکری جماعت مالٹا وغیرہ۔

۴۔ اگر لفظ مرکب ہے اور اردو میں اس کا مترادف موجود نہیں مگر الگ الگ مترادفات موجود ہیں تو دونوں لفظوں کو ملا کر کسی دوسرے مساوی مفہوم کے الفاظ میں ترجمہ کر لیا جائے مثلاً گرانولوجی کا ترجمہ "علم زباں"۔ "ہاؤس آف لارڈ" کا "کچہری امیروں کی" وغیرہ

۵۔ جب یہ قاعدہ آسانی سے مطابق نہ ہو تو پھر

غیر زبان کا لفظ اردو میں لے لیا جائے جیسے " ہائٹ روجن" "نائٹ روجن" وغیرہ۔

۶۔ اگر مرکب ایسے دو مفرد الفاظ سے بنا ہے جس کا ایک اُردو مترادف لفظ ہے اور دوسرا انگریزی تو ان دونوں کو ملا کر ایک مرکب بنا لیا جائے جیسے" کورٹ آف ڈائرکٹرز" کا ترجمہ "کچہری ڈائرکروں کی" — "آرچ بشپ" کا بشپ اعلیٰ"۔

۷۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جیسے آرڈ کلاس جینس اسپیسز جس کے مترادف اگرچہ کسی نہ کسی صورت میں اُردو میں پائے جاتے ہیں پھر بھی ایسے انگریزی الفاظ اُردو میں منتقل کر لیے جائیں تاکہ مفہوم سمجھنے میں مغالطہ نہ ہو، کیوں کہ اِن الفاظ کے معانی کا امتیاز نیچرل ہسٹری میں بہت اہم ہے۔

۸۔ درختوں کے انواع (خاندان) کے نام یا تو اس نوع خاندان کے کسی ممتاز فرد کے نام پر رکھے جائیں یا اس نوع کی مشترک خاصیتوں کی بنا پر نام رکھ لیا جائے اس قاعدے کی پابندی اردو میں کی جاتے۔"

اگر ہماری ڈکشنریوں میں مترادفات نہ ملے تو بجائے پنڈتوں اور مولویوں سے پوچھنے کے انگریزی لفظ اختیار کر لیا جائے۔ یا جو الفاظ پہلے انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہوں انھیں لے لیا جاتے۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی جہاں تک ہو سکے انگریزی الفاظ

سے احتراز کیا جائے۔ سائنس کے سلسلے میں جب کسی انگریزی جملے میں کسی خاص واقعے کی طرف اشارہ ہو تو متن میں اس کی مختصر تشریح کر دی جائے۔

مترجم کو لفظ بہ لفظ ترجمے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اصل مفہوم یعنی جملے کے معنی اور مطلب کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے اگر ضرورت ہو تو جملے کی ساخت تبدیل کر دی جائے۔

کیمسٹری کی اصطلاحات کے متعلق یہ رائے دی گئی کہ تمام اصطلاحی الفاظ کو بجنسہٖ اردو میں لے لینا مناسب ہو گا۔ البتہ کیمیائی عناصر جن کے نام اردو میں موجود ہیں وہ ویسے ہی رہنے دیئے جائیں لیکن مرکبات میں انگریزی نام ہی رہیں گے۔ جیسے ہائیڈروسلفیورک وغیرہ۔ چوں کہ اصطلاحی الفاظ کی ایسی تعداد زیادہ نہیں اس لیے ان کی تفہیم زیادہ مشکل نہ ہو گی۔

نباتیات کا ترجمہ بہت مشکل ہے یورپین مصطلحات کا لفظی ترجمہ بالکل مہمل ہو جائے گا البتہ دوسرا طریقہ درختوں کے خاندانوں کے نام رکھنے کا بتایا گیا ہے وہ زیادہ بہتر ہے اور عام طور پر مستعمل ہے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ یورپ کے کسی خاندان کے نہایت ممتاز افراد وہی نہیں ہوتے جو ہندوستان میں ہیں۔ بہرحال یہ نہایت ضروری ہے کہ کوئی صاحب جو نباتیات کا عام علم رکھتے ہو اور اُردو بھی خوب جانتے ہوں اِس کام کو انجام دیں۔

اِس سوسائٹی نے صرف اردو تراجم پیش کیے۔ ۱۸۴۵ء میں جب مسٹر بتروس علالت کی وجہ سے یورپ چلے گیے تو ان کی جگہ ڈاکٹر اسپرنگر کا تقرر ہوا جو بڑے پایہ کے مستشرق تھے۔ انھوں نے بھی بڑے جوش و خروش سے ترجمہ اور تالیفات کا کام جاری

دکھا۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اُردو کو علمی زبان بنانے کی یہ پہلی سعی تھی جو خاص اصول اور قاعدے کے ساتھ عمل میں آئی۔

دہلی کالج کے اثرات :

دہلی کالج سے قبل اُردو نثر اسالیب کے اعتبار سے محدود تھی۔ اس میں یا تو مذہبی عوامل و مباحث کا انداز رائج تھا یا تمثیلوں اور داستانوں کا۔ اردو زبان ابھی تک فارسی اور عربی کے دور اذکار استعارات اور تشبیہات سے مغلوب۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی لائی ہوئی سیاسی اور معاشی بدحالی کا علاج اب خواب و خیال کی پناہ گاہوں میں نہیں مل سکتا تھا۔ اب ایسے ادب کی ضرورت تھی جو نئے مصائب کا غم غلط کر کے نئے حادثات کا خوف دل سے نکال سکے اور اِن کے مقابلے میں حوصلہ و جوش عطا کر سکے۔

فورٹ ولیم کالج انگریزوں کو ہندوستانی زبان اور تہذیب و معاشرت سے آشنا کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ لیکن یہاں صرف وہی کتابیں تالیف و تدوین ہوئیں جو انگریزوں کے لیے مفید ہو سکتی تھیں۔ اگرچہ یہ ادبی سرگرمیاں محدود تھیں مگر اس نے اردو کو ایک ایسا ادبی طرز عطا کیا جو مزید ترقی کے وسیع تر امکانات لئے ہوئے تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے بند ہونے کے زمانے میں اُردو نثر کو صحافت کے ذریعہ فروغ حاصل ہوا۔ اور ادب شرفا اور امرا کی محفلوں سے نکل کر ہر پڑھے لکھے طبقے میں پہنچ گیا۔ پڑھنے اور لکھنے والوں کے درمیان ایک رابطہ پیدا ہو گیا اور اِن نئی روایات و اقدار کے بدلنے میں دہلی کالج نے سماجی ادراک رکھتے ہوئے اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں اہم ترین حصّہ لیا۔ یہاں نئے ذہنی

رجحانات اور مغربی فکر و فلسفہ پروان چڑھے۔ سیاسی اعتبار سے افادیت پسندی نے اساتذہ و طلباء کے طرزِ فکر کو بدل ڈالا۔ علم و فن، شعر و ادب، صنعت و حرفت غرض ہر شے کے پیچھے مفید مقصد تلاش کیا گیا۔ تعلیم کا مقصد معاشی فلاح کے علاوہ سماجی اصلاحی بھی بن گیا اور لوگ ادب میں مقصدیت اور افادیت کی اہمیت سے واقف ہوگئے۔ دہلی کالج میں اِن اصلاحی نظریات کے فروغ کے ساتھ اس کی نشو و نما بھی ہوئی۔

دہلی کالج میں بنیادی طور پر سائنسی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا اور اصل کوشش یہ تھی کہ تراجم کے ذریعہ مغربی علوم کی ترویج کی جائے اور طالب علموں میں جدید دور کے مسائل کو سمجھنے اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمودار ہونے والے تغیرات کی اہمیت کو محسوس کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ چناں چہ دہلی کالج نے ایک طرف تو نئی ادبی و فنی اقدار کو فروغ دیا اور دوسری طرف لوگوں کو مدلل انداز میں سوچنے کی طرف مائل کیا۔ لہٰذا اِس دور کے ادیب و شاعر اِس کے اثرات سے فیض یاب ہوتے اور اِسی وجہ سے دہلی کالج کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادبی رجحانات کی تاریخی اہمیت ہے اور جسے نظر انداز کرکے جدید اردو نثر کے ارتقائی مدارج کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ ماسٹر رام چندر، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزادؔ، مولوی ذکاء اللہ، پیارے لال آشوبؔ، صہبائیؔ، شیو نارائن، کریم الدین جیسے مشہور و معروف بزرگ اسی کالج کے طالب علم تھے جنھوں نے نہ صرف اردو زبان کو نئے فکر و نظر عطا کئے بلکہ اپنی گراں قدر تصانیف سے اردو زبان میں گنجِ گراں مایہ کا اضافہ کیا۔

سائنٹفک سوسائٹی

سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد اُس وقت رکھی جب ہندوستان کے مسلمانوں کے ہر شعبہ ہائے زندگی میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے ٹکراؤ سے ایک گومگو کا عالم طاری تھا۔ سرسید نے اِس سوسائٹی کے ذریعہ قوم کی پژمردہ قوتوں کے جگانے اور سیاسی اور سماجی انتشار کی وجہ سے جو اوہام اور اسقام پیدا ہو گئے تھے انھیں بڑی ثابت قدمی سے دور کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں عوام میں بدلے ہوئے حالات میں زندگی پوری کرنے اور قدیم روش کو بدلنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ سرسید نے اگرچہ زندگی کے ہر شعبے کی طرف توجہ دی لیکن ان کا سب سے بڑا کام تعلیمی اور علمی تھا سائنٹیفک سوسائٹی اس کا ایک حصہ تھی اسی کے ذریعہ اردو زبان کے ارتقاء میں بڑی مدد ملی۔

سرسید نے ۱۸۶۳ء میں "التماس بخدمت ساکنان ہندوستان درباب ترقی تعلیم اہلِ ہند" کے نام سے ایک مضمون شائع کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کرنی چاہیئے۔ جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرواکے چھاپے ۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو سرسید نے غازی پور میں جہاں وہ صدر الصدور تھے اپنے مکان پر ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مقامی اور یوروپین اصحاب شریک ہوئے۔ اس جلسے میں سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد بیان کیئے کہ جدید علوم کی اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب

تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔ انھوں نے ایک ایسے ہی اخبار کے اجراء پر بھی زور دیا اور کہا:

"جو (سائنٹیفک سوسائٹی) اِسی غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے، علمی مضامین پر لیکچر دیتے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایسے اخبار کے ذریعہ ظاہر کئے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے۔ ہندو مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اس میں شامل کئے جائیں اور اس طرح قومی مغائرت اور مذہبی تعصّبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔"[۱]

فوراً ہی ۱۲۹ ممبر نامزد ہو گئے جس میں ہندو، مسلمان اور انگریز سب شریک تھے۔ ۱۸۶۴ء میں سر سید غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڈھ آ گئے اور سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف بھی اپنے ساتھ لے آئے کیوں کہ ان کی غیر موجودگی میں اِس کام کا جاری رہنا مشکل تھا۔ مسٹر ولیم جنکس سوسائٹی کے صدر بنائے گئے۔ یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ سائنٹیفک سوسائٹی کے لیے ایک عمارت مستقل طور پر بنائی جائے۔ چناں چہ لیفٹیننٹ گورنر شمال مغرب اے۔ ڈری منڈ نے ۳ر نومبر، ۱۸۶۴ء کو اِس کا سنگِ بنیاد رکھا۔ سر سید نے اپنی نگرانی

[۱] سر سید احمد خان۔ حالات وافکار"، محمود بابا، ص ۱۳۶

میں عمارت تیار کرائی اور تقریباً تیس ہزار روپے کی کتابیں اور ضروری آلات مہیا کیے جب عمارت تیار ہوئی تو ۲۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو مسٹر ولیس کمشنر میرٹھ نے اس کا افتتاح کیا ڈیوک آف آرگائیل، وزیر ہند اس کے سرپرست اور اے۔ ڈری منڈ، لیفٹیننٹ گورنر شمال مغرب نائب سرپرست قرار پائے لیفٹیننٹ کرنل گریہم پہلے سکریٹری اور ان کے بعد سرسید مقرر ہوئے۔ اگرچہ سوسائٹی کے قوانین غازی پور میں ۱۸۶۲ء میں تیار کرلیے گئے تھے لیکن جب دفتر علی گڈھ منتقل ہو گیا تو ۱۸۶۶ء میں کسی قدر ترمیم کے ساتھ اغراض و مقاصد مرتب کیے گیے۔

"لقب اور مقصد":

اس کا نام سائنٹیفک سوسائٹی یعنی علمی سوسائٹی کہا جائے گا۔ اور اِس کا مقصد یہ ہو گا:

(۱) اِن علوم و فنون کی کتابوں کا جس کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا ہو گا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

(۲) جب کبھی سوسائٹی مناسب سمجھے تو کوئی ایسا اخبار یا گزٹ یا روز نامچہ یا میگزین وغیرہ چھاپ کر مشتہر کرنا جن سے ہندوستانیوں کی فہم و فراست کی ترقی مقصود ہو۔

(۳) ایشیا کے قدیم مصنفین کی کم یاب اور نفیس کتابوں کی تلاش کر کر بہم پہنچانا اور چھاپنا۔

"سوسائٹی کی بناوٹ":

سوسائٹی میں (اول) معاون ممبر (دوسرے) آنریری ممبر (تیسرے) رفقائے سوسائٹی ہوویں گے۔ اور سوسائٹی کے مربی اور نائب مربی مقرر ہوا کریں گے۔ معاون ممبر دو قسم کے ہوں گے (اول) ممبران خصوصی یعنی وہ ممبر ایسے مقام میں یا اس کے قریب رہتے ہوں جہاں سوسائٹی کا اجلاس

ہوتا ہو۔ دوم، ممبران مکاتیب یعنی وہ ممبر جو اس مقام سے جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہے، فاصلے پر رہنے کے سبب سوسائٹی کے جلسے میں شریک نہ ہو سکیں اور بذریعہ خط و کتابت سوسائٹی سے ارتباط رکھیں۔

تعداد : غیر محدود

چندہ : دو روپے ماہانہ

آنریری ممبروں کی تعداد دس سے اور رفقائے سوسائٹی کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہوگی۔ صاحبان ڈائرکٹرز پبلک انسٹرکشن بنگال اور شمال مغرب اور سینٹرل انڈیا اور اودھ و پنجاب موجودہ وقت بشرطیکہ وہ قبول کریں آنریری ممبر ہوں گے (گارسین دتاسی بھی اس سوسائٹی کے آنریری ممبر بنائے گئے۔)

رفقائے سوسائٹی کے ایسے ممبر ہوں گے جو بہ سبب تحصیل علم یا علوم کے نہایت نامی ہوں مگر ممبری کے عہدے پر مقرر ہونے کا ان کو کچھ خیال نہ ہو۔

کونسل مشیر کے ذمہ ترجمہ و ترتیب کتب ترجموں کی پسندیدگی و ناپسندیدگی نیز یہ تجویز کہ ترجمہ فارسی، عربی، ہندی میں کیا جاوے یا کن کن زبانوں یا کسی زبان میں کیا جاوے۔

کونسل کارپرداز ذمہ دار منتظم اور ایک کتب خانے کا قیام جو عمارت سوسائٹی نے علی گڈھ میں بنائی وہ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ کہلائے گا۔ اور جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کی عجیب عجیب چیزیں اس مکان میں عجائب خانے کی غرض سے جمع کی جائیں گی اور ان چیزوں کے حالات وقتاً فوقتاً مشتہر کیے جایا کریں گے۔

۳۰ر مارچ ۱۸۶۶ء سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری ہوا۔ یہ اخبار پہلے ہفتے وار تھا۔ پھر ہفتے میں دو بار نکلنے لگا۔ ایڈیٹر خود سرسید تھے۔ مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں اس اخبار کے متعلق اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے:

اول اول سرسید زیادہ تر اس میں پولیٹکل معاملات پر مضامین

اور نوٹ لکھتے تھے۔ اِس لیے ان کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولٹیکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ اِس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اُردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اُردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے۔ اِس لیے اِس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ اِس کے مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس کی ابتدائی جلدیں دیکھنے سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی سیاسی اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے۔"(۱)

اِس میں سوشل اخلاقی، علمی اور پولٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی۔ علاوہ اِن لیڈنگ آرٹیکلوں کے وہ خود لکھتے تھے۔ انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر چھپتے رہتے تھے۔ ہندوستان کے طریقِ معاشرت یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لیکچر سوسائٹی میں دیئے جاتے تھے وہ سب اِس کے ذریعہ شائع ہوتے تھے۔

"اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانہ حال کی نئی اطلاعیں اِس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں اِن کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ

---

(۱) خواجہ الطاف حسین، حالی، "حیاتِ جاوید"، دہلی: انجمن ترقی اُردو (ہند)، ۱۹۳۹ء
حصہ اول، ص ۱۱۲

مبالغہ نہیں کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچے کے اجرا سے شروع ہوئی مگر اس کے ساتھ پولیٹیکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اِس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی اخبار نے حاصل نہیں کیا۔" لے

ایک خاص وصف جو اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اِس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی زبانوں سے ممتاز ٹھہراتا تھا وہ یہ تھا کہ اِس نے اپنے طرزِ تحریر میں برخلاف اپنے تمام معاصرین کے کبھی کسی قوم یا فرقے یا کسی خاص شخص کی دل آزاری روا نہیں رکھی۔ اِس نے اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کے لیے جو ہمیشہ نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں، سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اِس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی یا خیر خواہی کے خلاف ایک حرف نہیں لکھا، کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اِس کے اہل کار پر زہر نہیں اُگلا۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو

لے "سرسید احمد خاں۔ حالات و افکار"، محولہ بالا، (سائنٹیفک سوسائٹی)، ص ۱۴۰!

صلح آشتی کی نصیحت کی۔،، ؎۱

یہ سب کچھ سچ ہے لیکن یہ اس وقت تک تھا جب تک کہ کالج اور دوسرے کاموں کا ہجوم نہیں ہوا تھا آخر میں تو یہ "ماخوذ از پانیر" ہو کے رہ گیا تھا لیکن جب کوئی مسئلہ یا اہم معاملہ آجاتا تھا تو سرسید خود پرزور مضامین لکھتے تھے شروع میں منشی یار محمد ایڈیٹر تھے اور منشی چکھن لال انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرتے تھے۔ مولوی فیض الحسن اور بابو گنگا پرشاد کتابوں کا ترجمہ کرتے تھے اُجرت پر بھی کام ہوتا تھا۔ اخبار کے عملے پر پانچ سو روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ ایک کتب خانہ قائم کیا گیا۔ آلات علمی اور کل پرزوں کے نمونے جمع کیے گئے اور لیکچروں کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر کل کلی نیچرل سائنس پر ہر ماہ ایک لیکچر دیتے تھے اور عملی تجربہ کر کے حاضرین کو دکھاتے تھے۔

سوسائٹی کی ترقی اور فروغ کا دار و مدار سرسید پر تھا۔ انھوں نے اپنی ذاتی کوشش محنت اور سالانہ چندوں اور عطیوں سے سوسائٹی کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا۔ اپنا ذاتی پریس سوسائٹی کو بطور عطیہ دے دیا۔ جون ۱۸۶۶ء میں نواب سکندر بیگم والیہ بھوپال نے جب سنا کہ سید احمد خان نے ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے یہ سوسائٹی قائم کی ہے تو انھوں نے بطور خوشنودی ایک الماس کی قیمتی انگوٹھی اور ایک ہزار روپے سرسید کو بھیجے جو انھوں نے ایک جلسۂ عام میں سوسائٹی کو دے دیا۔ سرسید نے سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کے لیے فوجداری اور کلکٹری کے مختار اور وکیلوں کو قانون پر لیکچر دینے شروع کیے اور اس سے جو فیس وصول ہوتی تھی وہ سوسائٹی کی نذر کر دیتے تھے۔

حکومت اور مخیّر حضرات نے بھی سوسائٹی کی معقول مدد کی۔ حکومت نے تین ایکڑ تین روڈ اور تیس پول زمین سرکاری عمارت کی تعمیر کے لیے اور ایک

؎۱ "سرسید احمد خان" حالات و افکار"، محولہ بالا، ص ۱۴۱۔

سرکاری بانی علم فلاحت کی ترقی اور امتحان کے لیے عطا کی۔ مہاراجہ جودھپور نے سو روپے سالانہ، مہاراجہ کپورتھلہ نے پچاس روپے، مہاراجہ جے پور نے پچاس اور نواب رام پور نے سو روپے سالانہ امداد مقرر کی۔ وائسرائے اور لیفٹیننٹ گورنر وغیرہ نے چندوں سے مدد کی، سر جان لارنس نے خاص توجہ دی، مسٹر ڈریمنڈ لیفٹیننٹ گورنر شمال مغرب اور میکلوڈ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے بھی چندے دیئے۔ نواب کلب علی خان نے بارہ سو روپے کی نقری کرسی سوسائٹی کو دی۔ مہاراجہ اندور اور نواب ٹونک نے عطیات دیئے۔ مہاراجہ بنارس کو بھی اِس سے خاص دل چسپی تھی۔ عنایت اللہ خان رئیس بھیکم پور نے دو سو روپے کنوئیں کی تعمیر کے لیے دیئے۔ سر اکلینڈ کالون، مسٹر سیپٹ کلکٹر میرٹھ اور مسٹر کیمپس ڈائریکٹر تعلیمات بھی اس کے معاون و مددگار تھے۔ سرسید کی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ سالانہ چندے اور اخبار کی قیمت دس ہزار آٹھ سو پچاس تک پہنچ گئی۔" [1]

۱۵ اگست ۱۸۶۷ء میں جب سرسید عہدہ جج اسمال کاز کورٹ پر ترقی پا کر علی گڈھ سے بنارس چلے گیے تو سوسائٹی کا تمام کاروبار راجہ جے کشن داس، سی۔ ایس۔ آئی کو جو اس زمانے میں علی گڈھ کے ڈپٹی کلکٹر تھے سپرد کیا گیا اور انھوں نے بڑی توجہ سے اس کام کو سرانجام دیا۔ لیکن سرسید بنارس میں رہ کر بھی برابر سوسائٹی کی مدد کرتے رہے اور ان کے مضامین سوسائٹی کے اخبار میں شائع ہوتے رہے۔

۱۸۶۷ء میں سرسید نے دسہرہ کی چھٹیوں میں بنارس سے علی گڈھ آئے اور ضلع علی گڈھ کے اکثر زمینداروں سے سوسائٹی کی مستقل آمدنی کے بارے میں مشورہ لیا۔ بہت سے زمینداروں نے تجویز پیش کی کہ اس ضلع کے تمام دیہاتیوں سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر

---

[1] سر احمد سر سید احمد خان۔ حالات و افکار، محولہ بالا، ص ۱۴۱

کیا جائے اور ایسا بندوبست کیا جائے کہ نسلاً بعد نسلاً زمینداروں کے وارثوں کو کوئی عذر پیش کرنے کا جواز نہ رہے۔ چناں چہ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۷ء کو سوسائٹی کے جلسے میں سرسید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی ہو۔ اِن کی عرضیوں کے اور معہ تفصیل ۱۳۳ دیہات کے جارج ہنری لارنس کلکٹر ضلع علی گڈھ کی خدمت میں اپنی چھٹی کے ذریعہ سے روانہ کردے۔ اِس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوا کہ اس کے جواب میں جو چھٹی پرائیویٹ سیکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا مورخہ ۱۸ر اکتوبر، ۱۸۶۸ء بنام سرسید موصول ہوئی اِس میں وائسرائے کی طرف سے رضامندی ظاہر کی گئی تھی[۱]۔"

"۹ر مئی، ۱۸۶۸ء کو سوسائٹی نے ایک ایڈریس سرولیم میور لیفٹیننٹ گورنر شمال مغرب کی خدمت میں پیش کیا اور سوسائٹی کی درخواست پر سرولیم میور نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف کی جائیں ان میں گورنمنٹ ضرور مدد دے گی۔"

"چناں چہ ۲۶ر اگست، ۱۸۶۸ء کو گورنمنٹ شمال مغرب نے دیسی کتابوں پر انعام دینے کا اعلان کیا۔ اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ لوگ مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اِس اشتہار کا اثر اِس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اِس لیاقت کو کام میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ برقی قوت کی طرح دوڑ گیا نھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے۔ خصوصاً اُردو لٹریچر صرف اِس تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کر دی تھی تھوڑے عرصے میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا[۲]۔"

---

[۱] "حیات جاوید"، محولہ بالا، حصہ سوم ص ۱۳۷
[۲] حالی، خواجہ الطاف حسین "حیات جاوید" محولہ بالا، حصہ سوم، ص ۱۳۶

سرسید کی دور اندیشی سوسائٹی کے نام سے ظاہر ہے۔ اس زمانے میں جدید خیالات کی اشاعت اور سائنس کا ذوق پیدا کرنا بڑا کام تھا۔ جب سوسائٹی علی گڈھ میں منتقل ہوئی تو اس کے نام کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور سرسید بھی کسی طرح مائل ہو گئے کہ یہ نام بدل دیا جائے لیکن جب طریقہ علم کاشت کاری اور علمی عجائبات کا رہنے طے ہو گیا تو یہی نام مناسب خیال کیا گیا اور آخر تک یہی نام رہا۔

سائنس کے لیکچروں کے علاوہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے علمی تجربے بھی کئے گئے اور علم فلاحت کے اصول کے مطابق سوسائٹی کے باغ میں گیہوں بویا گیا اور جب تیار ہو گیا تو جلسے میں اس کا نمونہ دکھایا گیا۔ ایک ایک دانے میں ساٹھ ساٹھ ستر ستر شاخیں نکلیں اور بعض میں سے سو سے بھی زیادہ پھوٹ کر مثل پودے کے جھنڈے کے ہو گیا تھا۔ [1]

مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تالیف اور مغرب اور مشرق کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ترجمہ سوسائٹی کا بڑا مقصد تھا۔ علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ بہت بڑا مقصد تھا۔ سرسید نے سیاسی، معاشی، نیچرل فلاسفی، علم آب و ہوا کے ترجموں کا مشورہ دیا اور لکھا کہ مقاموں اور شخصیتوں کے ناموں کے معاملے میں بہ نسبت یونانی کے عربی زبان کی پیروی کرنی چاہیئے۔ اور جو تلفظ کسی لفظ کا یورپ یا ایشیا کی زبان میں مروج ہو وہی اختیار کیا جائے۔ انگریزی زبان کی تقلید لازمی نہیں۔ ہندی حروف "ٹ" اور "ڈ" کا استعمال نہ کیا جائے۔ ہیئت اور جیالوجی (ارضیات) کے ترجمے کی رائے بھی دی۔ دوسرے خط میں سفارش کی کہ ایک عمدہ تاریخ مصر مسمّی "حسن المعاضرہ"

---

[1] "سرسید احمد خان۔ حالات و افکار"، محولہ بالا، ص ۴۶؛

[2] ایضاً، ص ۱۳۶

مصنفہ سیوطی ہے، "ھشت بہشت" کا نسخہ بھی بھیجا جو ادریس بدخشی کی تصنیف ہے جس میں شاہ مراد کی وفات کے حالات ہیں۔ انھوں نے ہیرن صاحب کی تاریخ کے ترجمے کی بھی رائے دی۔

خود سرسیّد نے بھی دو کتابوں کی تالیف کا ارادہ ظاہر کیا جس میں پہلی "تاریخ زبان اُردو" تھی لیکن وقت نے فرصت نہ دی۔ دوسری "اُردو لغات" جو انھوں نے شروع کر دی تھی اِس کا نمونہ موجود ہے۔ اس پر بعض یورپین فاضلوں نے رائیں بھی لکھیں۔

دہلی کالج اور اس کی ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے انگریزی سے مختلف علوم و فنون کے ترجمے اردو زبان میں شائع کئے اور عجائب خانے کے لیے۔ جمع کئے۔ سرسید نے سوسائٹی کی بہبودی اور ترقی کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ضلع کے رئیسوں کو اس کی امداد پر آمادہ کیا۔ گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ خود اپنی بساط سے بڑھ کر اس کو مالی امداد پہنچائی۔ اِس کی عالی شان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی۔ اِس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ تدابیر کیں۔ لائق آدمی ترجمے کے کام کے لیے مقرر کیے۔ تقریباً چالیس چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائیں۔ غازی پور، علی گڈھ، بنارس جہاں کہیں رہے اپنے اعلیٰ علمی مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے۔ یہاں تک کہ لندن کے سفر تک میں اسی دھن میں لگے رہے۔ انھوں نے مولوی مہدی علی کو خاص طور اپنی غیر موجودگی میں کام جاری رکھنے کی ہدایات دیں۔ محض سوسائٹی کی خاطر کلکتے[۱] کا سفر اختیار کیا اور ۶ر اکتوبر ۱۸۶۳ء کو مذاکرہ علمیہ میں ایک طویل لیکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر دیا۔

۱؎ "سرسید احمد خان ـ حالات و افکار"، محولہ بالا۔

درحقیقت سائنٹیفک سوسائٹی ایک تجربہ گاہ کی حیثیت اختیار کرگئی تھی اس کے کام یاب تجربوں کی بنیاد پر سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک کی بنا ڈالی۔ اس کی کام یابی کی وجہ سے سرسید کو ابتدا میں یقین ہوگیا تھا کہ ہندوستان میں جدید علوم کی ترویج واشاعت صرف اُردو زبان ہی کے ذریعہ کی جاسکتی ہے اس سوسائٹی کے ذریعہ بعض تعلیمی تحریکیں بھی کی گئیں مثلاً تحصیل ملک کے نصاب تعلیم پر غور کرنے کے لیے کمیٹی مقرر کی گئی۔ اِس سوسائٹی کے ضمنی نتائج میں سے ورناکیولر یونی ورسٹی کی تحریک تھی جو اس زمانے کے لیے بالکل نئی تھی۔

اس سوسائٹی نے نہ صرف علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیں بلکہ اس کی تقلید میں ملک کے مختلف مقامات میں متعدد انجمنیں اور سبھائیں قائم ہوگئیں جو اپنے اپنے حلقے میں مفید کام کرتی تھیں۔ سوسائٹی کے اخبار کا اُردو اور دوسرے دیسی اخبارات پر بھی بہت اثر پڑا اور وہ سیاسی اور معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر سنجیدگی سے بحث کرنے لگے۔ اس سوسائٹی کا اُردو زبان اور ادب پر بہت بڑا احسان ہے۔

باب۔ دوم

انجمن پنجاب کا پس منظر

برطانوی دور کی سیاسی و سماجی پس منظر
اور
علومِ قدیمہ، علومِ جدیدہ، اورنٹیل یونی ورسٹی کی تجویز
سر سید اور راس مسعود کی
مجوزہ یونی ورسٹی وغیرہ

برطانوی دور کی سیاسی و سماجی پس منظر

باب دوم

انجمن پنجاب کا پس منظر

برطانوی دور کی تاریخ اور سیاسی و سماجی پس منظر :

اورنگ زیب عالم گیر کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال[1] شروع ہوا۔ تخت کے لیے رقابتیں، امراء کی ریشہ دوانیاں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت نے اخلاق تباہ کر دیے، کمپنی کی منافع خوری بدعہدی اور دھوکہ بازی نے ہندوستان کو کھوکھلا کر دیا اور ملک میں مذموم رواج پھیلنے لگے۔ اِس انتشار سے عوام کا ضابطۂ حیات متاثر ہوا اور سیاسی استحکام اور انتظام ملکی میں فرق پیدا ہو گیا۔ سیاسی استحکام اور انتظامی کارگزاری کی بنیاد عوام کا ضابطہ حیات ہے۔ اول اخلاقی پستی کا سب سے زیادہ اثر حکمراں طبقے پر ہوا۔ دربار، شہزادے، درباری امرا اور منصب دار اس پستی کا شکار ہو گئے۔ یہی طبقہ معاشرے میں تقلیدی مثال سمجھا جاتا تھا۔ اس کے انحطاط نے معاشرے کے ہر طبقے کو متاثر کیا۔ بہادر شاہ اول ۱۷۰۷ء سے لے کر بہادر شاہ ظفر

---

[1] باری، "کمپنی کی حکومت"، لاہور: مکتبہ اُردو، ۱۹۶۰ء، ص ۱۴۱

۱۸۵۷ء تک کا زمانہ بادشاہوں کی نا اہلی، عیش پرستی، ذاتی مفاد کے لیے امرا کی ریشہ دوانیاں، صوبوں کا خود مختار ہو جانا، نئی یورپین طاقتوں کا سیاست میں حصہ لینا، بیرونی حملہ آوروں کی قتل و غارت گری، مرہٹوں سکھوں اور جاٹوں کی لوٹ مار نے مغلیہ سلطنت کی مرکزی حیثیت کو ختم کر دیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود مغل بادشاہ عوام میں مقبول و محبوب تھے۔ کلکتہ اگرچہ حکومت و اقتدار کا مرکز بن گیا تھا لیکن دہلی اب بھی اپنی مثال آپ تھی۔ ۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کو فتح کر لیا اور پورے برصغیر کی مالک بن گئی۔ انگریز ریذیڈنٹ سلطنت کا حاکم سمجھا جاتا تھا اور شاہ عالم قلعہ معلیٰ میں رنگ رلیاں مناتا تھا۔ لیکن اِن حقائق کے باوجود شاہی دربار ملک کا سب سے بڑا تہذیبی مرکز تھا۔ عوام کو بادشاہ سے دلی عقیدت تھی اور اس عقیدت میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے۔

۱۷۵۷ء میں کلائیو کے عہد سے لے کر لارڈ ہسٹنگز کے زمانے تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹی، صنعت و حرفت اور تجارت کو برباد کر دیا۔ اہل ہند کو بڑے عہدوں سے خارج کیا۔ عدالتوں کو ذریعہ آمدنی بنایا اور اپنی سیاسی مذہبی برتری ثابت کر کے ہندوستان کے ساتھ تحقیر کا برتاؤ کیا۔ ۱۸۳۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے کمپنی سے تجارت کا حق چھین لیا اور ہندوستان کی حکومت اس کے ہاتھ میں رہنے دی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ اب انگلستان کے تاجر اور کارخانہ دار ہندوستان کی سیاست، صنعت و تجارت پر مستقل طور پر مسلط ہو گئے جس کی وجہ سے صنعت و تجارت بہتر نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ انھیں جاہل اور ناکارہ کہہ کر ملازمتوں سے عملاً خارج کر دیا۔

تجارت کا مشغلہ باقی نہ رہنے کی وجہ سے اب کمپنی کی پوری توجہ ملک گیری کی طرف مبذول ہو گئی۔ سندھ بغیر کسی وجہ کے انگریزی قلمرو میں شامل کر لیا گیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء وائسرائے کے زمانے میں برما کا بچا ہوا حصہ، اودھ اور دوسری کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں براہ راست کمپنی کی حکومت میں شامل کر لیں۔

پنجاب کے صوبے میں چیف کمشنر سر ہنری لارنس نے سکھوں کو مسلمانوں کے مقابلے کے بعد اپنا بنا کر ۱۸۴۹ء میں اپنی سلطنت کا وفادار بنا لیا۔ باقی ماندہ جدید مقبوضات میں ہر طرف ظلم اور ناانصافی کا دور دورہ تھا۔ ہندو راجگان میں متبنیٰ لڑکا مثل حقیقی لڑکے کے سمجھا جاتا تھا مگر کمپنی نے رئیسوں کو اس حق سے محروم کر کے پندرہ ریاستیں اپنے قبضے میں لے لیں جس سے عام ناراضگی پھیل گئی۔ صوبۂ اودھ کو جو کمپنی کا وفادار تھا اپنی تحویل میں لینے کی وجہ سے انگریزوں سے نفرت آگ کی طرح پھیل گئی۔ ۱۸۵۶ء میں نواب واجد علی شاہ پر بدنظمی کا الزام لگا کر انھیں معزول کر دیا گیا کیوں کہ واجد علی شاہ نے فوج کی نئے سرے سے تنظیم شروع کر دی تھی۔

فوجی سپاہیوں کے عقائد اور محسوسات و عادات اور روایات کے خلاف اِن کو اپنے احکامات کی تکمیل کے لیے زبردستیاں کی گئیں اور اِس طرح پورا ہندوستان ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی لپیٹ میں آ گیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے ذمے دار مسلمان ٹھہرائے گئے۔ برطانوی حکومت نے مسلمانوں ہی سے سلطنت چھینی تھی اس لیے وہ اِن کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان پر طرح طرح کے مظالم توڑے گیے۔ اِن کی مالی، تعلیمی اور عام حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ ہجرت کے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے۔ سرحد سے تعلقات رکھنے کے

جرم میں علما کو پھانسی دی گئی اور بقیہ کو وہابی کہہ کر کالا پانی بھیج دیا گیا۔ قاضیوں کے قانون منسوخ کر دیئے گئے۔ کمپنی کے نظام تعلیم سے چوں کہ مسلمان بدظن ہو چکے اور حاصل نہ کر سکتے تھے لہٰذا اکثر و بیشتر ملازمتوں کے دروازے اِن پر بند کرتے گئے۔

میلکم لوئیس جج عدالت العالیہ مدراس و ممبر کونسل نے اپنے ایک رسالے میں لندن سے لکھا تھا :

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانون وراثت کو منسوخ کیا، بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسم و رواج کی توہین کی، عبادت خانوں کی جاگریں ضبط کرلیں۔ سرکاری کاغذات میں انھیں کافر لکھا۔ امرا کی ریاستیں ضبط کرلیں۔ لوٹ کھسوٹ سے ملک تباہ کیا۔ انھیں تکلیف دے کر مال گزاری وصول کی۔ سب سے اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انھیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست قائم کئے۔"[1]

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے اسباب کیا تھے ان اسباب نے پورے ہندوستان کو اس طرح بے چین کر دیا تھا کہ آخر چربی کے کارتوس اِس آگ کو بھڑکانے کا سبب بن گئے۔ اس خوف ناک تصادم کو صرف ہندوستان کی سربرآوردہ شخصیتوں سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کی یہ عوامی کوشش تھی، جو بغیر کسی تنظیم کے عمل میں لائی گئی، انگریزوں کی حکمت عملی

---

[1] طفیل احمد منگلوری، "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، بدایوں: نظامی پریس، سنہ ۱۹۴۰ء، ص ۸۷

ان کی تنظیم اور جدید آلات حرب کے وافر ذخیرے سے برطانوی استعمار نے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کیا۔ اِس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اِس وقت صرف اِن چھ بڑے لوگوں کے نام تحریر کئے جاتے ہیں جنھوں نے اِس جنگ میں حصہ لیا اور بہادر شاہ کو ہندوستان کا شہنشاہ تسلیم کر کے سبز پرچم بلند کیا۔ مہاراجہ بھٹور صرف نانا صاحب، کان پور میں تانتیا ٹوپی، جھانسی کی رانی، بخت خان، روہیل کھنڈ میں شہزادہ، فیروز شاہ۔ روہیل کھنڈ کے خان بہادر خان، حضرت محل بیگم واجد علی شاہ، فیض آباد سے مولوی احمد اللہ شاہ۔ جگ دیش پور کے راجہ کنور سنگھ۔ اِن لوگوں نے بے شک جنگ میں کھل کر حصہ لیا لیکن انگریز عورتوں اور بچوں سے اچھا سلوک کیا۔ برطانوی جانب دار مورخوں نے انگریزوں کے قتل کے واقعات کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے لیکن یہ قتل ان گروہوں نے کئے جو کسی فوج یا سربراہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن اِن کے مقابلے میں انگریزوں نے جو مظالم ڈھائے وہ اِن کا عشرِ عشیر بھی نہ تھے۔

سکھوں، گورکھوں اور ریاستوں کی مدد سے جب انگریزوں کو کامیابی ہوئی تو انھوں نے جو مظالم ڈھائے وہ ناقابل بیان ہیں۔ اِن مظالم کے بارے میں ہومز نے لکھا ہے:

> "[1] بوڑھے آدمیوں نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا اِن سے اور بے کس عورتوں سے جن کی گود میں دودھ پیتے بچے تھے ہم نے اِسی طرح بدلہ لیا جس طرح بڑے باغیوں سے۔" ایک انگریز افسر نے لکھا ہے کہ ابنالہ سے دہلی تک ہزاروں بے قصور دیہاتیوں کو

---

[1] طفیل احمد منگلوری، "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، محولہ بالا، ص ۹۳۔

انگریزوں نے مار ڈالا۔ ان کے جسموں کو سنگینوں سے چھیدا جاتا تھا، ہندوؤں کے مندر میں گائے کا گوشت ٹھونسا جاتا تھا۔ طلعس نے لکھا ہے کہ کچھ مسلمانوں کو ننگا کر کے زمین سے باندھ کر سر سے پاؤں تک جلتے ہوئے تانبے کے ٹکڑوں سے اچھی طرح داغ دیا گیا اور مسلمانوں کو سور کی کھال میں سی دیا جاتا تھا۔"

انیسویں صدی دراصل بحث و مناظرے کی صدی تھی اِس میں مشرق و مغرب، قدیم و جدید، بدعت و سنت، شاہی و جاگیرداری، مذہب و سائنس، جبلت و عقل، غرض ہر شعبۂ زندگی میں ایک تصادم نظر آتا ہے۔ برصغیر میں مذہبی تصادم کی جدید تحریکوں کی اولین علم بردار عیسائی مشنری تھے۔ اِن کی سرگرمیوں کا اصل محرک مذہب تھا۔ اہل یورپ کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں عیسائی سلطنت کے زیر سایہ ایک مسیحی کلیسا کی بنیاد رکھی جائے۔ اِس زمانے کے عیسائی فاتحین دین اور سیاست کو الگ تصور نہ کرتے تھے اور اسلام پر مشنریوں کے حملے کی زد بہت زیادہ منظم اور سخت تھی۔ اسلام اور عیسائیت دونوں سامی الاصل مذاہب تھے۔ اور دونوں کی بنیادی اصطلاحات کسی حد تک متحد اور باہم مانوس ہونے کے علاوہ عقائد اور ارکان ایک حد تک مشترک تھے اِسی وجہ سے عیسائیوں کو مسلمانوں کو مغالطے میں ڈالنے کی کوشش کام یاب ہو سکتی تھی اِس کے علاوہ یہ سیاسی حربہ بھی تھا۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے اثرات دور کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان کے دینی اور مذہبی احساس مٹا دیا جائے تاکہ دینی تنظیم کی ابتری کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی یک جہتی کو ختم کیا جا سکے اور ان کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ عیسائی پرچم کے زیر سایہ اور ضرورت کے لحاظ سے

بزورِ شمشیر اور بذریعہ حکمتِ عملی ہندوستان سے اِسلام کے اثر کو بالکل زائل کر دیا جائے۔

عیسائی مشینریوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے مسلمانوں میں اصلاحی تحریکوں کی ابتداء ہوئی اور ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے نے ہندو دھرم کی قدیم روایات کو ایک حد تک خیرباد کہہ کر ایک نئے سلسلۂ خیال کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ تمام مذاہب اصلاً ایک ہیں۔

پنجاب میں سوامی دیانند نے ہندوؤں میں بہادری یا ہندو عصبیت کی روح کو بیدار کرنے کے لیے آریہ سماج کی تشکیل کی۔ لیکن اِس تحریک کی زد میں صرف عیسائیت ہی نہیں بلکہ اسلام بھی تھا۔

اِن غیر مذاہب کے حملوں کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبی عصبیت کو ایک حد تک فائدہ پہنچا اور انھیں اِس بات کا موقع ملا کہ وہ اسلام کو ایک بار پھر مذاہب کے مقابلے میں جانچ تول سکیں۔ لیکن اسلام کے لیے سب سے زیادہ خطرناک آزمائش انیسویں صدی میں یورپ کے علمی افکار کی صورت میں ہندوستان میں نازل ہوئی۔ یورپ میں علوم کی اجتماعی ترقی کے ساتھ ساتھ عقلِ محض کے علاوہ سائنس کے تجربات و مشاہدات بھی تھے۔ اِن حربوں کے ساتھ عیسائیت نے اسلامی عقائد کی بنیاد پر حملے کیے جو نہایت شدید تھے۔ نتیجتاً ہندوستان میں اِن مغربی افکار کی اشاعت سے اسلام کو حقیقی خطرات سے دوچار ہونا پڑا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے جدید تعلیم کے نام سے تعلیمی تحریک شروع ہوئی کی غرض و غایت سرکاری ملازم تیار کرنا اور دیگر ضروریات کے لیے کارندے مہیا کرنا تھا۔ اِس تعلیمی تحریک کو ۱۸۵۷ء کے بعد حکومت برطانیہ نے جاری رکھا اور جدید سائنسی علوم کو ہندوستان میں بروئے کار لاکر یہ بتایا گیا کہ وہ جاہل محض ہیں۔

لیکن یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ زمانہ سابق کے لوگ پڑھے لکھے زیادہ ہوتے تھے۔ اس کی تصدیق ماہر تعلیم ڈاکٹر لائٹنر کے قول سے ہوتی ہے۔ پر کیر ہارڈی نے میکس مولر کے حوالے سے تحریر کیا ہے:

"انگریزی عمل داری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے۔ اسی طرح چار سو آدمیوں کی آبادی کے لیے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا۔ نیئر لڈلو نے تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ "ہندوؤں کے ہر موضوع میں جو اپنی قدیم حالت پر قائم رہے بچے بالعموم لکھ پڑھ سکتے تھے مگر جس جگہ ہم نے مثل بنگال کے پرانا نظام توڑ دیا ہے وہاں سے گاؤں کا اسکول غائب ہو گیا ہے۔"[۱]

سوائے نفع حاصل کرنے کے ابتدا میں کمپنی نے تعلیم پر روپیہ خرچ نہیں کیا، لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جب اس کی حکومت قائم ہو گئی تو اس نے تعلیم کی طرف توجہ دی۔ مگر تعلیم کے متعلق انگریزوں میں دو مختلف الخیال لوگ تھے۔ جو جماعت تعلیم کی موافقت میں تھی وہ کہتی تھی کہ ہندوستان کے لوگ تعلیم پا کر عیسائی ہو جائیں گے اور تعلیم یافتہ لوگ چونکہ انقلاب کے مقابلے میں ارتقائی ترقی کو زیادہ پسند کرتے ہیں اس لیے ہماری سلطنت زیادہ وسیع ہو جائے گی۔ مگر مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی شدید مخالفت کی کہ مذہب قائم ہو جانے کی وجہ سے انسان کے مقاصد متحد ہو جاتے ہیں اور اگر یہ ہو گیا تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ . . . اگرچہ لاکھ عیسائی بھی وہاں ہو گئے تو اس سے سخت مصیبت آ جائے گی۔ امریکہ کی مثال ہمارے سامنے موجود

ل "تاریخ باسو" جلد پنجم، ص ۱۴

ہے۔ اور اِس طرح یہ رزدلیوشن ناکام ہوگیا۔"[۱]

لیکن کمپنی کے ایک ڈائریکٹر چارلس گرانٹ نے ۱۷۹۳ء سے تعلیم کی تائید میں ایک رسالہ لکھنا شروع کیا جس میں سے چند اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ "یہ بالکل انگلستان کے اختیار میں ہے کہ ہندوؤں کو بتدریج ہماری زبان سکھاتے اور بعد میں اِسی کے ذریعہ ہمارے فلسفۂ فنون اور مذہب کی تعلیم دے۔ یہ تعلیم خاموشی کے ساتھ تمام غلط باتوں کی عمارت کی بیخ کنی کر کے بالاخر اسے گرا دے گی۔

۲۔ مگر بلاشبہ سب سے اہم تعلیم جو ہندوؤں کو ہماری زبان کے ذریعے ملے گی وہ ہمارے مذہب کی معلومات ہوں گی۔

۳۔ ہندو اِس قدر کم زور دل ہیں کہ ان میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہونے کی ہرگز امید نہیں۔

۴۔ اِس اندیشے سے کہ تعلیم پھیلنے سے کسی زمانے میں ہماری حکومت متزلزل نہ ہو جائے اور ہمارے مفاد کو نقصان نہ پہنچے۔ ہمیں ہندوستان کو سچے مذہب (یعنی مذہب عیسوی) سے اور بہترین اخلاق سے اور علوم و فنون کے اصول سے محروم نہیں کرنا چاہیئے۔

---

[۱] "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، محولہ بالا، ص ۱۳۵

۵۔ جس طرح کہ مسلمانوں نے دفتروں کی زبان فارسی کردی تھی اسی طرح انگریزی جاری کرنے سے عدالتوں اور دفاتر کے کام میں آسانی ہو گی اور ہندو اُسے خوشی سے حاصل کریں گے کیوں کہ اس سے ان کی وقعت اور اہمیت بڑھ جائے گی۔"[۱]

ابتداء میں اِس رسالے کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا لیکن ۱۷۹۹ء میں انگلستان سے دو پادری آئے۔ اِن کی سرپرستی والسرائے لارڈ ولزلی نے بھی کی چناں چہ اِن دونوں میں سے مسٹر کیری کو فورٹ ولیم کالج میں سنسکرت کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ یہ دونوں پادری اپنے طور پر اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے رہے۔ ۱۷۸۱ء میں گورنر جنرل اول ہسٹینگز نے مسلمانوں کی درخواست پر کلکتے میں ایک کالج قائم کیا جس میں عربی اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ اس کی نگرانی کے لیے ۱۷۸۲ء میں کپتان آرون کو اس کا سکریٹری مقرر کیا جنھوں نے عربی کا نصاب اپنی مرضی کے مطابق تیار کیا جس میں مذہبی علوم کی جگہ علم ادب وغیرہ زیادہ تھا۔ اِسی طرح سنسکرت کی تعلیم کے لیے بنارس میں سنسکرت کالج قائم کیا گیا۔ اِن دونوں کالجوں کے قیام کی غرض یہ تھی کہ قانونی اور عدالتی کام کی انجام دہی کے لئے ہندو اور مسلمان افسر تیار کیے جائیں۔

۱۸۱۱ء میں لارڈ منٹو وائسرائے ہند نے ایک طویل یادداشت لکھ کر کورٹ آف ڈائریکٹرز کو بھیجی جس میں دکھایا گیا تھا کہ علم کا روز بروز زوال ہو رہا ہے۔ "ہندو مسلمانوں میں مذہبی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے دروغ حلفی اور جعل سازی کے جراثیم بڑھتے جا رہے ہیں۔" اور اس طرح تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کرنے اور مزید کالج کھولنے کی سفارش کی اور آخر پہلی بار ہندوستانیوں کی تعلیم پر ایک لاکھ

---

[۱] سید محمود، "تاریخ التعلیم"، ص ۷۔

روپے سالانہ رقم منظور کی گئی۔ لیکن کمپنی کے ڈائرکٹروں کی طرف سے گورنر جنرل کے نام ایک مراسلے بھیجا گیا جس میں تحریر تھا کہ سنسکرت کی سرپرستی کی جائے اور ہندوؤں کے علوم کی سرپرستی کی جائے۔

دس سال تک حکام وقت نے اِس رقم کو خرچ نہیں کیا ۱۸۲۳ء میں ایم الفسٹن اور ایف۔ وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ کو پیش کی جس سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"انصاف یہ کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیے۔ ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف ان علمی ہمت افزائی کے لیے تمام ذرائع کو ہٹا لیا بلکہ حالت یہ ہے کہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اِس الزام کو دور کرنے کے لیے ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔" [۱]

اِس دس سال کے عرصے میں پادریوں کو کھلی چھٹی مل گئی۔ انھوں نے جگہ جگہ ہندوستان میں انگریزی مدرسے کھولے اور ان میں دلبرفورس اور چارلیس گرانٹ کے منصوبوں اور تبلیغی پروگرام کو پورا کرنا شروع کیا:

اُس زمانے میں راجہ رام موہن رائے نے جو غیر متعصب تھے اور کلکتے کے ایک گھڑی ساز مسٹر ڈیوڈ ہیر نے ایک انگریزی کالج ۱۸۱۶-۱۷ء میں قائم کیا جس کا نام "اینگلو انڈین" تھا اور "ڈدیار" بھی کہلاتا تھا اسی طرح پادری کیری نے ۱۸۱۸ء میں عیسائیوں

---

[۱] "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، محولہ بالا، ص ۱۲۹

کا "جسے نارائن" کالج قائم کیا۔ ان کالجوں کو دیکھ کر ۱۸۲۱ء میں پونا میں ہندو کالج قائم کیا گیا ۱۸۲۳ء میں آگرہ کالج قائم ہوا اور اسی زمانے میں کلکتہ مدرسہ، سنسکرت کالج اور آگرہ کالج میں انگریزی کلاسوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور اس طرح ۲۹ ستمبر ۱۸۳۰ء میں پہلی مرتبہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اس پالیسی کا اعلان کیا کہ انگریزی زبان رفتہ رفتہ محکمہ جات میں جاری کر دی جائے۔" [۱]

ان کالجوں میں عیسائی مذہب کی اشاعت ہو رہی تھی۔ دوسری طرف پادریوں کی تبلیغ کا سلسلہ جاری تھا اور اس طرح سر رشتۂ تعلیم کی امیدیں نوجوانوں کے عقائد بدلنے کے سلسلے میں پوری ہو رہی تھیں جس کا ذکر سر فریڈرک ہلیڈے نے ۱۸۵۳ء میں اپنی شہادت میں کیا ہے:

"میں سمجھتا ہوں کہ ہندو کالج میں انجیل کی تعلیم اس قدر زیادہ ہے کہ انگلستان کے کسی پبلک اسکول میں نہیں ہے۔"

راجہ رام موہن رائے کی اس کوشش پر کہ مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی میں تعلیم دی جائے ۱۸۳۲ء میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا اجلاس ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو منعقد ہوا۔ لارڈ میکالے کو اس کمیٹی کا صدر چنا گیا۔ اس کمیٹی کے اراکین کی رائے

۱؎ ٹینیس، "سوانح راجہ رام موہن رائے، (انگریزی)"، بحوالہ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" محولہ بالا، ص ۱۴۰

۲؎ عبدالحمید صدیقی، (مترجم) "نظام تعلیم کا اساسی تخیل۔ یادداشت از لارڈ میکالے، ص ۳۶

یں اختلاف تھا ایک فریق انگریزی زبان میں تعلیم دیتے جانے کا مخالف تھا تو دوسرا اس کا حامی۔ جب رائے لی گئی تو دونوں کے ووٹ برابر تھے۔ اِس موقع پر لارڈ میکالے نے اپنا فیصلہ کن ووٹ انگریزی کی زبان کی تعلیم کی تائید میں دیا جس سے انگریزی کے اجراء کا فیصلہ ہو گیا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں جو اعلانیہ رائے دی تھی وہ یہ تھی: [۱]

ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق رائے اور الفاظ سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔[۱]"

مگر حقیقی رائے جو اس کے دل میں چھپی ہوئی تھی اپنے والد کو ایک خط میں لکھ کر بھیجی اس کے الفاظ یہ ہیں۔:

"اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے۔ کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ بعض مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عمل درآمد ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بُت پرست بھی باقی نہیں رہے گا۔" [۲]

---

[۱] عبدالحمید صدیقی۔ (مترجم)، نظام تعلیم کا اساسی تخیل۔ یادداشت از لارڈ میکالے، ص ۲۶

[۲] باسو، میجر، "تاریخ التعلیم" ص 1.5

۱۸۳۷ء میں مرکزی گورنمنٹ نے صوبوں کی گورنمنٹوں کو اجازت دی کہ بجائے فارسی زبان کے اپنے اپنے صوبوں کی زبان جاری کریں۔ اس کے بعد ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۴ء لارڈ ھارڈنگ کا ریزولیشن اس مضمون کا جاری ہوا کہ اب ملازمتوں میں "انگریزی تعلیم یافتوں کو ترجیح دی جائے گی۔"[۱]

اس حکم کی مخالفت میں ہندوستان کی رعایا جس میں مسلمان بھی شامل تھے یہ نہیں کہا گیا تھا کہ انگریزی شرطِ ملازمت نہ قرار دی جائے یا انگریزی کو اہمیت نہ دی جائے، البتہ انگریزی کی مخالفت اِس بنیاد پر کی گئی تھی کہ اِس کو مذہب عیسوی کی اشاعت کا ذریعہ بنایا گیا تھا۔ اِس سلسلے میں پہلا احتجاج کلکتے کے آٹھ ہزار دستخطوں کے ساتھ لارڈ ولیم بینٹنگ کو پیش کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کے مراسلے کے ذریعہ حکم دیا گیا کہ تمام روپے صرف انگریزی تعلیم پر صرف کیے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلکتے کے مدرسے میں عربی تعلیم کے لیے جو تھوڑا بہت روپیہ ملتا تھا وہ اس سے بھی محروم کر دیے گئے۔ اب افسران زیادہ تر روپیہ عیسائی اسکولوں کو دیتے تھے اور جن مقامات میں عیسائی اسکول تھے وہاں کوئی اور اسکول قائم نہ کرنے دیتے تھے۔ اِس پر اہل مدراس نے جس میں ہر مذہب کے لوگ شریک تھے ۱۸۵۲ء میں پارلیمنٹ میں گورنر مدراس کے خلاف ایک عرض داشت کے ذریعہ سخت احتجاج کیا کہ سرکاری روپیہ عیسائی بنانے میں خرچ کیا جاتا ہے لیکن اس موقع پر حکومت نے غیر جانب دار ہونے کا اعلان کر دیا۔

مذہب عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور مذہب میں مداخلت کا سلسلہ بڑھتا رہا جس سے رعایا کے دلوں میں حد درجہ بدگمانیاں پیدا ہوئیں اور دو مرتبہ ہوئیں مدراس اور بارک پور میں سپاہیوں نے بغاوت کی اور آخر کار

۱۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، محولہ بالا، ص ۱۴۳

۱۸۵۷ء میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔

علوم قدیمہ و جدیدہ :

ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی عہد کے ابتدائی دور میں مذہبی کش مکش کے باوجود جدید تعلیم کی اشاعت ہوتی۔ اگرچہ اس کا مقصد برطانوی سلطنت کا استحکام تھا۔ اسی کے لیے انھوں نے اہلِ ہند کو تعلیم دی اور خود بھی علوم مشرقی سے آشنا ہوئے۔ جس کے اثرات بڑے دور رس تھے۔ اسی تعلیم کے نتیجے میں اہلِ ہند جدید علوم سے آشنا ہوئے اور اس زمانے میں ایسے واقعات رونما ہوئے جو اردو کی ترویج و اشاعت میں مددگار ثابت ہوئے۔ اِس میں سب سے اہم اُردو پریس کا قیام ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے اراکین اور مصنفین کی بہت سی کتابیں طبع ہوکر ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئیں۔ ۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے اردو کو عدالتی اور دفتری زبان قرار دیا اور زبان کے سرمائے میں بڑی تیزی کے ساتھ بیش بہا اضافہ ہونے لگا۔ قانونی اصطلاحات اردو کے قالب میں ڈھل گئیں۔ مولوی نذیر احمد کی خدمات اس سلسلے میں ممتاز ہیں۔ جن کے قانونی تراجم کی مدد سے ہزارہا الفاظ خواص و عوام کی زبانوں میں رواج پا گئے۔

اِسی زمانے میں اکثر کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں اور اردو کے طرزِ بیان اور محاورے میں انگریزی کی صاف گوئی اور روانی کو رواج پانے کا موقع ملا۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت کی جگہ سیدھا سادہ انداز پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں مرحوم دہلی کالج کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ جہاں بڑی کثرت سے بیش بہا تراجم ہوئے۔ چونکہ یہ کتابیں خالص علمی اور ادبی مباحث

۱؎ "نگار" (ماہنامہ) : سرسید نمبر

از ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: حصہ دوم، ص ۱۸۹

سے متعلق تھیں لہذا رفتہ رفتہ زبان میں یہ صلاحت پیدا ہونے لگی کہ سنجیدہ اور ٹھوس مضامین پر قلم اٹھایا جا سکے۔

لیکن اس موقع پر قصداً اردو کو ناگری رسم الخط میں لکھ کر اردو اور ہندی کے شعبوں کو علاحدہ کر کے ہندو اور مسلمانوں کے اتفاق اور ربط وارتباط کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر اردو کو شدید نقصان بھی پہنچایا گیا۔

۱۸۳۵ء میں پریس ایکٹ کا نفاذ ہوا جس سے اخباروں کو آزادی دی گئی۔ ۱۸۳۶ء میں مولانا آزاد کے والد مولوی باقر نے دہلی سے اردو اخبار نکالا اور پھر سرسید کے بڑے بھائی اور خود سرسید کی کوششوں سے "سید الاخبار" شائع ہونے لگا۔

شاہ عبدالعزیز نے ۱۸۲۱ء میں انگریزی تعلیم سے استفادے کا فتویٰ دیا۔ جس کی وجہ سے مسلمان اور زیادہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے اور یورپی ممالک کی ترقی سے براہ راست واقف ہوتے اور طالب علم جدید نقطۂ نظر سے طبیعات، کیمیا، ہیئت، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سیاست مدن، فلسفۂ اخلاق وصحافت، قواعد، لغت سازی تذکرہ و ترجمہ، ادب نسواں، مقالہ نگاری اور مکتوب نویسی سے واقف ہی نہیں ہوتے بلکہ ان علوم کو اردو کے ذریعہ حاصل کر کے ان کی اہمیت اور ضرورت سے واقف ہوئے۔

جدید اردو ادب کے بانیوں میں سرسید، نذیر احمد، ذکاء اللہ پیارے لال آشوب، محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال، مولانا حالی، شبلی اور غالب کا نام سرفہرست ہے۔

کمپنی کی عمل داری سے پہلے ہندوستان میں قدیم طریقۂ تعلیم کا رواج تھا۔ جو اس زمانے کے لیے نہایت ضروری تھا۔ والیان ملک اور امراء تعلیم کی پوری سرپرستی کرتے تھے۔ اس کے لیے جاگریں اور جائیدادیں وقف کرتے

تھے۔ اس کے علاوہ اکثر علماء میں درس و تدریس کا ذوق پشتہا پشت سے چلا آرہا تھا۔ یہ بزرگ خود بجائے ایک مدرسہ تھے۔ ان علماء کے علمی شغف کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ ان کا کوئی وقت درس و تدریس سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف مکتبۂ خیال کے علماء کا فیض بھی عام ہوا کرتا تھا۔ مساجد اور خانقاہوں میں طالب علم ان علماء سے فیض حاصل کرتے تھے۔ درباروں میں جہاں علماء اور درس گاہوں کی سرپرستی کی جاتی تھی وہاں خانگی ملازموں اور غلاموں کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا جاتا تھا۔ عالم گیر نے خاص طور پر تعلیم کو بہت زیادہ ترقی دی۔ ہر صوبے، ہر شہر کو تعلیم سے معمور کیا۔ دلی، پنجاب، نارنول، آگرہ، فتح پور سیکری، بدایوں، رام پور، اودھ، الہ آباد، فرخ آباد، جونپور، اٹاوہ، بنارس، کلکتہ وغیرہ مشہور شہروں اور ان کے قصبات میں مدرسوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ صرف بنگال میں اسی ہزار مدرسے قائم تھے اور اسی فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ اسی طرح ہندوؤں کے لیے پاٹھ شالے قائم تھے لیکن ہندو عام اور رائج علم و ادب مسلمانوں کے مدرسوں سے حاصل کرتے تھے جس میں ذات پات کی قید نہ تھی یہی وجہ ہے کہ فارسی اور اردو کے ہندو مصنفوں کی کمی نہیں۔ برہمن، کھتری، کائستھ خاص طور پر قانون اور ادب میں دلچسپی لیتے تھے۔

عربی[1] کے مروجہ مذہبی نصاب کے علاوہ ایک مشترکہ نصاب تیار کیا گیا تھا تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں پڑھ سکیں۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس نصاب میں حسب ذیل فنون تھے جن کو کسی مذہب سے کوئی علاقہ نہیں۔ اخلاق، ریاضیات، حساب، زراعت، اقلیدس، مساحت، ہیئت، رمل، قواعد مال، آئین سلطنت،

---

[1] "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے"، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ص ۲۳۲

طب، طبیعات، الہیات اور تاریخ۔ ہندوؤں کو ان کے علاوہ سنسکرت صرف و نحو ہندو تصوف و اخلاق اور ہندو فلسفہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

فارسی زبان و ادب کا عام نصاب یہ تھا جس میں وقتاً فوقتاً جزوی تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ کریما، مامقیمان، گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، سکندر نامہ، بہار دانش، اخلاق ناصری، انوار سہیلی، شاہنامہ، انشائے خلیفہ وغیرہ۔ بعد کے زمانے میں اس میں وقائع نعمت خان عالی، سہ نثری ظہوری، رقعات عالمگیری، پنج رقعات اور انشائے مادھو رام بھی درس میں شامل ہوگئیں ان کے علاوہ ہیئت، نجوم، طب، موسیقی، علوم طبیعہ، ریاضیات، قصص وحکایات بھی پڑھائی جاتی تھیں۔

ہندوستان[1] فتح کرنے سے پہلے مسلمانوں میں کاغذ کا رواج عام ہو چکا تھا چھٹی صدی ہجری میں کاغذ تیار ہونے لگا تھا اور سب سے پہلے کارخانہ کشمیر میں قائم کیا گیا۔ نویں صدی ہجری میں احمد آباد پٹن اور کھمبانت میں بھی کاغذ کے کارخانے قائم ہو گئے تھے۔

اسی طرح بڑے بڑے کتب خانے قائم کئے گئے جس میں غازی خان کا کتب خانہ، بابر کا کتب خانہ، ہمایوں، اکبر، اور خان خاناں کے کتب خانے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ فرید اور فیضی کا کتب خانہ، عالم گیر کا کتب خانہ نواب لوہارو کا کتب خانہ، گجرات کا شاہی کتب خانہ شاہ عالم کا کتب خانہ بھی مشہور ہیں۔

خوش نویس، مصور، مترجم، جلد ساز وغیرہ کثرت سے تھے۔ ہر مدرسے کے ساتھ کتب خانے ہوا کرتے تھے جن میں چند کے نام تحریر کیے جاتے

---

[1] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے" اعظم گڈھ : دارالمصنفین ص ۲۴۸

ہیں۔ شاہ وجیہ الدین کے مدرسہ کا کتب خانہ، مدرسہ ٹین کا کتب خانہ، مخدوم ابراہیم کے مدرسے کا کتب خانہ، مدرسہ ھدایت بخش کا کتب خانہ مدرسہ ولی اللہ کا کتب خانہ مشہور ہیں۔ ان کتب خانوں میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی، ترکی، پشتو، بھاشا، سنسکرت، ناگری، اور پنجابی کی کتابوں کا کتب خانہ جو نواب کلب علی خان کا تھا مشہور ہیں۔

ان مدارس میں جن کا درجہ آج کل کے کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے برابر تھا، بڑے بڑے مشہور ماہر فن تعلیم دیتے تھے۔ ان کی اپنی اپنی عمارتیں ہوتی تھیں۔ طلبا کے لیے دارالاقامہ اور ان کے ساتھ مسجدیں اور کتب خانے تھے۔ غرض مروجہ تعلیم کی تمام ضروریات ان میں مہیا تھیں۔ اس سلسلے میں سلاطین عادل شاہ اور بے جاپور کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خطاطی اور خوش نویسی ہر زمانے میں قابل قدر رہی۔

علوم قدیمہ :

جدید تعلیم سے قبل جو علوم مشرقی مدارس میں رائج تھے وہ یہ تھے۔[۱]

علم دین، جس میں علم فقہ، حدیث، علم الرجال کے علاوہ علم الکلام بھی پڑھایا جاتا تھا۔ علم لِسان۔ لغت، صرف، نحو، معانی، بیان بدیع، علم منطق، انشاء وغیرہ شامل تھے۔

علم حساب، علم ہندسہ، علم ہیئت، علم آلات، علم طب

نصاب تعلیم قدیمہ (نظامیہ سلسلۂ تعلیم) :

علم صرف۔ علم نحو، علم معانی و بیان و بدیع، علم ادب (عربی و فارسی) علم منطق، علم طبعی و الٰہی، علم حساب،

---

[۱] اسماعیل پانی پتی، شیخ (مرتب)، : "مقالات سرسید"، لاہور : مجلس ترقی ادب، حصہ ہفتم، وہشتم ۱۹۶۲ء، ص

علم ہندسہ، علم ہیئت، علم کلام، علم فقہ علم اصول،
علم تفسیر، علم فرائض، علم مناظرہ، علم وضع آلات،
اصول علم حدیث، علم حدیث، علم لغت، علم طب۔

علوم جدیدہ:

علوم جدیدہ کی تعریف سرسید احمد خان نے اِن الفاظ میں کی ہے:

"واضح ہو کہ علوم جدیدہ سے تین قسم کے علوم مراد ہیں۔

۱۔ ایک وہ جو متقدمین یونانیہ اور حکماء اسلامیہ کے زمانے میں مطلق نہ تھے اور اب حال میں ایجاد ہوتے ہیں۔ مثلاً جیالوجی اور الیکٹرسٹی وغیرہ۔

۲۔ دوسرے وہ علوم جن کا نام تو متقدمین یونانیہ اور حکمائے اسلامیہ میں تھا مگر جن اصول پر وہ مبنی تھے وہ اصول غلط ثابت ہو کر متروک ہو گئے اور اب نئے اصول قائم ہوتے۔ جن کو اصول قدیمہ سے کچھ مناسبت نہیں اور بجز اتحاد نام کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ مثلاً علم ہیئت اور کیمسٹری وغیرہ۔

۳۔ تیسرے علوم جو متقدمین یونانیہ اور حکمائے اسلامیہ کے زمانے میں بھی تھے اور ان کے اصولوں میں بھی کچھ اختلاف نہیں ہوا مگر اب ان کو کمال وسعت ہو گئی ہے کہ زمانہ حال میں بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں مثلاً میکنکس یعنی علم آلات جو ہمارے یہاں بلفظ علم جرثقیل مستعمل ہے اور علم حساب، جبر و مقالہ

ل۔ مقالات سرسید، محولہ بالا، حصہ ہفتم، دہشتم، ص ۲۱۱

علم ہندسہ وغیرہ۔،،

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں لاچار و بے بس کر دیا۔ انگریزوں کا پورا عتاب مسلمانوں پر تھا۔ ہندو ہر طرح انگریزوں کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ راجہ رام موہن رائے کی علمی تحریک نے انھیں جدید علوم پر آمادہ کر دیا تھا اور اِس کے بہتر نتائج بھی سامنے آچکے تھے۔ حکومت کے انتظامی امور میں ہندو ہر شعبے پر چھا چکے تھے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے تو مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی زبان فارسی کو ختم کیا اور اس کے بدلے تھوڑے سے عرصے کے لیے اُردو کو رائج کیا۔ مسلمان اس تبدیلی سے ایک حد تک خوش تھے لیکن سرسید کو شک پیدا ہو چکا تھا کہ اگر ذریعہ تعلیم اردو کر دیا گیا تو مسلمان ان جدید علوم سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ جو اس زمانے میں یورپ سے براہ راست برصغیر میں منتقل ہو رہے تھے۔ یہ بھی انگریزوں کی حکمت عملی تھی کہ انھوں نے اردو کی ہمت افزائی کی، لیکن سرسید اِس چال کو سمجھ چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں تو انھوں نے ورنا کلر یونی ورسٹی قائم کرنے پر زور دیا لیکن جب پنجاب یونی ورسٹی کی مثال ان کے سامنے آئی جس میں تمام رائج علوم کا کام یاب ترجمہ کیا جا رہا تھا حالاں کہ یہ ابتدائی کوشش تھی۔ لیکن ترجمے اصل کے مقابلے میں اِس لیے نہیں آسکتے تھے کہ افادیت کے لحاظ سے وہ کم تھے جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے۔ اور جن کے متعلق یہ شک تھا کہ ملک کی سیاسی اور اجتماعی فلاح کے کام میں تیز رفتار نہیں تھے۔ اِسی لیے سرسید نے اپنا نقطۂ نظر تبدیل کر دیا اور انگریزی زبان و علوم پڑھنے پر زور دیا۔

اورنٹیل یونی ورسٹی کی تجویز:

"رسالہ اسباب بغاوت ہند،، لکھنے کے بعد سرسید نے ۱۸۶۶ء میں اپنی کوشش سے علی گڈھ میں ایک ادارہ "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے

نام سے قائم کرایا جس کا مقصد ہندوستان اور برطانیہ دونوں ملکوں کے مشترک اغراض کی ترقی تھا اور سرسید ہی اِس ایسوسی ایشن کے سکریٹری بنائے گئے۔

۱۸۶۷ء میں سرسید نے "انڈین ایسوسی ایشن" کی جانب سے ایک درخواست ورنیکل یونی ورسٹی (ورنیکلر یونی ورسٹی) کے لیے گورنر جنرل کو بھیجی۔ یہ بڑی اہم اور دور رس انقلابی تحریک تھی۔ درخواست میں پہلے تعلیم کی غرض و غایت بیان کی اور اس کی رو سے مروجہ طریقہ تعلیم ناقص اور غیر کافی بتایا اس کے بعد لکھا ہے:

"تعلیم[1] جواب ترقی کرنے سے تھکی ہوئی ہے اِس کے کئی باعث ہیں جن میں سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ ایک ایسی غیر اجنبی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اِس کی صراحت کی ہے۔ مگر جس تجویز کو ہم گورنمنٹ اور لوگوں کی غور و فکر اور تصفیہ کرنے کے واسطے پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس حالت میں ہم انگریزی تعلیم قائم رکھیں اور اس کی ترقی میں کوشش کریں تو کیا ہم کسی دیسی زبان کو اس قسم کا ذریعہ اختیار اور تجویز نہیں کر سکتے۔ جو ایک غیر ملک کی نسبت علم کے عموماً شائع ہونے اور لوگوں کے خیالات اور طور طریقے اور اخلاق کی ترمیم کے زیادہ تر مناسب ہو؟ ... یہ کب ہو سکتا ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی اِس قدرت کے برخلاف عمل کر سکیں جو بابل کے مینار پر اس نے دکھائی۔ پس اگر

---

[1] عبدالحق، ڈاکٹر، سرسید احمد خان۔ حالات و افکار"، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۹ء، صص ۵۹-۵۸

یہ بات ممکن نہیں تو بجز اِس کے اور کوئی علاج اور تدبیر نہیں کہ اہل یورپ کی روشن ضمیری اور ان کا علم و فضل لوگوں کو علی العموم سکھانے کے لیے دیسی زبان کو ذریعہ ٹھہرایا جائے۔"

اِس درخواست میں سول انجینیرنگ کالج رڑکی اور میڈیکل کالج آگرہ کی بھی مثال دی گئی تھی جہاں شاخ اردو کے طالب علم اردو کے ذریعہ اور انگریزی سے اردو ترجموں کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں[1] یہ طالب علم انگریزی کے طالب علموں سے کبھی پیچھے نہیں رہے بلکہ بعض اوقات اِن پر سبقت لے جاتے تھے۔

مقصد یہ تھا کہ یا تو اِس غرض کے لیے یونی ورسٹی قائم کی جائے جس میں وہ تمام علوم و فنون جو یونی ورسٹی میں پڑھاتے جاتے ہیں اِس درس گاہ میں دیسی زبان کے ذریعے سے پڑھائے جائیں۔ ویسے ہی امتحان ہوں جیسے کلکتہ یونی ورسٹی میں ہوتے ہیں اور اس کے طالب علموں کو ویسی ہی سندیں دی جائیں جو کلکتہ یونی ورسٹی کے کام یاب طلبہ کو دی جاتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایسی کتابیں دیسی زبان میں موجود نہیں تھیں لیکن جو کتابیں یونی ورسٹی کے نصاب میں تھیں ان کے ترجمے تیار کیے جا سکتے تھے لیکن اِس تجویز کو نامنظور کر دیا گیا۔

سرسید نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور اِس منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے ایک بار پھر کوشش کی۔ "کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان" کی ایک منتخب کمیٹی میں تعلیم کے متعلق ایک بڑی تجویز پیش کی۔ اس میں "مدرسۃ العلوم" (محمڈن اینگلو اورینٹیل کالج) کے قائم کرنے

---

[1] دیکھیے باب اول، (دلی کالج)، مقالہ ہذا۔

کا بھی ذکر تھا۔

کمیٹی نے تفصیل پیش کی کہ یہ تین مدرسوں پر مشتمل ہوگا۔ اول انگریزی، دوم اردو، سوم عربی فارسی۔ اردو کے متعلق یہ تجویز پیش کی:

"اِس میں تمام علوم وفنون بزبان اردو پڑھائے جائیں گے اور جو کچھ تعلیم اِس میں ہوگی وہ سب اُردو میں ہوگی، البتہ ہر طالب علم کو تین زبانوں میں سے ایک زبان بطور سیکنڈ لینگویج کے اختیار کرنی ہوگی۔ انگریزی، فارسی، عربی۔ میں امید کرتا ہوں کہ جو لڑکا ہیں بارہ برس کی عمر میں اِس مدرسے میں داخل ہوگا وہ ضرور اٹھارہ برس کی عمر تک تمام سائنس یعنی علوم کو اردو زبان میں اِس قدر تحصیل کرلے گا جس قدر کہ درجہ بی اے کے لیے مقرر ہیں..... یہ مدرسہ جو اس قسم کا تجویز کیا گیا ہے جس میں تمام علوم اردو زبان میں پڑھاتے جائیں اس کا سبب یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی مدرسوں میں کافی لیاقت لڑکوں کو نہیں آتی۔ ایک مشکل اور غیر زبان کو سیکھنا اور دوسری مشکل غیر زبان میں علوم کو سیکھنا ہوتا ہے پس اِس تدبیر سے ہم نے ان کی ایک مشکل کو موقوف کر دیا ہے تاکہ وہ بہ سبب اپنی زبان سے علوم وفنون سے نہایت جلد بخوبی واقف ہوجائیں اور بعد اس کے دوسری زبان کے لٹریچر میں محنت کرکے جہاں تک ہوسکے ترقی کریں۔ اِس تدبیر سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بہت کم طالب علم علوم وفنون سے گو کہ وہ اردو زبان ہی میں کیوں نہ ہوں ناواقف رہیں گے اور بہ نسبت حال کے لٹریچر پر محنت کرنے کی

زیادہ مہلت ملے گی اور ان کو اِس زبان کی لٹریچر بہ نسبت حال کے بہت زیادہ آجائے گی۔"

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر یہ تجویز نظر انداز کر دی گئی اور اِس کے تجربے کا موقع نہ ملا۔"

سید محمود کی مجوزہ ورناکلر یونی ورسٹی :

یونی ورسٹی کی اِس اسکیم میں مسلمانوں کی تعلیم کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ :

(الف) کالج، (ب) مدارس، (ج) مکاتب، اور (د) مکاتب حفظ قرآن۔

(الف) کالج :

کالج کی تجویز انھوں نے اِن امرا اور مقتدر لوگوں کے لیے رکھی تھی جو گورنمنٹ سے اعلیٰ عہدوں کی تمنا رکھتے تھے۔ اِسی وجہ سے اِس کالج کو کیمبرج اور آکسفورڈ کے نمونے پر بنانا اور لڑکوں کو عمدہ بورڈ ھاؤسوں میں رکھنا تجویز کیا گیا تھا۔ جن کا یکساں لباس ہو اور اِن کی عمدہ تربیت ہو۔ اِسی درس گاہ کے ساتھ عربی و فارسی کا مدرسہ اور نیز اردو کا مدرسہ رکھنا تجویز کیا گیا۔

(ب) درجہ دوم :

درجہ دوم کے مدارس کی نسبت یہ تجویز کیا گیا تھا کہ وہ ہر شہر و قصبے اور ضلع میں قائم کیے جائیں جن میں اردو ذریعہ تعلیم ہو اور انگریزی بطور دوسری زبان کے پڑھائی جائے یہ مدرسے اِس غرض سے ہوں کہ مدرسۃ العلوم کے لیے لڑکے تیار کریں۔

(ج) درجہ سوم:

درجہ سوم کے مدرسے ہر گاؤں اور ہر صوبے میں قائم کرنے قرار پائے جن میں قرآن شریف اور حساب کی تعلیم دی جائے، اور کسی قدر فارسی اور انگریزی بطور دیگر زبان کے ہو۔

(د) درجہ چہارم:

درجہ چہارم کے مکتب بالکل علاحدہ ہوں جن میں قرآن شریف حفظ کرائے جائیں۔

۱۸۷۳ء میں سید محمود نے مندرجہ بالا اسکیم میں کچھ ترمیمات کیں جن کا منشاء یہ تھا کہ یہ درس گاہ بجائے کالج کے یونی ورسٹی ہو۔ اس لیے مدرستہ العلوم کی جگہ یونی ورسٹی قائم کی جائے اور اس یونی ورسٹی میں سوائے نگرانی کے حکومت کسی قسم کی مداخلت نہ کرے۔

پہلے جب گورنمنٹ میں مدرستہ العلوم کی اسکیم بھیجی گئی تب وہاں سے سرکاری امداد کی امید دلائی گئی تھی۔ مگر یونی ورسٹی کا منصوبہ قائم ہو جانے سے گورنمنٹ نے سرکاری امداد دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر مجبور ہو کر سرسید اور ان کی کمیٹی نے یونی ورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ ترک کر دیا اور ایسے معمولی کالج کے لیے امداد لینے پر مجبور ہو گئی جو کلکتہ یونی ورسٹی کے امتحانات کی تیاری کرے اور اس طرح کمیٹی کو پوری توجہ علی گڈھ کالج پر مبذول کرنی پڑی اور بقیہ منصوبے جو تمام ملک میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام پر مشتمل تھے وہ لاعمل رہ گئے۔

باب سوم

انجمن پنجاب کا قیام

مقاصد اور تاریخ

باب سوم

انجمن پنجاب کا قیام، مقاصد اور تاریخ

۲۱ جنوری، ۱۸۶۵ء [۱] میں سکشا سبھا کے مکان میں ایک جلسہ منعقد ہوا، اس جلسہ میں لاہور کے علم دوست حضرات اور روسا شریک ہوتے اور "انجمن پنجاب" کا قیام عمل میں آیا۔ یہ انجمن حکومت وقت کے اشارے پر قائم ہوئی تھی۔

---

[۱] درحقیقت انجمن پنجاب کا قیام ۲۱ جنوری، ۱۸۶۵ء میں عمل میں آیا۔ آغا باقر مرحوم کے پاس رسالہ انجمن پنجاب کے جو فائل موجود تھے اس میں "رپورٹ سہ سالہ متعلق انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب بابت ۱۸۶۶ء، ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء" میری نظر سے گزری جو مطبع گنیش پرکاش لاہور بہ اہتمام منشی ہر سکھ رائے وگوبند سہائے میں طبع ہوئی ہے اس میں یہی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ انجمن پنجاب کے اپنے رسالے "رسالہ انجمن پنجاب" کے پہلے نمبر میں جس میں فروری اور مارچ کی کارروائی درج ہے یہی تاریخ درج ہے۔ اس کے بعد ۲۱ جنوری، ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کے انعقاد میں کوئی شک باقی نہیں رہتا یہ رسالہ مطبع کوہ نور پریس لاہور باہتمام سورج بھان شائع ہوا

کیوں کہ کرنل ھالرائیڈ جو اس وقت پنجاب کے سررشتۂ تعلیم کے منتظم اعلیٰ تھے انھوں نے ڈاکٹر لائٹنر کو جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے اِس انجمن کے قائم کرنے کی ہدایت دی تھی۔

انجمن کا پورا نام "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" رکھا گیا جو بعد میں صرف انجمن پنجاب کے نام سے مشہور ہوئی۔ انگریزی میں اِس کا نام

"Society for the diffarsion

of useful knowledge in the Punjab"

طے پایا۔ یہ جلسہ پنڈت من پھول اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ انھوں نے حاضرینِ جلسہ کو ان الفاظ میں مخاطب کیا:

اے صاحبان! ہم کئی برس سے اِس فکر میں تھے کہ مثل کلکتہ و لکھنؤ اس شہر میں بھی جو دارالسلطنت پنجاب ہے ایک مجلسِ رئیسان نامی عالم و فاضل شائق علم و ہُنر کے ایسی مقرر کی جائے کہ جس میں تنقیح مطالب مفیدہ پنجاب و ترقی علم و ہُنر کے تحریراً و نیز تقریراً عمل میں آکر بذریعہ چھاپہ خانہ منتشر ہوا کرے مگر یہ مطلب ہمارا بدون ہوئے ایک زبردست عالم و فاضل وحید عصر کے اب تک حاصل نہیں ہو سکا تھا۔"

اس تقریر کے ذریعہ پنڈت من پھول نے ڈاکٹر ڈبلیو۔ جی۔ لائٹنر کا تعارف کرایا۔ منشی ہرسکھ رائے مہتمم "کوہ نور" اخبار شعبۂ فارسی کے سکریٹری اور بابو نوبین چندر رائے انگریزی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر لائٹنر صدر چُنے گئے۔ اِس انجمن کے بہت سے حضرات ممبر بنائے گئے جن میں سے خاص خاص نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ڈاکٹر ڈبلیو۔ جی۔ لائٹنر، پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور۔

۲۔ دیوان بیج ناتھ ای۔ اے۔ سی، لاہور۔

۳۔ فقیر سید شمس الدین صاحب، آنریری مجسٹریٹ، لاہور۔

۴۔ سردار بھگوان سنگھ جاگیردار، امرت سر۔

۵۔ شیخ فیروز الدین رئیس، لاہور۔

۶۔ مولوی کریم الدین، ڈپٹی انسپکٹر مدارس، لاہور۔

۷۔ مولوی محمد حسین، نائب سررشتہ دار، ڈائریکٹری پنجاب۔

۸۔ مولوی نیاز حسین مدرس مدرسہ تعلیم معلمین۔

۹۔ مولوی علمدار حسین مدرس گورنمنٹ کالج، لاہور۔

اپنی افتتاحی تقریر میں پنڈت من پھول نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ انجمن کے زیر نگرانی ایک عمدہ قسم کا کتب خانہ کھولا جائے جس میں سب زبانوں کی علمی کتابیں اور اخبارات و رسائل مہیا کیے جائیں۔ چوں کہ اس وقت انجمن کے پاس روپیہ موجود نہ تھا لہٰذا ممبروں سے عارتیاً کتابیں لے کر کتب خانے میں رکھی جائیں لہٰذا ایک ہفتے کے اندر کتب خانے میں پنڈت من پھول، منشی ہرسکھ رائے، پنڈت رادھا کشن، ڈاکٹر لائٹنر، فقیر شمس الدین خان، فقیر ظہور الدین خان، اور لاہور کرانیکل کی طرف سے ایک ہزار اٹھاسی کتابیں جمع ہو گئیں۔

انجمن کے اغراض و مقاصد اور کمیٹیاں:

۱۔ قدیم مشرقی علوم کا احیاء، اور لسانیات، بشریات، تاریخ اور ہندوستان اور ہمسایہ ملکوں کے آثار قدیمہ کے بارے میں تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی۔

۲۔ دیسی زبانوں کے ذریعہ عوام میں تعلیم کا فروغ۔

۳۔ صنعت اور تجارت کی ترقی۔

۴۔ معاشرتی۔ ادبی۔ سائنسی اور عام دل چسپی کے سیاسی مسائل پر تبادلہ خیالات۔ حکومت کے تعمیری اقدامات کو مقبول بنانا، ملک میں وفاداری اور مشترک ریاست کی شہریت کے احساس کو فروغ دینا اور عوام الناس کی خواہشات اور مطالبات

٦١

کے مطابق حکومت کو تجاویز پیش کرنا۔

۵۔ مفادِ عامہ کے تمام اقدامات میں صوبے کے تعلیم یافتہ اور بااثر طبقوں کو کے افسروں سے قریب تر لانا۔

اس کے علاوہ دیگر اہم معاملات بھی انجمن کے لائحہ عمل میں شامل ہوتے مثلاً ایک نمائندہ کونسل کا قیام، دیسی سول سروس کی تشکیل اور اس کے امتحانات کے طریقہ کار میں ترمیمات۔ ایک تعلیمی کانگریس کا قیام، صحت و صفائی سے متعلقہ امور، مختلف ادبی، سماجی، اور سیاسی موضوعات پر مضامین شائع کرنا، زراعت کے متعلقہ مسائل، ہندوستان میں سنسکرت اور عربی مخطوطات کی حرفی نقل اور ان پر باقاعدہ تحقیقی کام کے بارے میں حکومت کو تجاویز پیش کرنا اور لاہور میں صنعتی آرٹ کے اسکول کی بنیاد رکھنے کی تحریک وغیرہ

رکنیت کے لیے طے کیا گیا کہ یورپی یا دیسی ہر شخص انجمن کا رکن بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ تعلیمی قابلیت رکھتا ہو اور جس کی سفارش انجمن کے دو ممبر کر دیں۔ وہ شخص سرکاری عہدہ دار ہو اور انجمن کی مالی اعانت کر سکتا ہو لیکن یہ امر لازمی ہوگا کہ رکنیت کا یہ امیدوار انجمن کے کسی عام اجلاس میں جو ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں ہوگا نام کی تجویز اور انتخاب کے مراحل طے کرے۔ ہر رکن کو بارہ روپے سالانہ چندہ دینا ہوگا۔

ادبی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینے والا اعزازی رکن بن سکتا ہے۔ انجمن کا فیلو بننے کے لیے انجمن کے جریدے کے لیے مضامین لکھنا ضروری قرار پایا۔ مکتوب نگار ارکان کے لیے فیصلہ کیا گیا کہ بیرون ملک مفید خط و کتابت کرنے والا اور انجمن کی شاخیں قائم کرنے میں اس نے اہم کردار ادا کرتے والا یہ اعزاز پا سکتا ہے۔

اعزازی نائب سرپرست کے لیے یہ تجویز ہوئی کہ کوئی دیسی سرکردہ افسر جو انجمن کے مقاصد میں ترقی کا باعث ہو وہ اعزازی نائب سرپرست بننے

کا اہل ہے۔ ایک سو بیس روپے سالانہ ادا کرنے والا دائمی رکن بن سکتا ہے۔

ہر رکن کو یہ حق ہوگا کہ انجمن کے پیش نظر عوامی اہمیت کے مسئلے کے متعلق مشورہ دے اور ووٹ دینے کا حق بھی ہوگا اور عام اجلاسوں میں نوواردوں کو متعارف کرا سکتا ہے۔ اِسے انجمن کے کتب خانے سے استفادہ حاصل کرنے کا حق بھی حاصل ہوگا۔

صدر اور خاص طور پر منتخب کئے ہوئے نائب صدروں اور سکریٹریوں میں سے دو افراد مل کر انجمن کی انتظامیہ کی تشکیل کریں گے۔ مالیاتی کمیٹی بھی اسی انتظامیہ کے تحت ہوگی۔ انجمن کے مالیاتی سکریٹری اور جنرل سکریٹریوں کے دستخط کے بغیر کوئی رقم بذریعہ چیک نہیں دی جا سکے گی۔ ہر سال انجمن کے حساب کی جانچ پڑتال کی جاتے گی۔

اخبار کمیٹی انجمن کے جریدوں کے بارے میں ادبی سکریٹریوں کو اپنی تجاویز پیش کرے گی جس پر عام اجلاس میں غور ہوگا۔ رسالہ کی مالی حالت، آمدنی اور اخراجات کی دیکھ بھال اِس کے ذمہ ہوگی۔

ادبی اور سائنسی کمیٹی کا یہ کام ہوگا کہ وہ تازہ ادبیات اور انجمن کو موصول ہونے والی تمام کتابوں کے بارے میں عام اجلاس میں رپورٹ پیش کرے گی۔ یہ کمیٹی دیسی زبانوں میں مفید مطبوعات کی اشاعت کی نگرانی کرے گی جو عام طبقوں میں تعلیم عام کرنے کی غرض سے شائع ہوں گی۔

صنعتی سوسائٹی تمام صوبے کے دست کاروں اور فنی کام کرنے والوں کو صنعت اور صنعتی آرٹ کے موضوعات پر معلومات بہم پہنچائے گی۔

مفت پبلک لائبریری قائم کی جائے گی جہاں ہر خاص و عام کو اِس سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

جلسہ نمبر ۲، ۲۷ جنوری ۱۸۶۵ء یوم جمعہ (جلسۂ خاص):

اِس جلسے میں کتب خانے سے متعلق تجاویز پیش کی گئیں کہ جو کتابیں عاریتاً بھیجی جاتی ہیں وہ واپس کی جائیں اور جو کتابیں عطیہ میں ملی ہیں اُن کو شکریے کا خط لکھا جائے۔ کتابیں حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی جائیں اور کتابوں کی ایک فہرست چھاپ کر ممبروں میں تقسیم کی جائے۔

اِس جلسے میں پنڈت من بھول کی سفارش سے ۱۳ مجسٹریٹوں کا اضافہ ہوا

جلسہ نمبر ۳، مورخہ ۱۱ فروری ۱۸۶۵ء بروز ہفتہ جلسہ خاص:

اس جلسے میں یہ طے کیا گیا کہ جو شخص جلسے میں آنا چاہے اسے عام اجازت ہے ڈاکٹر لائٹنر نے صحت و تندرستی کے متعلق ایک مضمون انگریزی میں پڑھا جس کا ترجمہ سکریٹری[1] نے ہندی میں سنایا۔ مولوی محمد حسین آزاد نے ممبر انجمن بابو شیاما چرن، ہیڈ کلرک محکمۂ تعلیم کا مضمون پڑھا جو حکماً "رواج دینے اور سکھلانے اخلاق" پر لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے کہا کہ حکومت کی طرف سے اِس سلسلے میں مالی امداد ناممکن ہے یہ کام سوسائٹی کے ممبروں کو تشہیر و تبلیغ سے انجام دینا چاہیئے۔ اکثر ممبروں کی بھی یہی رائے تھی۔ بابو شیاما چرن نے زور دیا کہ ایسا قانون جاری ہونا چاہیئے جو والدین کو مجبور کرے کہ اپنی اولاد کی تربیت کا خاص طور سے خیال کریں۔ اِس مضمون پر کافی دیر بحث ہوتی رہی۔

دوسرا مضمون بابو چندر ناتھ کیوائیڑ کا تھا جس کا عنوان "اہل ہند اور عرب نے کس کس علم میں ترقی کی اور تنزل کیوں کر ہوا اور اب ترقی کی امید کیوں کر ہو سکتی ہے۔" اِس مضمون کو مولوی محمد حسین آزاد نے پڑھ

---

[1] یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بابو نوبین چندر رائے نے ترجمہ پڑھ کر سنایا یا ہر سکھ رائے نے (صفیہ)

کر سُنایا۔ یہ علمی مضمون رسالہ انجمن پنجاب میں شائع کیا گیا۔[۵]

اِس کے بعد تیسرا مضمون مولوی عزیز الدین نے پیش کیا ان کی رائے تھی لاہور میں جگہ جگہ طوائفیں آباد ہیں انھیں ایک چکلہ میں آباد کیا جائے اور رات کو اِس کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ ان کی وجہ سے اکثر لوگ بدچلن ہو جاتے ہیں اور پردہ نشین عورتیں اِن کی آرائش دیکھ کر بُرے کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں نیز طوائفوں کا بھی اِس میں نقصان ہے۔ انھوں نے اس معاملے کو مقدمہ کی صورت میں پیش کیا جس میں عقل کو مدعی بنایا اور طوائفوں کے خلاف ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر لائٹنر نے تجویز پیش کی کہ تمام طوائفوں کا ڈاکٹری معائنہ کروایا جائے تاکہ معلوم ہو جائے کوئی طوائف خوف ناک بیماری میں تو مبتلا نہیں ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ چھاؤنی میں طوائفوں کے لیے یہی حکم نافذ ہے لیکن شہر کی طوائفیں اس قانون سے بری ہیں۔ بابو نوبین چندر نے کہا کہ ”کلکتے میں ان دنوں اِس قسم کا ایک مقدمہ چل رہا ہے جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو یہ معاملہ ملتوی رکھا جائے۔“ پنڈت موتی لال نے کہا کہ ”طوائفوں کو شہر سے بے دخل کرنے میں نقصان زیادہ ہے اور فائدہ کم شہر میں بھلے مانس طوائفوں کے گھروں میں جاتے ہوئے شرماتے ہیں۔ اگر چکلہ شہر سے باہر بنا دیا جائے گا۔ تو پھر ہر شخص بلا لحاظ و شرم ان کے ہاں جا سکے گا۔ اس کے علاوہ چوری کی وارداتیں بھی بڑھ جائیں گی۔ اکثر شہر میں بدکار لوگ ان کے ہاں جاتے ہیں اور پھر ان کو جان سے مار کر ان کا مال اسباب لے جاتے ہیں۔“ اس مقدمے میں بڑی بحث و تمحیص ہوئی اور آخرکار یہ معاملہ ملتوی ہو گیا۔

---

[۵] سورج بھان (مہتمم)، ”انجمن پنجاب“ (رسالہ)، لاہور: مطبع کوہ نور ماہان فروری و مارچ ۱۸۶۵ء، شمارہ اول۔

اسی نشست میں مولوی محمد حسین نے بھی ایک مضمون پڑھا جس میں کہا گیا تھا کہ مختلف پیشوں میں لوگ اپنا کام چھوڑ کر نوکری پیشہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے نوکری پیشہ لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور اس طرح مختلف پیشوں میں کارکن افراد کی کمی ہو رہی ہے۔ بہتر ہے کہ جو لوگ پڑھ لکھ جائیں وہ اپنے پیشوں کو ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوں۔ اگر کسی پیشہ میں لوگ زیادہ ہو جائیں گے تو ان میں مفلسی پیدا ہو جائے گی۔ یہ تجویز پسند کی گئی۔ کاریگروں کی ترقی کے ضمن میں تجویز ہوا کہ اگر کپڑا بنانے کی مشینیں اس ملک میں رائج ہو جائیں تو نہایت فائدہ ہوگا آخر میں فیصلہ ہوا کہ اس پر خرچ بہت آئے گا اور اس وقت حکومت کی طرف سے امداد کی امید کم ہے۔

جلسہ نمبر ۴، مورخہ ۱۷ فروری ۱۸۶۵ء بروز جمعہ (جلسہ خاص):

اس جلسے میں طے کیا گیا کہ ۲۴ فروری کے جلسے میں ڈاکٹر نیل صاحب بھی شریک ہوں۔ یہ جلسہ عام ہوگا اس جلسہ میں "صحت" پر مضمون پڑھا جائے۔ بابو نوبین چندر "فائدہ اجرائے علم ہندی ملک پنجاب میں" بیان کریں۔ ہندی کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں یہ پہلا مضمون ہوگا اور مولوی محمد حسین "فراخی شہر و اصلاح مکانات" وغیرہ پیش کریں۔

جلسہ نمبر ۵، مورخہ ۲۴ فروری ۱۸۶۵ء بروز جمعہ (جلسہ عام):

اس جلسے میں ایک خط کے علاوہ پانچ مضامین پڑھ کر سنائے گئے۔ اس جلسے میں دیوان بیج ناتھ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور، دیوان رتن چند اور سید شمس الدین آنریری مجسٹریٹ نے بھی شرکت کی۔ پہلے جلسے کی روداد سنانے کے بعد سکریٹری نے ڈپٹی ہادی حسین خان اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر گجرات کا ایک خط پڑھ کر سنایا اس میں لکھا تھا کہ۔ اردو کو بہ تخفیف الفاظ عربی و فارسی سہل بنایا جائے۔ سب ممبروں نے اس تجویز کو پسند کیا۔

اس کے بعد بابو نوبین چندر نے اپنے مضمون میں کہا کہ ہندی کو مثل اردو کے رواج دینا چاہیے، جس طرح زبان اردو میں عربی و فارسی الفاظ بقدر ضرورت استعمال کیے جاتے ہیں اسی طرح ہندی میں سنسکرت کے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں[1]

---

[1] اردو کے مقابلے میں ہندی کو رائج کرنے کے سلسلے ہیں۔ یہ پتا نہیں چلتا کہ اس تجویز کو پسند کیا گیا یا نہیں (مقالہ نگار)

اس کے بعد مولوی محمد حسین نے اپنا مضمون پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اہل ہند کو اپنے سود و بہبود میں آپ کوشش کرنی چاہیئے اور ہمیں مشینیں منگوانی چاہیئں تاکہ صنعت و تجارت اور روزگار میں ترقی ہو۔ یہ مضمون پسند کیا گیا۔

ڈاکٹر لائٹنر نے قواعد صحت و تدریسی پر انگریزی میں مضمون پڑھا۔ یہ مضمون ڈاکٹر اسکروِن، پرنسپل میڈیکل کالج لاہور نے بھیجا تھا۔ اسی وقت اس کا ترجمہ سکریٹری نے سنایا اس مضمون کو بھی سامعین نے پسند کیا۔

مولوی علمدار حسین پروفیسر عربی کالج لاہور نے ایک مضمون پڑھا کہ حقوق رشتہ داری کی پرداخت کی جائے اور طلبار کے لئے ایک بورڈنگ ہاؤس قائم کیا جائے۔

اسی جلسے میں ڈاکٹر لائٹنر نے اعلان کیا کہ یونیورسٹی کالج زبان ہائے مشرقی کے نام سے قائم کیا جائے اور ان زبانوں میں کتابیں لکھی جائیں اور ترجمہ کی جائیں۔ ان ہی زبانوں کے ذریعہ تعلیم دی جائے تاکہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور علوم زندہ رہیں اور تجویز پیش کی کہ ہر سال ان زبانوں میں امتحان ہوا کریں اور سندیں دی جائیں۔ اعلیٰ قابلیت رکھنے والوں کو دو سو روپے انعام دینے کا اعلان ڈاکٹر لائٹنر نے خود اپنی جیب خاص سے کیا اور کہا کہ جو لوگ انعامات دینے پر تیار ہوں وہ بھی دے سکتے ہیں۔

۳ مارچ ۱۸۶۵ء بروز جمعہ (جلسہ خاص):

اس جلسے میں عربی، فارسی، سنسکرت، اردو اور ہندی زبانوں کے لئے کمیٹیاں بنائی گئیں۔ مندرجہ ذیل اصحاب کمیٹیوں کے ممبر بنے اور سب کام مفت انجام دینا منظور کیا۔

کمیٹی زبان عربی:

۱۔ ڈاکٹر لائٹنر	سپرنٹنڈنٹ
۲۔ فقیر سید شمس الدین خان	سپرنٹنڈنٹ
۳۔ فقیر سید جمال الدین خان	ممبر
۴۔ شیخ فیروز الدین خان	ممبر
۵۔ مصر رام داس	ممبر

۶۔ مولوی کریم الدین	ممبر
۷۔ مولوی محمد حسین	ممبر
۸۔ مولوی طالب علی	ممبر
۹۔ سید حسن شاہ	ممبر
۱۰۔ مولوی علمدار حسین	ممبر

کمیٹی زبان فارسی:

۱۔ نواب نوازش علی خان	سپرنٹنڈنٹ
۲۔ نواب نیاز علی خان	سپرنٹنڈنٹ
۳۔ نواب عبد المجید خان	ممبر
۴۔ پنڈت من پھول	ممبر
۵۔ سید رضا شاہ	ممبر
۶۔ شیخ فیروز الدین	ممبر
۷۔ فقیر سید شمس الدین خان	ممبر
۸۔ رائے مول سنگھ	ممبر
۹۔ محمد برکت علی خان، تحصیلدار	ممبر
۱۰۔ ملک ہیرا لعل	ممبر

کمیٹی زبان سنسکرت:

۱۔ پنڈت رادھا کشن	سپرنٹنڈنٹ
۲۔ پنڈت روپ چند	ممبر
۳۔ پنڈت دیا رام	ممبر
۴۔ پنڈت رام دت	ممبر
۵۔ پنڈت بھگوان داس	ممبر
۶۔ بابو نوبین چندر رائے	ممبر
۷۔ بادشیا ماچرن	ممبر

کمیٹی زبان ہندی :

۱۔ بابو نوبین چندر رائے	سپرنٹنڈنٹ
۲۔ بابو چندر ناتھ	ممبر
۳۔ لالہ بہاری لعل	ممبر
۴۔ پنڈت بسنت رام	ممبر
۵۔ پنڈت جمنا پرشاد	سکریٹری

کمیٹی زبان اردو :

۱۔ دیوان بیج ناتھ	سپرنٹنڈنٹ
۲۔ پنڈت من پھول	ممبر
۳۔ منشی جیسی رام	ممبر
۴۔ منشی ہر سکھ رائے	ممبر
۵۔ رائے مول سنگھ	ممبر
۶۔ فقیر سید شمس الدین خان	ممبر
۷۔ ڈاکٹر رحیم خان	ممبر
۸۔ محمد برکت علی خان، تحصیلدار	ممبر
۹۔ مولوی علمدار حسین	ممبر
۱۰۔ پنڈت سورج بھان و جمنا پرشاد	سکریٹری

۹ مارچ ۱۸۶۵ء بروز جمعرات (اجلاس عام) :

(۱) جلسے کی باقاعدہ کارروائی کے بعد سکریٹری نے ڈپٹی ہادی حسن خان اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، گجرات کا ایک خط پیش کیا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ "حروف لنڈا

---

(۱) ہادی حسن خان نے اپنے مضمون میں اردو کو رواج دینے کے لئے آسانیاں بہم پہنچانے پر زور دیا۔ دتاسی "خطبات گارسان دتاسی" ص ۵۲۹ پر ان کے اس خیال کی بڑے زور تائید کرتا

(باقی صفحہ ۱۱۵ پر ملاحظہ کیجیے)

میں اگر "اوڑا" ایڑی وغیرہ سرادر لگائے جائیں تو بہت سہولت ہو" مباحثے کے بعد فیصلہ ہوا کہ اس کے متعلق تاجر پیشہ حضرات سے معلومات اور ان کی رائیں لی جائیں۔ اسی جلسے میں وٹال کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر منشی گوپال داس اور جے پور کے حکیم محمد سلیم خان کو انجمن کا ممبر بنایا گیا۔

اعلیٰ قابلیت کے طلباء کو امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے پر ڈاکٹر لائٹنر نے دو بیس روپے انعام دیئے تھے۔ آج کے جلسے میں لاہور کے تحصیلدار مولوی برکت علی نے پندرہ روپے، بابو نوبین چندر سکریٹری نے دس اور پنڈت بسنت رام نے پانچ روپے انعام کے لئے جمع کرائے۔

جلسے کے آخر میں ڈاکٹر لائٹنر نے کہا کہ اگر ایک مدرسہ فنون صنائع دستکاری اور مشینوں کا کام سکھانے کے لئے سرکار کی طرف سے جاری کیا جائے تو کیا اس دیس کے آدمی فیس ادا کر کے شوق سے اس میں داخلہ لیں گے؟ شرکائے جلسہ نے اس تجویز کی پرزور حمایت کی کہ اگر انگلستان کی طرح اس ملک میں بھی کارخانے لگائے جائیں تو اہل ہند کو بہت فائدہ ہوگا۔

۷ ار مارچ ۱۹۶۵ء بروز جمعہ:

اس جلسے میں کپتان فلر ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب بھی شریک ہوئے حکومت کی طرف سے ایک سو تینتیس (۱۳۳) کتابیں انجمن کے کتب خانے کو پیش کیں۔ جن کا تحریری شکریہ ادا کیا گیا۔ کپتان فلر نے کتب خانے سے خاص دلچسپی کا اظہار کیا کیوں کہ اب اس کتب خانے

(صفحہ ۱۱۴ کا بقیہ فٹ نوٹ)

ہے۔ نوبین چندر کی مخالفت میں ہادی حسین کی تجویز کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ "تعجب اس بات پر ہے کہ اُردو کی تصانیف بھی دیوناگری رسم الخط میں چھاپی جا رہی ہیں چناں چہ دیوان نظیر اکبر آبادی اور میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اور دوسری تصانیف جن کی زبان دہلی کی خالص ٹکسالی زبان دیوناگری رسم الخط میں طبع کی جا رہی ہیں۔ (مقالہ نگار)

میں نئی تصنیف شدہ کتابیں بھی بھیجی جانے لگی تھیں۔ اس ضمن میں کپتان فلر نے تاریخ کی ایک کتاب جس کا نام (۱) "واقعات ہند" تھا پیش کی اور درخواست کی کہ اورنگ زیب کی عادات وخصائل کا جائزہ لیا جائے۔

پھر ڈاکٹر لائٹنر نے کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ اصل علم وہنر کی ملکی پیداوار پر ایک دلچسپ مضمون لکھیں تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو۔ ایسے مضامین پہلے کارکن کمیٹی کو پیش کئے جائیں اگر یہ مضامین معیار پر پورے اتریں تو انھیں جلسۂ عام میں سنایا جائے۔ اس تجویز کو پسند کیا گیا۔

اس موقع پر سکریٹری نے کہا کہ جو مضامین اور تجاویز انجمن میں پیش ہوتی ہیں انہیں چھاپے بغیر فائدہ کلی حاصل نہیں ہوتا میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر چھاپہ خانہ قائم کیا جائے تو اس کا خرچ لاگت سے زیادہ ممبروں سے نہیں لیا جائے گا۔ صدر کے علاوہ تمام شرکاء نے اس تجویز کو پسند کیا اور چھاپہ خانے کا تخمینہ پیش کرنے کی سفارش کی۔

ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن کی رقومات بنک میں رکھنے کی تجویز پیش کی اور اسے منظور کیا گیا

(۲) اس کے بعد رسالے کے چندے کا سوال پیدا ہوا۔ فیصلہ کیا گیا کہ آٹھ آنے ماہوار بہ استثنا کالج کے طلباء کے لئے جائیں اور جو صاحب اس سے زیادہ دینا چاہیں یا یکمشت دیں ان کی مہربانی ہوگی۔

دہلی کی مشہور ومعروف شخصیت نواب مرزا شہاب الدین خان جو لوہارو خاندان سے تعلق رکھتے تھے انجمن کے ممبر بن چکے تھے انہوں نے انجمن کے کتب خانے کے لئے پچاس کتابیں دیں۔

سکریٹری نے کہا کہ انجمن دن بدن ترقی کر رہی ہے اور رونق بڑھتی جاتی ہے کتب خانہ

---

(۱) انجمن کو خاص طور پر اورنگ زیب کی عادات وخصائل کا جائزہ لینے کے لئے آمادہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انگریز جانتے تھے کہ اورنگ زیب کی مذہب پرستی سے ہندو ناخوش تھے ایسے موقعہ پر ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کی یہ دوسری کوشش تھی (مقالہ نگار)

(۲) "رسالہ انجمن پنجاب کا پہلا شمارہ جس میں جنوری، فروری اور مارچ کی روئداد چھپی، مارچ ۱۸۶۵ء میں مطبع کوہ نور لاہور سے باہتمام سورج بھان شائع ہوا۔

انجمن بھی آراستہ ہوتا جاتا ہے کیا خوب ہو کہ اس میں اخبارات اور کتب ماہواری (ماہوار رسالے) وغیرہ بطور امداد بلا قیمت بھیجنے کے لئے ہندوستان کے تمام چھاپہ خانوں کے مالکوں اور مہتمموں سے درخواست کی جائے۔ تجویز ہوا کہ انجمن کے فوائد اور کوائف لکھ کر اخبارات کو بھیجے جائیں اور اس کے ضمیمے میں اخبارات سے امداد کی درخواست کی جائے۔

مولوی محمد حسین آزاد نے بتایا کہ اخبار اودھ میں مہتمم اخبار منشی نول کشور نے لکھا ہے کہ ہمیں انجمن پنجاب نے ممبر قرار دیا ہے ہم مشکور ہیں اور حتی الامکان ہم امداد و اعانت کے واسطے بخوشی تمام حاضر ہیں اور اس کے مطالب مفیدہ کو بھی ہم اپنے اخبار (اودھ) میں درج کیا کریں گے۔ نیز انھوں نے اپنے کتب خانہ لاہور کو ہدایت کی ہے کہ جو کتابیں ان کے مطبع کی انجمن کے کتب خانے میں نہ ہوں وہ انجمن کو دے دی جائیں اور اگر انجمن ڈاک کا محصول ادا کرے تو جو بھی نئی کتاب چھپے گی اس کی ایک جلد انجمن کو پیش کر دی جائے گی۔ انجمن کے ممبروں نے اس تجویز کو قبول کیا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

سکریٹری نے کتب خانہ مرتب ہو جانے کی بھی اطلاع دی جس کو لالہ دیوان چند نے بڑی محنت سے مرتب کیا تھا۔

سکریٹری نے نواب مرزا شہاب الدین احمد خان کا خط معہ پچاسی (۸۵) کتابوں کے پیش کیا۔ یہ کتابیں اردو، فارسی اور انگریزی کی تھیں جو انھوں نے انجمن کے کتب خانے کے لیے بھیجی تھیں۔ ارباب انجمن نے ان کا تحریری شکریہ ادا کرنے کی سفارش کی۔

یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ موجودہ کتب کی فہرست علم کے اعتبار سے مرتب کی جائے تاکہ شائقین یہ فہرست دیکھ کر بہ آسانی کتاب الماری سے نکال لیں۔ لالہ دیوان چند نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی اولین فرصت میں ایسی فہرست تیار کر دیں گے۔

آخر میں ڈاکٹر لائٹنر نے کہا کہ کتب خانہ مرتب ہو چکا ہے لہذا اسے ہر خاص و عام کے لئے کھول دیا جائے۔ لہذا یہ طے کیا گیا کہ ۲۰ مارچ ۱۸۶۵ء سے کتب خانہ کھول دیا جائے گا۔ اس کا اعلان اخبار کوہ نور میں کر دیا جائے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے یہ بھی کہا کہ جلسہ کا وقت پانچ بجے شام مقرر ہے۔ یورپین اسٹاف اور نوکری پیشہ افراد کو کتب خانے سے فائدہ اٹھانے کا بہت کم موقعہ ملتا ہے اس لئے وقت میں اضافہ کیا جائے۔

۱۸ر مارچ ۱۸۶۵ء بروز ہفتہ (جلسہ خاص):

اس جلسے میں ڈاکٹر لائٹنر نے السنۂ شرقی یعنی سنسکرت، عربی، فارسی، اردو اور ہندی کی جو کمیٹیاں بنائی تھیں ان کے ممبروں کو بلایا گیا اور امتحانات کے قواعد مرتب لیے گئے۔

۱۹ر مارچ ۱۸۶۵ء بروز اتوار (جلسہ خاص):

اس جلسے میں ممبران کمیٹی فارسی اور اردو تشریف لائے۔ مولوی کریم الدین انسپکٹر مدارس، لالہ پیارے لال اور رائے صاحب نے ڈائرکٹر بہادر کی کتاب "تواریخ الفنسٹن" کو معتبر مان کر اس کی روشنی میں اورنگ زیب کے سوانح پر تنقید کی۔

۲۲ر مارچ ۱۸۶۵ء بروز جمعرات (جلسہ خاص):

یہ ایک غیر معمولی اجلاس تھا اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ دہلی سے اسسٹنٹ کمشنر نے دیوان بیج ناتھ، اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور کو ایک خط لکھا تھا جس میں تحریر تھا:
"مجھے ۱۱ر مارچ کے اخبار کوہ نور سے معلوم ہوا کہ ہادی حسین، اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، گجرات نے اسسٹنٹ کمشنر، گجرات نے انجمن میں تجویز پیش کی ہے کہ زبان اردو سے جہاں تک ہو سکے عربی، فارسی الفاظ نکال دیئے جائیں اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ نواب گورنر جنرل نے مجھے ان ہی دنوں اس کام پر مامور کیا ہے کہ آئندہ کو زبان اردو میں محاورات کچہری سہل ہو جائیں اسی سلسلے میں ایک رسالہ جس کا نام "مفرعہ العملہ" ہے تالیف کیا گیا ہے۔ اس کی ایک نقل اس خط کے ساتھ بھیجی جاتی ہے تاکہ بعد ملاحظہ انجمن، رائے سے اطلاع دی جائے۔

رسالے کا دیباچہ مولوی محمد حسین نے پڑھ کر سنایا اس کے بعد ممبروں نے کئی جگہ سے اس کی عبارت سنی۔ بحث و مباحثے کے بعد طے ہوا کہ اس خط کا جواب انگریزی میں دیا جائے اور دیوان بیج ناتھ کے ذریعہ دہلی بھیجا جائے۔ رسالے سے متعلق رائے کے اختلاف اور موافقت میں دس ممبر تھے۔ مخالفین میں ایک تو دیوان بیج ناتھ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ زبان اردو میں سے مشکل الفاظ نکال دینے چاہئیں کیوں کہ کم پڑھے لوگ ان الفاظ کو نہیں سمجھ سکتے۔ دوسری دلیل یہ تھی کہ جو انگریز اردو امتحان میں شریک ہوتے ہیں وہ بھی عاجز

آجاتے ہیں۔ وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ جو الفاظ "غلط" داخل ہو گئے ہیں انھیں ترک کر دیا جائے مثلاً "عندالپسرتال" جیسے لفظ۔ نیز عربی، فارسی اور ترکی زبان کے جو غیر مانوس الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ان کے بجائے عام فہم ہندی الفاظ لے لئے جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ فصاحت اور بلاغت اور سلاست کلام یہ ہے کہ جس آدمی سے بات کی جائے وہ اسے پوری طرح سمجھ سکے۔ کمیٹی کا خیال تھا کہ اس رسالے سے اردو زبان کا درجہ کم ہو گیا ہے اور یہ طریق کار اردو زبان کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ فی الجملہ رسالہ اچھا لکھا گیا ہے لیکن انجمن اس قول کی پابند نہیں ہونا چاہتی۔ عربی اور فارسی کے الفاظ پر بلا امتیاز خارج کر دینے سے زبان اردو میں سلاست پیدا ہونے میں فرق نہیں آتا۔ ایک مرتبہ پہلے بھی انجمن اس باب میں اپنی رائے کا اظہار کر چکی ہے۔ پہلی رائے میں صاف اور شستہ عبارت کے استعمال کی سفارش کی گئی تھی بلکہ زبان کے تغیر کلی کا اشارہ نہ تھا۔ انجمن کو حیرانی ہے کہ اگر اردو زبان میں سے اجزائے عربی و فارسی خارج کر دیئے جائیں تو اردو اور ہندی میں کیا تمیز سمجھی جائے گی۔ یہ انجمن صلاح اور عمل سے اس امر کی تحریک و ترغیب میں مساعی رہے گی کہ تخیل اور عبارت میں سلاست اور آمیزش غیر ضروری کے بچانے کا لحاظ رہے مگر اس ملک کے واسطے ایک نئی زبان تجویز کرنے انجمن کو شامل کیا۔ گورنمنٹ اس بات کا لحاظ رکھتی ہے کہ سرکاری محکموں میں جو کاغذ لکھے جاتے ہیں ان کے واسطے ایک نمونہ تجویز کر دے اور گورنمنٹ حکم دے سکتی ہے کہ جو لوگ گورنمنٹ سے تعلق رکھیں اس نمونے کے مطابق عبارت لکھیں مگر کوئی نئی بات پیدا نہیں کی جاسکتی اور کیا جانا ممکن ہو بھی تو مصلحت نہیں ہے اردو ہنوز اس درجہ نشو ونما میں ہے کہ اس زبان کے مختلف اجزا میں اختلاط جاری ہے اور اس امر اختلاط کو حکماً تھام دینا اگر ممکن بھی ہو تو بھی اندیشہ ضرر سے خالی نہیں۔ اس امر سے پہلے کہ خود بحکم گورنمنٹ، خواہ جماعت علماء کی تجویز سے یہ زبان محدود کی جائے زبان مذکور ایسے حد کمال کو پہنچنی چاہیئے جس کی خوبی کو اہل زبان تسلیم کرلیں۔ یہ بات فقط اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ اچھی کتابیں اچھی اردو میں تصنیف ہو کر شائع ہوں۔ چنانچہ رسالہ "مقرعۃ العمد" بھی بعض لحاظوں سے ایسی تصنیف میں شامل ہو سکتا ہے اور عموماً تعلیم اور علم کو فروغ دیا جائے۔ بالفعل فقط اتنا ہو سکتا ہے کہ ایک لغت اردو الفاظ مترادف کا جس میں ہر لفظ کے ٹھیک معنی درج ہوں اور

ایک خلاصہ قواعد اردو کا تیار ہو کر شائع ہوں مگر عربی اور فارسی اور سنسکرت میں جو اساتذہ کی تصانیف ہیں ان کے مطالعے کے شوق کو پست کرنے کا ذرا بھی قصد نہ کرنا چاہیے کہ اب ایسی تصانیف کے مطالعے پر توجہ نہایت کم ہو گئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

۲۴ مارچ ۱۸۶۵ء بروز جمعہ (جلسہ خاص):

اب تک انجمن کی تجویزات محفوظ رکھنے کے لئے کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ آج کے جلسے میں ڈاکٹر لائٹنر نے ایک منٹ بک یعنی کتاب یادداشت میں انجمن کی کارروائی محفوظ کرنے کی ہدایت کی۔ اس جلسے میں ڈاکٹر لائٹنر نے تقریر کرنے اور سننے کی ہدایات دیں:-

۱۔ جلسہ میں سب سے پہلے سکریٹری گذشتہ تجاویز پڑھ کر سنائیں اور پریذیڈنٹ تصدیق کریں۔ اس کے لئے ایک منٹ بک (کتاب یادداشت) رکھی جائے۔

۲۔ (۱) ....

۳۔ مضامین جو جلسے میں پڑھے جائیں اس کا مسودہ ایک ہفتے قبل سکریٹری کے پاس پہنچ جائے۔

۴۔ جب مضمون پڑھا جائے تو سب لوگ چپ رہیں۔

۵۔ مضمون پڑھنے کے بعد رائے لی جائے گی۔

۶۔ جب کوئی گفتگو کرے تو درمیان میں کوئی نہ بولے۔

۷۔ پریذیڈنٹ کی مرضی سے دو اصحاب میں سے ایک مضمون پڑھے گا۔ (اگر دو اصحاب بیک وقت پڑھنا چاہیں)

۸۔ مباحثہ مختصر ہو اور تجویز لکھ کر مع نام کے پیش کی جائے اس کے علاوہ یہ تجاویز بھی منظور کی گئیں۔

۹۔ جو صاحب ممبر بننا چاہیں وہ انجمن کو درخواست دیں۔

۱۰۔ جو مضامین بھیجے جائیں ان کے لئے یہ شرائط ہوں گی۔

---

(۱) رسالہ انجمن پنجاب ماہ جنوری، فروری، مارچ کا یہ صفحہ کرم خوردہ تھا لہٰذا معلوم نہیں ہو سکا کہ دوسری تجویز کیا تھی (مقالہ نگار)

نمبر شمار، تاریخ، نام کتاب، خلاصہ مضمون، کیفیت منظوری آئندہ جلسے کے لیے

۱۱۔ صاحب مضمون خود مضمون پڑھیں ورنہ سکریٹری کو اختیار ہوگا۔ مضامین نمبر وار پیش ہوں گے۔ اگر مضمون پیش ہو رہا ہو اور وقت ختم ہو جائے تو دوسرے جلسے میں بقیہ مضمون پڑھا جائے۔

۱۲۔ ڈاکٹر لائٹنر نے ان تجاویز کے منظور ہو جانے کے بعد یہ خوشخبری بھی سنائی کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر اس سوسائٹی کے قیام کی خبر سنکر بہت خوش ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس مضمون کی مفصل کیفیت ان کی خدمت میں بھیجی جائے۔ حاضرین جلسہ اس خبر سے خوش ہوئے۔

مسٹر کوپر کمشنر لاہور نے انجمن پنجاب کو یہ پیغام بھیجا کہ اگر کوئی شخص اردو زبان میں "احسن طریقہ تعلیم ملک پنجاب" کے عنوان سے اچھا مضمون لکھے گا تو اسے پچاس روپیہ انعام دیا جائے گا۔ مسٹر کوپر نے ایک اور انعام سو روپے کا وعدہ کیا۔

پنڈت موتی لعل ممبر انجمن پنجاب نے "تواریخ الفنسٹن" سے ترجمہ "خصلت اورنگ زیب بادشاہ کا" "تاریخ واقعات ہند" کے لیے پیش کیا۔ یہ کام کارکن کمیٹی نے آخری نشست میں ان کے سپرد کیا تھا۔ بہ نظر احتیاط ڈاکٹر صاحب نے اس کا مقابلہ کیا اور انجمن نے اسے بغور سنا اور پسند کیا۔ سکریٹری سے کہا گیا کہ اسے ڈائریکٹر تعلیم کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔

ترجمہ کتاب "الفنسٹن" (ص ۵۴ ۱۱) کتاب مولوی کریم الدین کے واسطے "اورنگ زیب مزاج کا دھیما مگر سرد مہر تھا۔ بیداری اور احتیاط کے ساتھ پرفن تھا اور جوڑ توڑ میں لگا رہتا تھا۔ اس بات میں استاد تھا کہ باطن میں کچھ ہے ظاہر جیسا چاہتا تھا بنا دکھاتا تھا۔ اگرچہ تیز ہوش اور زیرک تھا۔ خیالات اس کے فراخ نہ تھے۔ ہمیشہ اس تاڑ میں رہتا تھا کہ دشمن موافق بنیں اور دوست پیدا ہوں۔ مگر ان سب باتوں کے مقابلے میں شجاع تھا۔ اور فن سپہ گری میں ہوشیار، صورت میں وجیہہ اور حضور کے ساتھ الطاف اور مہربانی سے پیش آتا تھا۔ اس کی تقریر دلاویز اور فصیح تھی۔ مگر جملہ امور میں ساختگی اس کے مزاج میں اس درجہ تک تھی کہ اس پر مذہب کے معاملات میں بھی ریاکار کا ظن کیا گیا اور اگرچہ اس نے مذہب کو اپنی تدبیر ملکی کا ایک آلہ بنایا ہوا تھا حقیقت میں وہ اپنے مذہب میں صدق بلکہ

تعصب رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ ترک دنیا کی نیت کا اظہار کیا اور اپنی تمام زندگی میں اپنے مذہب پر ایسا قائم تھا کہ بعض اوقات ایسے معاملات میں بھی کہ جو اس کی غرض کے نہایت موافق تھے۔ اپنے مذہب کے عقائد کا گرویدہ رہا۔ نماز اور مطالعہ قرانی میں مصروف رہا کرتا تھا۔ پارسایانہ بحث کرتا تھا اور پرہیزگاری کا یہاں تک دم بھرتا تھا کہ یہ بات دکھانی چاہتا تھا کہ (۱) . . . . اور کفر کو دبانے اور اپنے مذہب کو فروغ دینے میں ہمیشہ دل سے ساعی رہا۔ باوجودیکہ اس کی بلند نظری اس کے مزاج پر ایسی حاوی تھی کہ مذہب یا اخلاق کو اپنے مطلب کے استحصال کا سد راہ نہ ہونے دیتا تھا۔ فقط

عبارت واسطے ص ۱۷۵ کے

اورنگ زیب کی شجاعت اور دانائی اور لیاقت پر لحاظ کرنے سے حیرت ہوتی ہے کہ اس کی سلطنت کا انتظام اچھا کیوں نہیں ہوا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کا دل اچھا نہیں تھا اور ملازم اس کے اس کی بدگمانی کے باعث شوق سے خدمت نہ کرتے تھے۔ عہدہ داروں کی نسبت خفیہ تحقیقات رہتی تھی۔ ایک دوسرے پر نگران رکھا جاتا تھا۔ تاہم کبھی کسی بادشاہ کے ساتھ اس کے ملازموں نے اتنی دغا نہ کی۔ نہ ایسی بری طرح خدمت ادا کی۔ مذہب کے معاملے میں تنگ نظر ہونے کے سبب سے رعایا کا دل بادشاہ کی طرف سے پھر گیا تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ ہندو کو بھی اپنے مذہب کی پابندی کے سبب ضرر جان یا مال نہیں پہنچا نہ کوئی اس سبب سے قید ہوا۔ نہ کسی پر اس کے مذہب کے رسوم کی پابندی کے سبب سے اعتراض ہوتا تھا۔ مگر خود کی نسبت اورنگ زیب کا یہ قاعدہ رہا کہ اچھے عہدے ان کو نہ ملتے تھے۔ ان پر جزیہ مقرر کیا گیا تھا ان کے میلوں اور تہواروں کے باب میں ممانعت تھی اور اگر دربار میں کوئی رسم اس قسم کی جاری ہوئی کہ ہندوؤں کے مذہب کی پابندی پائی جاتی تو موقوف کر دی جاتی۔ غرض کہ معاملات مذہب میں ضد اور منافقت باہم کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ نہایت سخت بدعتوں کے باعث سے ایسی نیت مخاصمت شاذ پیدا ہوتی ہے۔ جیسے کہ اس بادشاہ کے تعصب کے سبب پیدا ہوئی۔ مگر باوجود تعصب کے مذہب کے باب میں وہم اس بادشاہ کی طبیعت میں

لے لفظ کرم خوردہ

نہ تھا۔ ہندوؤں سے تو اسے قلبی نفرت تھی۔ مگر اس نے مسجدوں وغیرہ پر روپیہ صرف نہ کیا اور فقیروں اور درویشوں کی ساختہ بزرگی سے نفرت کرتا تھا

اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے متعلق جو کچھ تاریخوں میں شامل کیا گیا اور جس انداز سے شامل کیا گیا یہ اس کی ادنیٰ مثال ہے جو اتفاقاً سامنے آگئی۔ تعجب ہے کہ مسلمان دانشوروں نے اس باب میں تحقیق و تجسس سے کام نہ لیا اور اس طرح تاریخ کی کتابوں میں اورنگ زیب قریباً ایک صدی تک برابر مطعون رہا۔

۳۱ مارچ ۱۸۶۵ء بروز جمعہ:

اس دن کے جلسے میں امتحانات کے قواعد مقرر کیے گئے اور اپریل کے بجائے اکتوبر میں امتحانات لینے کا فیصلہ کیا گیا اور قابل طلباء کو انعامات کے علاوہ سندیں دینے کا بھی فیصلہ ہوا۔

مولوی محمد حسین نے تجویز پیش کی کہ دیگر شہروں میں انجمنوں کی جو شاخیں کھولی جارہی ہیں ان سے اس طرح رابطہ پیدا کیا جائے کہ قابل غور مضامین کو انجمن کے پرچے میں شائع کیا جائے۔ منشی ہرسکھ رائے نے پریس کا تخمینہ پیش کیا اور پرچہ کی اشاعت منظور ہوئی۔ ارباب انجمن نے فیصلہ کیا کہ رسالہ انجمن کے تمام ممبروں کو مہیا کیا جائے اور ان سے تین روپے سالانہ یا آٹھ آنے پرچہ ماہانہ وصول کیا جائے۔

گرمی کی وجہ سے جلسے کے وقت میں تبدیلی کی تجویز ڈاکٹر لائٹنر نے پیش کی کہ بجائے شام کے پانچ بجے کے اب سات بجے جلسہ ہوا کرے۔ اس تجویز کو سب نے مان لیا۔

پنڈت من پھول نے ایک سماجی اصلاح کی طرف توجہ مبذول کرائی جس میں شادی بیاہ کے موقع پر بیہودہ رسوم کی طرف اشارہ کیا اور جلسہ عام کے ممبروں سے درخواست کی کہ وہ اس رسم کو ترک کریں اور دوسروں کو بھی ترک کرنے پر آمادہ کریں۔

مسٹر انجرٹن کمشنر نے انجمن کی کیفیت کے سلسلے میں استفسار کیا تھا لہٰذا ۱۴ اپریل کے جلسے میں طے کیا گیا کہ انھیں انگریزی میں انجمن کے آئین و ضوابط سے مطلع کیا جائے۔

ڈاکٹر لائٹنر نے بتایا دہلی کے اسسٹنٹ کمشنر دہلی میں بھی انجمن کی ایک شاخ کھولنی چاہتے ہیں۔ لہٰذا طے کیا گیا کہ انگریزی میں دستور العمل مرتب کرکے انھیں بھیج دیا جائے۔

اسی جلسے میں طے کیا گیا کہ انجمن کا اپنا رسالہ بھی جاری کیا جائے تاکہ جلسوں کی کارروائیاں اور مضامین طبع ہو کر عوام تک پہنچ سکیں۔ اس رسالے کا نام "رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" رکھا گیا جس کا مختصر اور دوسرا نام "رسالہ انجمن پنجاب" رکھا گیا۔ رسالہ انجمن پنجاب کی کمیٹی میں ڈاکٹر لائٹنر، پنڈت من پھول، منشی ہرسکھ رائے، بابو نوبین چندر رائے، رائے مول سنگھ اور بابو چندر ناتھ کو منتخب کیا گیا۔

۲۲ اپریل کے جلسے میں ڈاکٹر لائٹنر نے بڑی عمدہ تجویز پیش کی کہ جو مضامین انجمن میں پڑھے جاتے ہیں ان پر جلسۂ عام میں بحث بھی کی جائے۔

اس جلسے میں "ارتباط سلاطین سابق وحال با اہل ہند" پڑھ کر سنایا جو پسند کیا گیا پنڈت من پھول نے دوسری شادی کی قباحتوں پر مضمون پڑھا۔ دونوں مضامین رسالے میں شائع کرنے کو دے دیئے گئے۔

۲۶ مئی ۱۸۶۵ء کے جلسے میں سردار بھگوان سنگھ کا مضمون "رائی جنائی" اور دوسرا مضمون منشی گوپال داس کا تھا جس میں دختر فروشی کے رواج اور کیفیت بیان کی گئی تھی۔ تیسرا مضمون بھی منشی گوپال داس کا تھا جس کا عنوان "نقص دروغ گوئی" تھا یہ مضامین پسند کیے گئے

سکریٹری نے ان اخبارات کی فہرست پیش کی جو انجمن پنجاب کے پاس آنے شروع ہوئے۔ وہ یہ تھے:

۱۔ کوہ نور	لاہور	مہتمم	منشی ہرسکھ رائے
۲۔ کرانیکل	لاہور	مہتمم	گارڈن صاحب
۳۔ پنجابی	لاہور	مہتمم	منشی محمد عظیم صاحب
۴۔ سرکاری	لاہور	مہتمم	بابو چندر ناتھ کیوریٹر ڈائریکٹری پنجاب
۵۔ مجمع البحرین	لدھیانہ	مہتمم	محمد ناصر خاں و سید محمد شاہ صاحب
۶۔ نجم الاخبار	میرٹھ	مہتمم	محمد امیر احمد
۷۔ لارنس گزٹ	میرٹھ	مہتمم	محمد اسماعیل صاحب
۸۔ نور نظر	بلند شہر	مہتمم	منشی شیو پرشاد
۹۔ شعلہ طور	کان پور	مہتمم	شیخ عبداللہ

۱۰-	گوالیار گزٹ	گوالیار	مہتمم	منشی لچھمن داس
۱۱-	تت بودھنی پتریکا	بریلی	مہتمم	پنڈت گلاب سنگھ
۱۲-	برق خاطف	بمبئی	مہتمم	منشی مظفر حسین صاحب
۱۳-	مفرح القلوب	کراچی بندر	مہتمم	مرزا محمد مخلص علی
۱۴-	مالوہ اخبار	اندور	مہتمم	(ناظم نہیں لکھا تھا)
۱۵-	گیان پرادھنی پتریکا	لاہور	مہتمم	پنڈت سکندر رام

۲۷ر اپریل ۱۸۶۵ء (جلسۂ خاص) :

اس جلسے میں ڈاکٹر محمد حسین خان اور فقیر شمس الدین خان کو حفظ صحت کمیٹی کا ممبر بنایا گیا۔ کتب خانے کے متعلق تجویز ہوا کہ کتب خانہ کھلنے کی اطلاع نجی مدارس اور مکتبوں کو دی جائے۔ اس جلسے میں مصر رام داس کا خط سکریٹری نے پڑھ کر سنایا انھوں نے لکھا تھا کہ مجھے صرف عربی کمیٹی کا ممبر مقرر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں فارسی اردو اور سنسکرت وغیرہ سے ناواقف ہوں۔ یہ امر میرے لئے موجب تحقیر ہے۔ میں یہ سب زبانیں جانتا ہوں اور سب امتحان لے سکتا ہوں۔ اگر انجمن مجھے ہر زبان کی کمیٹی کا ممبر مقرر کرے تو مجھے منظور ہے۔ میں صرف عربی کمیٹی کا ممبر بننا نہیں چاہتا۔ بعد گفتگو تجویز ہوا کہ مصر رام داس کو لکھا جائے کہ امتحانی کمیٹیوں کے ممبر دو دو تین تین زبانیں جانتے ہیں۔ انھیں اس وجہ سے ہر کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا کہ اس طرح انہیں بہت محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر مصر صاحب کی یہی مرضی ہے تو انجمن کو عذر نہیں ہے۔

۲۹ر اپریل ۱۸۶۵ء (جلسہ عام) :

یہ جلسہ بہت پررونق تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر کی تجویز سے یہ طے کیا گیا کہ اب انجمن کے عام جلسے اور خاص جلسے جمعرات کو ہوا کریں گے۔ آج کے جلسے میں لیفٹیننٹ گورنر کی آمد آمد تھی۔ اس لئے جلسۂ عام سنیچر کے دن صبح سات بجے منعقد ہوا۔ گورنر دو تین دیگر انگریزوں کے ساتھ جلسے میں شریک ہوئے انھوں نے کتب خانہ دیکھا اور بہت خوش ہوئے۔ پھر

جلسۂ عام شروع ہوا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے صاحب ممدوح کا شکریہ ادا کر کے انجمن پنجاب کی مختصر کیفیت اردو زبان میں سنائی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ انجمن کس مقصد سے وجود میں آئی اور اس نے اس کی ترقی کے لئے کیا کیا کوششیں کیں اس کے علاوہ انھوں نے بعض مضامین مفیدہ کا بھی ذکر کیا جو انجمن کے ممبروں نے پیش کئے تھے۔ گورنر یہ تقریر سنکر بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر لائٹنر نے سنسکرت، بھاشا، اردو، فارسی اور عربی کی امتحانی کمیٹیوں کا ذکر کیا۔ گورنر نے خوش ہو کر ایک سو پچاس روپے اپنی طرف سے ممتحنوں کو عطا کئے اور کہا کہ جس مقصد سے یہ انجمن مقرر ہوئی ہے خدا اسے سرسبز کرے اور یہ وہ مطلب ہے جس کی تمنا مدت سے تھی اور جس کی سعی سے اس کی ترقی ہوگی وہ لائق تحسین ہوگا۔

اس جلسے میں پنڈت من پھول نے ایک مضمون "نقص طریقہ تعلیم انگریزی در مدرسہ جات سرکاری" پڑھا۔ اس مضمون کو سن کر گورنر نے کہا "ہم دیکھتے ہیں کہ علاوہ نقص تعلیم انگریزی کے اور زبانوں کی تعلیم بھی جیسی ہونی چاہیئے نہیں ہوتی، بلکہ ہم جانتے ہیں کہ تحصیل زبان فارسی کی جیسی کہ مکاتب قدیم میں ہوتی تھی، سرکاری اسکولوں میں نہیں ہوتی طالب علموں کو چاہیئے کہ زیادہ ترقی تحصیل علوم اپنے دیس کی زبان میں کریں یہ درست نہیں کہ اپنی زبان سے بے بہرہ رہیں اور غیر زبان میں ترقی کریں۔ اگر اول اپنی زبان میں ترقی کریں گے تو غیر زبان میں ترقی حاصل کرنی سہل ہوگی۔ اس باب میں زیادہ تر کوشش صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج اور صاحب ڈائریکٹر پنجاب درکار ہے۔

۲ر مئی ۱۸۶۵ء (جلسۂ عام):

اس جلسے میں انجمن کے سرگرم رکن محمد برکت علی خان تحصیلدار نے کہا:

"عند الملاقات صاحب جوڈیشنل کمشنر نے مجھ سے انجمن کا حال دریافت کیا اور ۱۳ جلدیں کتابوں کی کتب خانہ انجمن کے لئے عنایت کیں۔ پنڈت رادھا کشن نے ہندی اور سنسکرت کی کتابیں انجمن کو دیں۔ اس جلسے میں پنڈت من پھول کی سفارش اور برکت علی خانصاحب کی تائید سے انجمن میں پچاس ممبروں کا اضافہ ہوا۔ جن میں نواب نوازش علی خاں خلف نواب رضا علی خاں مرحوم اور فقیر رکن الدین کے نام سرفہرست ہیں۔ ان ممبروں میں

لاہور، امرتسر میونسپل کمیٹی کے ممبر، امرتسر کے آنریری مجسٹریٹ، محکمۂ تعلیم کے سررشتہ دار جہلم، کھاریاں، پنڈ دادرخان، پسرور، ڈسکہ، فیروزپور، جالندھر، ہوشیارپور اور نوان شہر کے تحصیلدار اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بھی شامل ہیں. اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے دیسی افسر اس انجمن میں دلچسپی لے رہے تھے. لاہور کے مشہور اور ممتاز فقیر خاندان کے متعدد افراد پہلے ہی انجمن میں شامل ہو چکے تھے. آج کے جلسے میں فقیر جمال الدین، فقیر سید ظہور الدین، فقیر امان علی شاہ بھی اس انجمن کے ممبر بنے. ان کے علاوہ کچھ اور ممبروں کی تجویز و تائید سے پچاس ممبر اور بنائے گئے جن میں سید عالم شاہ انسپکٹر پولیس کا نام بھی آتا ہے.

پنڈت من پھول نے شرکائے جلسہ کو بتایا کہ کلکتہ میگزین، جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور مدارس ایجوکیشن جنرل ہمارے پاس آتے ہیں. ہم یہ انجمن کو دے دیا کریں گے. اس اعلان پر پنڈت من پھول کا شکریہ ادا کیا گیا. انجمن کا کتب خانہ کتابوں سے بھرنے لگا اور اس میں ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت ہونے سے رونق رہنے لگی. صدر صاحب نے تجویز کیا کہ مولوی علمدار حسین، پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج، مولوی محمد حسین آزاد کی امداد سے فہرست کتب تیار کریں. ان دونوں نے اس تجویز کو بخوشی قبول کیا.

اس وقت تک انجمن کے پاس امتحانوں میں اعلیٰ قابلیت دکھانے والوں کیلئے چار سو روپے جمع ہو چکے تھے. جلسے میں ڈاکٹر لائٹنر نے ممبروں سے دریافت کیا کہ اس کی تقسیم کیوں کر ہوگی. انعام سب زبانوں میں برابر دیا جائے گا یا کم و بیش. گفتگو کے بعد فیصلہ ہوا کہ انعام برابر دیا جائے گا.

پنڈت نوبین چندر سکریٹری نے ہندی بھاشا کے قواعد منظوری حاصل کر کے چھپوا دیئے تھے. باقی زبانوں کی طرف کسی نے خاص توجہ نہیں دی تھی. فیصلہ ہوا کہ ۲۰ سے ۳۰ دسمبر تک امتحانات ہوں گے! ۲۰ مئی ۱۸۶۵ء تک قواعد امتحانات تجویز کر کے منظوری کے لئے انجمن میں پیش کر دیئے جائیں.

ڈاکٹر لائٹنر نے اعلان کیا کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر نے ایک سو پچاس روپے عربی، فارسی اور اردو وغیرہ کے امتحانات میں انعام دینے کے لیے عنایت کئے ہیں. سب نے ان کا شکریہ ادا کیا.

اِس جلسے میں ڈاکٹر لائٹنر نے بتایا کہ وہ دو مہینے کے لیے پہاڑ پر جا رہے ہیں اِس عرصے میں ان کی جگہ ایل گریفن جج لاہور انجمن کے صدر مقرر کر دیئے جائیں سب نے اِس تجویز کو پسند کیا۔

۲۶ مئی، ۱۸۶۵ء جلسہ خاص :

اِس جلسے میں امتحانات سنسکرت، عربی، فارسی اور اردو کے قواعد پیش ہوئے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے کہا کہ وہ ممبروں کے پاس بحث و مباحثہ کے لیے بھیجے جائیں۔

سیکریٹری تواریخ کمشنر مرسلہ مسٹر کوپر کمشنر لاہور رائے پنڈت موتی لعل پیش کی۔ تجویز ہوا کہ مولوی محمد حسین سے اِس کے متعلق رائے لی جائے۔

سردار بھگوان سنگھ کے مضمون "ذاتی جنائی" کے بارے میں تجاویز پیش کی گئیں۔ کہ اس مضمون میں جو تجویزیں پیش کی گئی ہیں ان کا اجراء مشکل ہے بہرحال اسے میونسپل کمیٹیوں اور رئیسوں کے پاس بھیج کر ان کی رائے لی جائے۔ لالہ گوپال داس، اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نے جو مراسلہ دختر فروشی کے متعلق بھیجا تھا۔ تجویز ہوا کہ انجمن کی کوشش اِس سلسلے میں بے سود ہوگی۔

اِس کے بعد لالہ گوپال داس کے مضمون "نفس دروغ گوئی" پر محمد برکت علی خان، تحصیل دار نے کہا کہ پنجاب کے مکتبوں میں تعلیم بہت خراب ہوتی ہے۔ سرکاری مدارس میں اخلاق بڑھایا جاتا ہے۔ لالہ گوپال داس کا خیال سرکاری مدارس کے متعلق صحیح نہیں ہے۔

(۱)، (۲) ۳ اور ۱۱ ستمبر، ۱۸۶۵ء :

اِن جلسوں میں یونی ورسٹی کالج کے متعلق تجاویز پیش کی گئیں جن

ؔ جون جولائی اور اگست کے پرچے آغا مرحوم (باقی صفحہ ۱۲۹ پر ملاحظہ کیجیے)

ہیں السنہ شرقیہ میں کتابیں تصنیف و تالیف کی تجویز بھی شامل تھی۔ امتحانات اور اچھے نتائج پر انعامات تجویز ہوتے۔

۱۵ ستمبر ۱۸۶۵ء جلسہ عام :[1]

(۲) مضمون زیادتی، دروغ گوئی۔ دوسرا پنچائت کی ضرورت از پنڈت رادھا کشن[1] تیسرا مضمون جو حکیم دیوان چند نے پیش کیا وہ بھی پنچائت سے متعلق تھا۔[2] پنچائت کی ضرورت اِس لیے تھی کہ سکھوں کے دور میں پنچائت کی اہمیت برائے نام رہ گئی تھی سکھ زمیندار جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ مزارعین کے ساتھ ان کا سلوک ناروا تھا۔ اِس کے علاوہ سکھوں کی جہاں اکثریت تھی وہاں اگر مسلمان یا ہندو پنچایت کا اہتمام کرتے، تب بھی پنچوں کی اکثریت سکھ ہونے کی وجہ سے فیصلے درست نہیں ہو سکتے تھے۔ پنجاب چوں کہ زرعی خطہ ہے اور مال گذاری سے آمدنی ہوتی تھی اِس لیے حکومت نے پنچائتوں کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ آپس کے جھگڑے جب پنچائت میں طے نہ ہونے کے سبب اگر کچہریوں تک پہنچائے جاتے تو اِس کی طویل

(بقیہ ۱۲۸ کا فٹ نوٹ) کے پاس موجود نہیں تھے۔ لہذا اِس زمانے کی کارکردگی کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

اکتوبر، نومبر اور دسمبر میں اورنٹیل یونی ورسٹی کے لیے کوششیں و خط و کتابت جاری رہی۔

[1] اقتباس از کیلنڈر یعنی دستور العمل پنجاب یونی ورسٹی کالج بابت ۱۸۷۴-۷۵ء مطبع انجمن پنجاب لاہور میں باہتمام نظام الدین چھپا۔

[2] رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۴، سن ابتدائے ستمبر لغایت دسمبر ۱۸۶۵ء مطبع کوہ نور لاہور میں چھپا۔

کارروائیوں کے پیش نظر کسان اپنا وقت برباد نہیں کر سکتے تھے۔
پنچایت کو از سر نو منظم کرنے کے لیے یہ مسئلہ انجمن میں پیش کیا گیا۔ اِس مسئلے میں گورنر پنجاب اور لیفٹیننٹ گورنر نے بھی بڑی دل چسپی لی اور اس کی اہمیت کو سمجھا۔ لہذا اسکریٹری گورنمنٹ ہند نے ایک چھٹی نمبر ۶/۶۹ م مورخہ مارچ سکریٹری گورنمنٹ پنجاب کے نام لکھی جس میں استفسار کیا گیا تھا کاشتکاروں کی داد رسی کے لیے عدالتوں کو سرسری اختیارات دینا قرین مصلحت ہو گا یا نہیں اس سلسلے میں جوڈیشنل اور مال کے اعلیٰ یورپین خواہ وہ ملازم ہوں یا نہ ہوں اِس کے علاوہ دیسی دانا اور تجربہ کار لوگوں کی رائیں ضروری ہوں گی۔

اس کے علاوہ گورنر جنرل یہ بھی دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ پنجاب کے اندر ایسے اضلاع ہیں یا نہیں جس جگہ مال گزاری وصول کرنے کے قواعد مقرر کیے جائیں تا کہ حسب موسم مال گزاری وصول ہو سکے۔

دیسی پنچایتوں کی کارروائیوں سے متعلق حکومت ہند سے حکومت پنجاب کی خط و کتابت ۱۸۷۹ء تک ہوتی رہی۔ انجمن نے اِس کے اقدام کے لیے کمیٹی مقرر کی جس نے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ گھوم پھر کر حالات معلوم کیے۔ جاگیرداروں اور مزارعین کی رائیں معلوم کیں۔ اپنے جھگڑے اور مال گزاری کے متعلق تصفیہ سے متعلق خود انجمن پنجاب کے جلسوں میں اِن نمائندوں نے حالات بیان کیے۔ اور ڈاکٹر لائٹنر نے تحصیل داروں، روسا، اور جاگیرداروں سے اِن کی رائیں طلب کیں۔ ۹ مئی ۱۸۷۹ء میں تمام نکات واضح ہوئے اور دیسی پنچائتیں قائم ہوئیں۔ اِن میں سے چند آراء پیش کی جاتی ہیں۔

مسٹر لنڈزی صاحب نے کہا کہ پنچائت مقرر کرنے کے حق میں رائے دیتا ہوں لیکن پنچائت کے فیصلے کی مخالفت میں اپیل کرنے کے حق میں ہوں۔
رائے مول سنگھ اور دیوان داس مل نے چشم دید واقعات سنا کے

کہ اس زمانے میں کوئی ضابطہ اور قاعدہ دیوانی اور فوجداری عدالتوں کا نہ تھا پنچائت جو فیصلہ کر دیتی تھی اس پر عمل درآمد ہوتا تھا اگر کوئی فریق اس فیصلے سے متفق نہ ہوتا تو ضلع کے کار دار کو پنچائت کو منسوخ کرنے یا قائم رکھنے کا حق ہوتا تھا۔ اگر کار دار سے بھی کوئی ناراض ہوتا تو لاہور کی صدر عدالت میں اپیل کی جاتی تھی اور پھر مہاراجہ فیصلہ کیا کرتے تھے (یہ رپورٹیں اب بھی دفتر گورنمنٹ پنجاب میں موجود ہیں)

مسٹر پول نے پنچائت کے فیصلے پر متفق نہ ہونے کی صورت میں اپیل کی تجویز پیش کی خان بہادر برکت علی خان پنچائت کے تقرر کے سلسلے میں اتنا اضافہ اور کیا کہ ہر ایک دیہات میں پنچایت نہیں ہونی چاہیئے بلکہ ہر ایک حلقۂ دیہات میں مقرر ہونی چاہیئے۔ منشی میاں داس تحصیل دار نے کہا کہ لوگ ناخواندہ ہوتے ہیں لہذا ایک رجسٹر اور ایک محرر بھی مقرر ہونا چاہیئے اس تجویز پر بڑی بحث ہوتی اور کہ تجربہ کار ناخواندہ آنریری مجسٹریٹ ایک خواندہ محرر کے سامنے لاجواب ہو جاتا ہے لہذا محرر اور رجسٹر کی ضرورت نہیں۔

لالہ حکم چند نے کہا کہ ہمیں تجویز کرنے کا حق نہیں صرف ہاں یا نہیں میں جواب دینا ہے۔ اس پر مسٹر پول نے مخالفت کی کہ خواہ گورنمنٹ نے پوچھا ہو یا نہ پوچھا ہو ہم یہ مشورہ ضرور دیں گے کہ اگر محرر اور رجسٹر کی ضرورت ہوئی تو اس کے لیے عملہ رکھنا ہوگا اور یہ سلسلہ آگے بڑھ کر کچہری کی شکل اختیار کرے گا لہذا اس کو منسوخ کیا جائے۔

اخبار انجمن پنجاب نمبر ۲۴، جلد ۱۰، ۱۳ جون ۱۸۷۳ء (ص ۴-۲) پر فقیر سید شہاب الدین رئیس لاہور کی رائے بڑی مثبت تھی جس کو گورنر جنرل ہند تک پہنچایا۔

ازانجا کہ سرکار دولت مدار نے از راہ رعایا پروری و رفاہ عام

کے پنچایت دیسی کے واسطے انفصال چھوٹے چھوٹے مقدمات کی تجویز فرمائی ہے اور اس معاملے میں رائے طلب کی گئی ہے۔ بنا بر آں حسب حکم سرکار عالی وقار کے ایک صاحب نے اپنے خیالات کے موافق گزارش کی ہے.... کہ زمانہ سابق میں یہ رسم یعنی تقرری پنچایت نہ فقط واسطے دیہات کے تھی اور واسطے خاص و عام کے بلکہ پنچایت ہر شہر ہر قصبہ اور دیہہ اور ہر قوم کے واسطے منجانب سرکار و حکام وقت کے مقرر ہوتی تھی بلکہ شرفاء و نجبا کے مقدمات کبھی عدالت میں یا کسی حاکم کے روبرو پیش نہ ہوتے تھے.... مگر اب جب یہ امر (پنچایت کا تقرر) جاری ہو جائے گا۔ تو نہایت ان میں فائدے ہوں گے کیوں کہ اکثر مقدمات جو پنچایت میں پیش ہوں گے ان میں راضی نامہ ہو جایا کرے گا........

چند صاحبان کی رائے میں پنچوں کے واسطے کچھ تنخواہ ضرور مقرر ہونی چاہیے اور کورٹ فیس وغیرہ...... اس میں پھر وہی قباحتیں اور دقتیں درپیش ہوں گی...... اس لیے یہ کافی ہو گا کہ ایک ہدایت واسطے پنچوں کے گورنمنٹ سرسری طور پر تجویز فرما دے اور سرسری اختیارات ان کو عطا ہوں تاکہ وہ ان پر کاربند رہیں۔ یہ صرف اعزازی طور پر مقرر ہوں اور لوگوں کے علاوہ جو لوگ ناداری اور مفلس کے بے بضاعت ہوں مگر لیاقت ذاتی اور شرافت خاندانی اور حسبی و نسبی رکھتے ہوں ان کو پنچ مقرر کیا جائے اور خواہ بطور انعام یا بطور فیس یا کسی اور طرح سے گورنمنٹ ایک خاص رقم ان کو مہیا کرے دوئم فیس لگانا مناسب ہے فیس کورٹ لگانے کا ایک سلطنتی نظام معلوم ہو گا۔ جس سے موثر فیصلے ہوں گے لیکن یہ فیس ایک روپیہ سے کم اور دو آنے سے زیادہ ہو وہ مروج کیا جائے اور فیصلہ پنچوں کا قطعی اور نافذ سمجھا جائے گا اور عدالت ضلع میں پذیر اور تسلیم ہو گا۔ اس سے ضلع کے حکام کا کام کم اور پنچایت کا

رعب دیہاتیوں پر قائم ہوگا۔ اس طرح جرائم میں کمی ہوگی اور پنچوں سے حکام کو مدد مل سکے گی اس کے علاوہ جو لوگ عہد سلف کو یاد کرتے ہیں ان کی شکایات رفع ہو جائیں گی۔

۱۔ اگر پنچوں کی رائے باہم متفق نہ ہو اور ایک دوسرے کے مخالف ہو تو وہ ہدایت طلب کر سکتے ہیں اور خواہ اس کا کثرت رائے پر حصر رکھا جاوے۔

۲۔ جب کہ کسی پنچ کی بہ نسبت کامل یقین اور پورا ثبوت رشوت ستانی کا ہو یا اور پنچوں کو اس مقدمے سے کوئی خاص ذاتی واسطہ ہو تو اِن حالتوں میں عدالت ضلع کو توجہ دلائی جا سکتی ہے...... پنچو کی تقرری کے لیے چند امور قابل لحاظ ہیں ایک تو یہ کہ پنچ کم از کم تین اشخاص ہوں (۲) ایک مذہب کے نہ ہوں (۳) ذاتی لیاقت رکھتے ہوں اور منجملہ نمبرداران واعلیٰ نمبرداران و ذیلداران کے ہوں۔

۳۔ ایک محرر ضروری ہے جو ایک رجسٹر اپنے پاس رکھے گا جس میں مدارج حسب ذیل ہوں گے:

(۱) نام مدعی، (۲) نام مدعا علیہ (۳) سکونت

(۴) قومیت، (۵) پیشہ، (۶) دعویٰ تاریخ۔

(۷) ارجاع نالش، (۸) تاریخ فیصلہ، (۹) دستخط، ۔"

اِس طرح اِس رجسٹری سے بخوبی کارروائی پنچوں کی حکام اعلیٰ کو ہوا کرے گی۔ بلکہ کل حکام کو لازم ہوگا کہ دورے میں ایسے رجسٹر ملاحظہ فرمایا کریں اور مثل دیگر امور کے اِن کی نسبت بھی حکام اعلیٰ کے پاس رپورٹ فرمایا کریں اور پنچوں کو سماعت مقدمات، دیوانی کا کم از کم ۵۰/= (پچاس) روپے مالیت کا ہو اور جو مقدمہ کہ زر کثیر کا ہو اور

اِس میں برضامندی فریقین پنچوں نے فیصلہ کر دیا ہو وہ بھی قطعی سمجھا جاوے اور اس کی اپیل نہ ہو اور فوج داری میں خفیف واردات، مثلاً زد و کوب یا دشنام دہی وغیرہ کا اختیار ہو۔ اور مال میں حدبست وغیرہ کا تنازع اِس کے فیصلے کا اختیار مرحمت ہو اور حدود ہر ایک ایسے علاقے کی جہاں پنچ ہوں کم از کم دس میل ہونی چاہیئے۔ کیوں کہ اگر زیادہ ہو تو وہی تکلیف در پیش ہوگی۔ تعداد دیہات کا لحاظ ضروری نہیں ہے۔ کیوں کہ اکثر جگہ گاؤں ایک دوسرے سے قریب ہیں بہر حال فاصلے کا لحاظ ضروری ہے۔"

ڈاکٹر لائٹنر نے اِن آراء کو شائع کر دیا اور حکومت کے علاوہ دیہاتوں میں اس پمفلٹ کو تقسیم کروا دیا۔ اِس پمفلٹ پر روسا دیران اخبارات، وکلا، سرکاری ملازمین اور دیگر ہندوستانی جو تعلیم یافتہ اور تجربہ کار تھے ان کے دستخط موجود ہیں۔

۲۷ ستمبر ۱۸۶۵ء جلسہ خاص:

یہ جلسہ صرف انگریز حکام کا تھا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ اہلِ ہند کے ساتھ مل کر السنۂ شرقیہ کے احیاء کی کوشش کی جائے۔

(۱) ۳۰ جنوری ۱۸۶۶ء:

اِس تاریخ کو جالندھر کے کمشنر خورسائٹ کا ایک خط انجمن میں پڑھا گیا جس کا عنوان تھا دعوئے وراثت عورات اہل اسلام میں شرع محمدی کی پابندی ہونی چاہیے یا ملک کے رواج کے مطابق" اِس مسئلے پر بحث ہوئی اور طے کیا گیا کہ وراثت کے سلسلے میں شرح محمدی ہی کی پابندی

ل رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۶ جلد ۲، بابت فروری ۱۸۶۶ء

ہوگی۔

آج یہ بھی طے ہوا کہ رسالہ دھلی کے کارآمد مضامین رسالہ انجمن میں شائع ہونے چاہئیں۔

۶۔ مارچ ۱۸۶۶ء:

اِس تاریخ کے جلسے میں نئی تصانیف و تالیفات کے شائع کرنے کے حقوق کے تحفظ کی درخواست کی گئی۔

۱۳۔ مارچ ۱۸۶۶ء:

اِس تاریخ کے جلسے میں مہاراجہ کپورتھلہ انجمن کے جلسے میں شریک ہوئے اور طے کیا گیا کہ ہندوستان کے مہاراجگان، رئیس اور سرداروں سے پنجاب میں یونی ورسٹی قائم کرنے کے لیے چندے کی درخواست کی جائے۔

اکال گڈھ کے رئیس لالہ ہرکشن داس نے اکال گڈھ میں انجمن کی شاخ کھولنے کی اور لڑکیوں کے لیے پاٹھ شالہ قائم کرنے کی اجازت طلب کی جو منظور کرلی گئی۔

۲۷۔ مارچ ۱۸۶۶ء:

سید ظہورالدین نے پنتیس (۳۵) روپے کا عطیہ کتب خانے کی کتابوں کی جلدبندی کے لیے دیا۔ پنڈت رادھا کشن نے اپنی تصنیف شدہ چار کتابیں رامائن رہن تیرتھ جاترا، دیا تو پاٹھ پرکاش انجمن کو تحفہ دیں۔ دو کتابیں پنڈت امرناتھ نے "ہرکلات دیوانی و فوجداری بابت ۱۸۶۳ء" انجمن کے کتب خانے میں داخل کیں۔ ہادی حسین نے ایک کتاب المسمّٰی "مجموعہ" قوانین مختص الامر دمختص المقام فوجداری"، مطبوعہ کوہ نور لاہور پیش کی۔ پنڈت مکند رام مہتمم مترِ بلاس نے "اتم مت بدیا" (گورمکھی) بال ابدیس (ناگری) سنسکرت پائیوا ایکار۔ برامہ دھرم مگھی (گورمکھی) نامی کتابیں کتب خانے کو تحفے میں

دیں۔ سرکلر انگریزی میں ڈاکٹر فاربس نے معہ ترجمہ متعلق نئی کل روئی (شین) جو کارخانے دھارو دار میں بن کر تیار ہوئی تھی پیش کی۔

منشی گوپال داس کمشنر گوجرانوالہ کا ایک مضمون" درباب انسداد دروغ گوئی پڑھ کر سنایا گیا۔

منشی گوپال داس ہی کا ایک مضمون" دختر فروشی" پڑھا گیا۔ لالہ صاحب سنگھ رئیس دہلی نے" استعمال نقرہ وطلا و نوٹ زر" بموجب رائے بابو نوبین چندر کے پڑھا جس میں نوٹ جاری کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

"رسوم قبیحہ کو بند کرنے کے لیے پہلے روٴسا قدم اٹھائیں" یہ ایک خط تھا جو لالہ دونی مل نے انجمن کو لکھا تھا۔

کمشنر ڈیرہ غازی خان کا خط بھی پڑھ کر سنایا گیا جس میں یونی ورسٹی قائم کرنے پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا اور چندہ دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

لالہ نانک چند کا مضمون" حل چل شطرنج" پڑھا گیا۔

منشی جمنا پرشاد کا مضمون" درباب تدابیر ترقی علوم" پڑھ کر سنایا گیا۔ کمشنر پٹنہ کرنل ٹیلر کا خط پڑھ کر سنایا گیا جس میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ انھوں نے مدرسہ تعلیم فنون وصنعت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن گورنمنٹ کی طرف سے اس کی ہمت افزائی نہیں ہوئی۔ انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ اگر اہل پنجاب بجائے حکومت پر تکیہ کرنے کے اگر خود کوشش کریں تو ان کی کوششیں بار آور ہوں گی۔

آج سررشتہ میڈیکل کی طرف سے اشتہار تیار کیا گیا جس میں طلبا کو امتحان میں داخلے کا طریقہ بتایا گیا تھا۔

محمد مراد علی خان المتخلص بہ رعنا نے مضمون پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ فرقہ مخنث زبردستی لڑکوں کو مخنث بنا لیتے ہیں لہذا اس امر پر توجہ دی جائے۔

آج کے جلسے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ گورنمنٹ اسکول میں جو آلات حکمت موجود ہیں وہ لیکچر یا بوقت ضرورت انجمن میں منگوائے جا سکتے ہیں۔

پنڈت امرناتھ کی کتاب " دربیان اشکال تحریر اقلیدس " بزبان سنسکرت انجمن کو پیش کی گئی۔ جسے یونی ورسٹی کالج کے نصاب میں شامل کیا گیا۔

اردو گرامر کی ایک کتاب جسے محمد علی صاحب نے ترجمہ و تالیف کیا تھا انجمن کو پیش کی گئی۔

جمنا پرشاد کا مضمون " درباب ترویج قانون " بتائید منشی جیشی رام رسالہ انجمن میں شائع کرنے کے لیے منظور کیا گیا۔

یہ بھی منظور کیا گیا کہ مضمون " درباب مسئلہ شرعیہ مستفسرہ کمشنر جالندھر بذریعہ زبان انگریزی رسالہ میں شائع کیا جائے۔

لیکچر، غزلیات اور منظومات جو مشاعرے میں پڑھی جاتی ہیں انھیں شائع کرنے کی تجویز بھی پیش کی گئی۔

جلسے میں مندرجہ ذیل کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی:

۱۔ جلسہ کمیٹی ایجوکیشنل یعنی علمی، بابو نوبین چندر رائے
۲۔ جلسہ کمیٹی میڈیکل حفظ صحت، ڈاکٹر رحیم خان صاحب
۳۔ جلسہ عام انجمن، منشی ہرسکھ رائے و بابو نوبین چندر رائے
۴۔ جلسہ کمیٹی کارکن، منشی ہرسکھ رائے۔
۵۔ کمیٹی فنانشل منشی ہرسکھ رائے و بابو شیاما چرن

اشتہار مدرسہ ڈاکٹر لاہور

منذکرہ دفعہ نمبر ۱۸ مربی پروسیڈنگ ۲۴ مارچ، ۱۸۶۶ء نواب لیفٹیننٹ گورنر ممالک پنجاب۔

منتظم کمیٹی:

۱۔ صاحب فنانشل کمشنر

۲۔ صاحب کمشنر بہادر، لاہور،
۳۔ صاحب ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب، اور
۴۔ صاحب انسپکٹر جنرل ہسپتال ہائے واقع قسمت لاہور، جنرل ڈاکٹر بہ سبب اپنے عہدے کے۔

عہدہ داران مدرسہ :

۱۔ جے۔ بی اسکروِن، پرنسپل و مدرس جراحی و علم طب (بہ سبب بیماری رخصت پر ہیں)
۲۔ ٹی۔ ای۔ بی۔ براؤن، ایم ڈی لنڈن، قائم مقام پرنسپل،
۳۔ جی ہنڈرسن صاحب، ایم ڈی، قائم مقام مدرس، علم طب و جراحی،
۴۔ سی۔ ایم۔ سمتھ، ار سی ایس، مدرس فن قابلہ و علم سمیات وغیرہ متعلقہ عدالت۔
۵۔ ٹی۔ ای۔ بی۔ براؤن، ایم۔ ڈی، مدرس علم کیمیا و علم ادویہ و علم نباتات
۶۔ ای۔ نیل صاحب، مدرس علم تشریح و افعال اعضا اور قائم مقام مدرس علم الادویہ۔
۷۔ جی اینڈروس، مدرسہ کے اسپتال کا سرجن جو ہمیشہ مدرسہ میں رہتا ہے۔
۸۔ رحیم خان سپرنٹنڈنٹ ہندوستانی جماعت
۹۔ محمد حسین خان اسسٹنٹ ڈیمانسٹریٹر اناٹمی
۱۰۔ آر۔ ڈبلیو۔ ہری سن اپوتھیکری

اِس مدرسے کی جماعتیں علیحدہ علیحدہ ہیں اول یعنی انگریزی جماعت کے طلباءُ کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ سب اسسٹنٹ سرجن مقرر ہونے کے لائق ہوں اور دوسری یعنی ہندوستانی جماعت کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ نیٹو ڈاکٹر مقرر ہونے کے لائق ہوں۔

اِس جماعت کے طلباء کو پانچ سال تک تعلیم دی جاتی ہے۔ صوبہ بنگال

خاص، مدراس اور بمبئی کے صوبوں میں رہنے والے طالب علموں کو داخلہ نہیں دیا جاتا ہے اِس لیے کہ وہاں ڈاکٹری کے مدرسے موجود ہیں۔

جو لوگ اِس مدرسے میں داخل ہونا چاہیں ان کے لیے سولہ سے بیس برس تک کی عمر کی قید ہے پہلے ان کو کسور عشاریہ اور زبان انگریزی کا امتحان دینا ہو گا۔ ان کو وظیفے بھی دیتے جاتے ہیں۔

دوسری جماعت ہندوستانی ہے۔ اِس جماعت کو تین سال تعلیم دی جاتی ہے فقط پنجاب اور ضلع مغربی کے باشندوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ سولہ سے بیس سال تک کی عمر کی قید ہے۔ ان کو حساب اربعہ متناسبہ اور ہندوستانی زبان میں امتحان دینا ہوتا ہے۔ اُردو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور فارسی رسم الخط میں لکھوایا جاتا ہے۔ پشتو انگریزی جاننے والے بہتر اور پنجابی بہترین سمجھے جاتے ہیں۔ امتحان مکمل ہونے پر انھیں بطور سپاہی بھرتی کیا جاتا ہے۔ وہ جنگی قانون اور قواعد کے پابند ہوتے ہیں۔

ہندوستانی امیدواروں کا منگل کے روز ۲۴ اپریل ۱۸۶۶ء کو امتحان ہو گا۔ پیر کے دن ۲۳ اپریل نام رجسٹر کیے جائیں گے۔ پہلے اردو جاننے والوں کو محروم رکھا جاتا تھا لیکن اب ان کو اہمیت دی گئی ہے۔

۳ اپریل ۱۸۶۶ء (جلسہ ایجوکیشنل کمیٹی):- (۱)

اس جلسہ میں ڈاکٹر لائٹنر نے احیائے السنۂ شرقی کی ضرورت پر زور دیا اس کے علاوہ انہوں نے کہا کہ نامن اسکول کے ماسٹر اسٹین صاحب مشاعرے کے علاوہ روزانہ ایک گھنٹہ تک جلسہ میں لیکچر دیا کریں گے اور آلاتِ حکمت سے ثبوت اور عمل بھی دکھائیں گے۔ (۲)

---

(۱) رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۸، جلد ۲، بابت ماہ اپریل، ۱۸۶۶ء، مطبع کوہ نور میں باہتمام منشی ہرنام پرنٹر چھپا۔

(۲) یہ اقدام سائنس کی تعلیم کو ترویج کرنے اور عام فہم بنانے کے سلسلہ میں کیا گیا تھا۔ (مقالہ نگار)

ماسٹر پیارے لال آشوب کا خط بھی آج پڑھ کر سنایا گیا جو انہوں نے دہلی سوسائٹی کی طرف سے لکھا تھا جس میں انجمن پنجاب کی ترقی و ترویج، علوم شرقی اور زبان ہائے دیسی اور علوم مفیدہ کی کتابوں کے اردو ترجمہ کے متعلق تعریف کی تھی۔

سنسکرت سوسائٹی لندن کا خط ڈاکٹر لائٹنر نے پڑھ کر سنایا جس کے پریسیڈنٹ پرنس آف ویلز تھے۔ اس سوسائٹی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ہندوستان کی قدیم کتب سوسائٹی کو فراہم کی جائیں۔

شیخ فیروز الدین صاحب نے کہا کہ یکم مئی ۱۸۶۶ء میں کالج یونیورسٹی کی بنیاد ڈال دی جائے اور ابھی طلباء سے فیس نہ لی جائے۔ نواب عبدالمجید خان نے کالج یونیورسٹی کے نئے عمارت اور فرنش کے انتظام کا وعدہ کیا۔ اس جلسہ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ طلباء پر سے عمر کی قید اٹھالی جائے۔

۱۴ اپریل ۱۸۶۶ء (جلسۂ خاص)

ڈاکٹر لائٹنر نے جلسہ میں پھر انجمن پنجاب کے اغراض و مقاصد بیان کئے۔ مہاراجہ مان سنگھ، فقیر شمس الدین صاحب اور برکت علی خان صاحب نے بھی تقاریر کیں۔ ڈاکٹر لائٹنر نے کہا کہ ان کی دلی خواہش ہے کہ ہندوستان میں اسسٹنٹ و اکسٹرا اسسٹنٹ کا امتحان بھی ہوا کرے۔

۲۴ مارچ ۱۸۶۶ء میں جو امتحانات ہوئے تھے یہ سنسکرت، ہندی، عربی، فارسی اور اردو کے تھے۔ اگرچہ امتحانات کے داخلے ۱۰۹ (ایک سو نو) طالب علموں کو دیئے گئے تھے لیکن صرف ۴۷ طالب علموں نے پانچوں زبانوں میں امتحان دیا۔ ۳۳ طالب علم کامیاب ہوئے انہیں سندیں دی گئیں۔

درجہ اول میں آٹھ طلباء، درجہ دوم میں ۱۷ اور درجہ سوم میں آٹھ طلبا کامیاب ہوئے فارسی اور ہندی میں صرف ایک ایک طالب علم درجہ اول میں کامیاب ہوا۔ عربی کے امتحان میں بہت کم طالب علم شریک ہوئے کیونکہ نصابی کتابیں موجود نہیں تھیں۔ لیکن مولوی مراد علی اچھے نشانات سے کامیاب ہوئے۔ یہ سب لوگ ملازمتوں پر مامور کر دیئے گئے۔

رپورٹ:۔ از مولوی علمدار حسین

پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور ممبر انجمن پنجاب

۲۱ر اپریل ۱۸۶۶ء (جلسہ زراعت):

اس جلسہ میں حقیت مزارعانہ کا بل پاس کیا گیا۔ زمینوں پر کسانوں کے مستقل قبضہ کا فیصلہ ہوا۔ زمین پر حق مالکانہ کے سلسلہ میں بحث کی گئی۔ پٹواریوں اور نمبرداروں کے حقوق پر روشنی ڈالی گئی، سڑکوں کی مرمت اور تعمیر، مدرسہ جات کی اصلاح اور ضلعوں میں ڈاک کے انتظام کو بہتر بنانے کی تجاویز پر غور کیا گیا۔

جلسہ فنانشیل کمیٹی:

آج ہی کے جلسہ میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ انجمن کا تمام حساب فارسی میں لکھا جاتا ہے۔ اب انگریزی میں بھی شروع کیا جائے۔

۸ر مئی ۱۸۶۶ء (جلسہ ایجوکیشنل کمیٹی):(۱)

(۱) میاں محمد علی کی کتاب اخلاق "کا مسودہ پڑھ کر سنایا گیا۔

(۲) آج کے جلسہ میں یہ طے کیا گیا کہ نصاب میں علم تواریخ اور جغرافیہ لازمی ہونا چاہیئے۔

۱۵ر مئی ۱۸۶۶ء (جلسہ میڈیکل کمیٹی):

آج اس جلسہ میں یہ طے کیا گیا کہ دیسی طبیبوں اور ڈاکٹروں کے لیے تین سال کا کورس پورا کئے بغیر انہیں طبابت کی اجازت نہ دی جائے۔ امتحان کے بعد انہیں ملازمت دی جائے۔

" دائی جنائی "مولفہ بھگوان داس امرتسر کی کتاب زنانہ مدرسوں میں شامل کرنے کی تجویز پر غور کیا گیا اور یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ یہ کورس ایک برس یا چھ مہینے کا ہونا چاہیئے۔

منشی ہرسکھ رائے کا مضمون "انجمن احسن تدبیر انتظام دوا فروشی" پڑھا گیا۔

لالہ حکم چند، مدرس دہلی کالج کا یہ مضمون پڑھ کر سنایا گیا جس میں تحریر تھا کہ "سوسائٹی دہلی بمنزلہ شاخ انجمن لاہور کے ہے"۔

---

(۱) رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۹، جلد ۲، بابت ماہ مئی ۱۸۶۶ء مطبع کوہ نور لاہور میں باہتمام منشی ہرسکھ رائے پرنٹر چھپا۔

انجمن کے ایک جلسہ میں ایک مضمون "تعریف اخلاق و مذمت غصہ" پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ اس مضمون سے متعلق مرزا شہاب الدین کا خط پڑھ کر سنایا گیا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اس مضمون میں "حکام" کی بے جا تعریف کی گئی ہے۔

پنڈت رادھا کشن کا مضمون "در باب طریقہ قدیمی و حال امتحانی" پڑھا گیا۔

کتاب نیائے شاستر کا سنسکرت سے بھاشا میں ترجمہ پنڈت روپ چند نے پیش کیا

۲۹ مئی ۱۸۶۶ء (اجلاس عام):

بڑے بحث و مباحثہ کے بعد ممبران انجمن اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندو ویدوں جلیبوں اور دائیوں پر کوئی دفعہ نافذ نہیں کی جا سکتی۔

پنڈت رادھا کشن نے ایک مضمون پڑھ کر سنایا جس کا عنوان تھا "نقص طریقہ امتحان پنڈتان مروجہ سابقہ و خوبی طرز امتحان حال"

یہ بھی اس جلسہ میں طے کیا گیا کہ امور متعلقہ یونیورسٹی اور مسودہ رسالہ یونیورسٹی کی ایک ہزار کاپیاں چھاپی جائیں۔

منشی ہر سکھ رائے نے بھی ایک مضمون بعنوان "تدبیر احسن ترقی صحت نفسانی" پڑھا۔[1]

۴ جولائی ۱۸۶۶ء (اجلاس عام):

ڈاکٹر لائٹنر نے کہا کہ نواب لیفٹننٹ گورنر نے یونیورسٹی کی عمارت کے لئے زمین دینے کا وعدہ کیا ہے اور ساتھ ہی ان روسا، راجاؤں اور مہاراجاؤں کا بھی ذکر کیا جنہوں نے یونیورسٹی کے لئے چندہ دینے کا اعلان کیا ان میں مہاراجہ جموں، راجہ پٹیالہ اور راجہ والی منڈی قابل ذکر ہیں۔

میجر لیز نے یونیورسٹی کے قیام میں بہت دلچسپی ظاہر کی اور یونیورسٹی کا حساب کتاب میجر لیز کو انجمن کے مشورے کے مطابق دے دیا گیا۔

آج تجویز بھی منظور کی گئی کہ لندن کی سنسکرت سوسائٹی سے انجمن پنجاب کا ارتباط قائم کرنا چاہیے اور نیز یہ کہ انجمن پنجاب کی ایک کمیٹی لندن میں بنائی جائے جو انجمن پنجاب

---

(۱) جون ۱۸۶۶ء کا پرچہ آغا باقر مرحوم کے پاس موجود نہیں تھا۔ (مقالہ نگار)

لاہور کو مفید امور کے سلسلہ میں مدد دیا کرے۔

پیرس سے پروفیسر گارساں دتاسی نے انجمن پنجاب کا ممبر ہونے کی درخواست کی تھی جو منظور کرلی گئی۔

دہلی اسکول کے مدرس میاں رحیم بخش کی کتاب "تزکیۃ الاخلاق" پر تنقید کی گئی۔

شیخ احمد کی کتاب "حل الترکیب محمود نامہ" انجمن کو پیش کی گئی۔

کالج کے ان طلباء کو وظیفہ دینا منظور کیا گیا جن کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا۔

"کتاب عجب العجائب وسلم العلوم" خریدنا طے کیا گیا۔

منشی ہرسکھ رائے نے اپنی کتاب "مجموعہ مواد قوانین امتحان تحصیلداران" انجمن میں پیش کی تاکہ تحصیلداروں کے نصاب میں اسے پیش کیا جاسکے۔

"گنج شائیگان" از ابتدائے جنوری لغایت اپریل ۱۸۶۶ء کی چار جلدیں خرید کر کتب خانہ میں داخل کی گئیں۔

میجر لیز صاحب کا خط پڑھ کر سنایا گیا جس میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی اور کلکتہ یونیورسٹی کے مابین اصولی خط وکتابت سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھنے کا اعلان کیا اور کچھ پنجاب یونیورسٹی کالج کے قیام کی تدابیر اور انجمن پنجاب کی کلکتہ میں ہر دلعزیزی کا تذکرہ بھی ہوا تھا۔

زبان پنجابی کی ترویج واشاعت پر بھی بحث ہوئی کہ اس صوبائی زبان پر بھی توجہ دی جانی چاہیئے۔

رانگٹن صاحب کا خط بھی پڑھ کر سنایا گیا جس میں انہوں نے ایک تذکرۂ شعرائے اردو لکھنے کی فرمائش کی تھی۔

یہ بھی تجویز منظور کی گئی کہ کتب قانونی کی تعلیم کے لئے ایک مدرس مقرر ہونا چاہیئے۔

مسٹر اسٹین صاحب کے لئے طے کیا گیا کہ اگست ۱۸۶۶ء سے وہ تین لیکچر دیا کریں ایک مرتبہ انجمن کے جلسہ میں اور دو مرتبہ کالج میں۔

انجمن پنجاب کے زیر نگرانی جو مدارس قائم کئے گئے تھے انکی دیکھ بھال کی تجویز بھی منظور ہوئی۔

محمد صالح صاحب کو باقاعدہ ملازم رکھا گیا تاکہ وہ عربی زبان کے محاوروں کا خاص

خیال رکھیں ۔

آئندہ سال کے امتحان کی تیاری کے لئے کتابیں تجویز کی گئیں۔ انجمن پنجاب کے لئے تہران سے جو کتابیں موصول ہوئی تھیں ان کی فہرست مرتب کرنے کی ہدایت کی گئی ۔

جون ۱۸۶۶ء کے جلسہ میں تعلیمی کارروائیوں کے علاوہ ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی کہ "تھوڑا عرصہ گزرا نمائش گاہ پنجاب میں بہت سے نمونہ جات تمام ملک پنجاب کے صنائع بدائع اور آلات اور کل (مشینیں) اور اشیائے نباتاتی، حیوانی و معدنی عوام کو دکھائے گئے تھے۔ ان لوگوں کو حسب لیاقت انعام، اسناد اور تمغے ملے تھے اس سے ملک کو بہت فائدہ ہوا ہر شخص کا حوصلہ ترقی و تائید کی طرف بڑھا۔ اس طرح علم کو بھی ترقی ہوگی ۔

(یونیورسٹی کالج قائم ہونے کے فیصلہ کے بعد انجمن نے نمائش گاہ کی طرف بھی توجہ دی اور اس کے لئے ایک کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی نے بذریعہ اشتہار پنجاب کے تمام اضلاع اور دیہاتوں سے مختلف پیداواروں کے نمونے، صنعتی نمونے۔ دستکاری کی اشیاء وغیرہ کی نمائش کا بندوبست کیا)

نواب عبدالمجید خان کو منشی ہرسکھ رائے نے بتایا کہ پنجاب میں بہت سے عالم و فاضل عربی، فارسی، سنسکرت، بھاشا، اردو، گورمکھی وغیرہ کے موجود ہیں لیکن ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔

ڈاکٹر لائٹنر نے کہا" ایسے لوگوں کی تصانیف پیش کرنے کی تحریک کی جائے اور ان کا انتخاب سرکاری رپورٹ میں داخل کیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ نواب گورنر بہادر جو بڑے قدردان ہیں انکی قدردانی فرمائیں گے اور صلۂ لیاقت عطا فرمائیں گے۔ ورنہ انجمن کی طرف سے ان کی مدد کی جائے گی۔ لہٰذا صاحبان کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے توسل سے جملہ علماء و فضلاء اور صاحبانِ علم و ہنر کی فہرست منگائی جائے ۔

اس جلسہ میں ترقی تعلیم کمیٹی سے کہا گیا کہ وہ ایسے قواعد مقرر کریں جو سررشتہ تعلیم کے لئے مفید ہوں اور میڈیکل کمیٹی اس قسم کے قواعد ترتیب دے جو امراضِ وبائی یعنی تپ و ہیضہ، چیچک اور اسہال کے لئے کارآمد ہوں ۔ یہ تجاویز بعد انجمن کی منظوری کے چھاپی جائیں۔ اور گورنمنٹ میں بھیجی جائیں"۔

نواب عبدالمجید خان نے کہا" یہ باتیں انسان کے قابو سے باہر ہیں۔ چالیس برس ہوئے عہد خالصہ میں لاہور اور امرتسر کے بازار کیچڑ سے ازبس متعفن رہتے تھے۔ ہاتھی کے سوار پر بازار کی چھینٹ پہنچتی تھی۔ مگر اب یہ وبائیں باوجود ہر طرح کی صفائی، کوچوں اور مکانوں کی

آراستگی اور ڈاکٹروں کی افراط کے ہر سال نازل ہوتی ہیں۔ زمانۂ سابق میں یہ بات نہ تھی۔ اگر کہیں صفائی خاطر خواہ نہ ہوتی یا تشخیص معالجہ میں قصور ہے تو خلافِ عقل ہے۔ اب جو مرض چیچک وبائی صورت میں ظاہر ہوا ہے وہ کبھی نہیں ہوا کسی کتاب میں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ مرض وبائی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسے مرضیٔ الٰہی سمجھنا چاہیے۔ اس تقریر سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کسی طرح عاری ہیں۔ ہم کمیٹی میں شامل ہونے اور امداد دینے کے لئے مستعد ہیں اور جو قواعد ہماری کتابوں میں حفظِ صحت کے مقرر ہیں وہ ہم بوجہ احسن لکھ کر دیں گے اور جو حاصل سبب ایسے امراض کے پیدا ہونے اور ان کی مدافعت اور رفاہیت کے ہیں وہ مفصل بیان کریں گے، سب ممبران اس بات سے خوش ہوئے۔

ڈاکٹر لائٹنر نے کہا "میڈیکل کمیٹی میں بطورِ خاص ڈاکٹر براؤن اور دیگر یورپین ڈاکٹروں کو بھی شامل کیا جائے۔

اس جلسہ میں خفیہ رائے دینے کا طریقہ بھی مرتب کیا گیا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے کہا "بعض معاملات میں اعلانیہ رائے دینے پر تامل ہوتا ہے۔ ہر ممبر سیاہ و سفید گولیاں اپنے پاس رکھے انکار کی حالت میں سیاہ اور اتفاق کی صورت میں سفید گولی ایک ظرف میں ڈال دی جائے آخر میں سب گولیاں نکال کر شمار کر لی جائیں جو گولیاں زیادہ ہوں انکو غلبۂ آرا سمجھیں۔"

اس معاملہ میں بہت بحث ہوئی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ جب کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کی نسبت بظاہر رائے دینے میں بہتوں کو تامل ہو تو گولیوں کا استعمال کیا جائے۔

ڈاکٹر لائٹنر کے ایماء پر حساب کتاب دیکھنے کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی۔

(۱) <u>اگست، ۱۸۶۶ء (جلسہ عام)</u>۔ (۲)

اگست کی ابتدائی تاریخوں میں جلسہ عام منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں ایجوکیشنل کمیٹی کے ممبر بھی موجود تھے۔ لہٰذا طے کیا گیا کہ بہت جلد کالج کھولنے کا انتظام کیا جائے۔ ایجوکیشنل کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ یونیورسٹی کالج میں کیا کیا چیزیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اسکی رپورٹ

---

(۱)۔ جولائی کا پرچہ موجود نہیں تھا۔ (مقالہ نگار)

(۲)۔ رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۱۲، جلد ۲، بابت ماہ اگست ۱۸۶۶ء در مطبع کوہ نور، لاہور میں منشی ہرسکھ رائے چھپا۔

انسپکٹر یا ڈائریکٹر کو دیا کریں۔ اگر تبدیلی کی ضرورت ہو تو اس کی اطلاع معہ تدبیر و ترقی معہ رائے افسران سررشتہ کو دیں اور حکام متعلقہ اگر ماہانہ رپورٹ خود ملاحظہ کریں تو مناسب ترقی ہو سکتی ہے۔

جب تک کوئی پروفیسر اردو کے لئے مقرر ہو مولوی علمدار حسین لیکچر دیا کریں۔ دفتر میں ۲ دو مرتبہ ایک گھنٹہ تک۔

ضلع گجرات میں انجمن کی شاخ قائم کی گئی اور اس کے تیرہ ممبر بنائے گئے۔ جناب ایڈورڈ باسک اس کے پریسیڈنٹ مقرر کئے گئے اور طے کیا گیا کہ وہاں کے کتب خانے کے لئے کتابیں جمع کی جائیں۔

فارنگٹن صاحب نے تاریخ سندھ انجمن کے کتب خانے کے لئے دی اور ڈاکٹر لائٹنر نے مندرجہ ذیل کتابیں عطیہ میں دیں:

(۱) لغات پنجابی ایک جلد، (۲) صرف و نحو از مولوی عبداللہ دو حصے، (۳) الف لیلیٰ مطبوعہ جرمنی چار جلدیں، (۴) الف لیلیٰ کلکتہ دو جلد، (۵) تاریخ مسعودی ایک جلد، (۶) تاریخ یمینی ایک جلد، (۷) احوالِ پارسیاں (انگریزی) دو جلد، (۸) امثال لقمان عربی، مطبوعہ جرمنی، ایک جلد، (۹) مقامات حریری تین جلد، (۱۰) فرائض بزبان عربی ایک جلد، (۱۱) مثنوی ایجاد رنگین ایک جلد، (۱۲) رسالہ مصنفہ بابو شیاما چرن ایک جلد، (۱۳) قصہ بہرام گور ایک جلد، (۱۴) زبور لاطینی ایک جلد، (۱۵) باغ و بہار ایک جلد، (۱۶) اردو گرامر اسکرپٹ ایک جلد، (۱۷) جغرافیہ وسط ایشیا فارسی ایک جلد، (۱۸) نحو مطبوعہ جرمنی ایک جلد، (۱۹) سفر نامہ اسپین چند ایک جلد، (۲۰) صرف و نحو معہ رسائل، (۲۱) مسلم الادب ایک جلد، (۲۲) ہدایت نامہ مدارس تعلیم ایک جلد اور (۲۳) پریم ساگر ایک جلد۔

یہ بھی طے کیا گیا کہ انجمن سے متعلق اہم امور میں ان ممبر حضرات سے بھی مشورہ طلب کیا جائے جو بیرون ملک ہیں پھر ان کے مشورے پر بحث کر کے ان مشوروں پر عمل کیا جائے۔

اب انجمن نے چونکہ مستقل صورت اختیار کرلی ہے لہٰذا اب انجمن کی مجوزہ رپورٹیں گورنمنٹ کو بھیجی جائیں۔

رسالہ انگریزی آرٹیکل منگوا کر اس میں سے عمدہ اور کارآمد مضامین رسالہ انجمن میں شائع کئے جائیں۔

اردو، ہندی، عربی زبان کے قواعد جو کمیٹی نے پیش کئے وہ منظور ہوئے اور ان قواعد اور دیوان سودا کو چھاپنے کے لئے تجویز منظور ہوئی۔

مسٹر اسٹین نے یونیورسٹی کالج میں اگست کے مہینہ میں جو لیکچر یونیورسٹی کالج میں دیئے وہ یہ ہیں :۔

۱ ـــ لیکچر دربیان کرۂ زمین، یکم اگست، ۱۸۶۶ء یوم چہار شنبہ
۲ ـــ لیکچر دربیان کرۂ زمین، ۳ر اگست، ۱۸۶۶ء، یوم جمعہ
۳ ـــ لیکچر دربیان کرۂ زمین، ۸ر اگست، ۱۸۶۶ء، یوم چہارشنبہ
۴ ـــ لیکچر دربیان کرۂ زمین، ۱۰ر اگست، ۱۸۶۶ء، یوم جمعہ
۵ ـــ لیکچر دربیان ملک آئرلینڈ، ۱۵ر اگست، ۱۸۶۶ء، یوم چہارشنبہ
۶ ـــ لیکچر دربیان ملک انگلستان، ۲۲ر اگست، ۱۸۶۶ء، یوم چہارشنبہ
۷ ـــ لیکچر دربیان ملک ویلز، ۲۴ر اگست، ۱۸۶۶ء، یوم جمعہ
۸ ـــ لیکچر دربیان ملک اسکاٹ لینڈ، ۲۹ر اگست، ۱۸۶۶ء، یوم چہارشنبہ
۹ ـــ لیکچر دربیان ہادی التعلیم درباب احسن طریقہ تعلیم و ترقی علم و عمل

۱۱ر ستمبر، ۱۸۶۶ء، یوم سہ شنبہ :۔ (۱)

اس جلسہ میں ایجوکیشنل کمیٹی کے ممبران بھی موجود تھے۔ آج کے جلسہ میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے آئے ہوئے رسائل اور کتابیں پیش ہوئیں جو انجمن کے کتب خانے میں رکھدی گئیں۔ ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے :

۱ رسالہ تاریخ ہندوستان از علی گڑھ سوسائٹی،
۲ رسالہ بہ مفید عام جسے محمد عظیم صاحب میرٹھی نے تحریر کیا،
۳ مخزن العلوم از سوسائٹی بریلی بابت ماہ جولائی، ۱۸۶۶ء،
۴ اخبار عالم و میرٹھ گزٹ از میرٹھ،
۵ مخزن الفوائد درباب اصطلاحات و محاورات زبان اردو از مولوی علمدار حسین،

---

(۱) رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۱۳ جلد ۲ بابت ماہ ستمبر ۱۸۶۶ء در مطبع کوہ نور، لاہور میں زیر نگرانی منشی ہرسکھ رائے چھپا

۶ رسالہ درباب معالجہ چیچک از فقیر شجاع الدین،

۷ سوسائٹی ہارٹ ایگری کلچرل پنجاب از ابتدائے جنوری لغایت جون، ۱۸۶۶ء، اور

۸ کتاب اصول حکمت از پنڈت دھرم نرائن۔

تفصیل انعام زبان ہائے دیسی بابت سنہ ۱۸۶۶ء

انعام	بابت سال گزشتہ	از یونیورسٹی بابت سال حال	چندہ	
عربی	۱۵۰/=	۱۵۰/=	۱۰/=	محمد برکت علی خان تحصیلدار
			۲۰/=	منشی ہرسکھ رائے
سنسکرت	۱۵۰/=	۱۵۰/=	۱۰/=	پنڈت رادھا کشن
فارسی	۸۰/=	۱۰۰/=	۵۰/=	مسٹر بیڈن پاول
			۲۰/=	بابو چندر ناتھ
ہندی بھاشا	۸۰/=	۵۰/=	۱۰/=	بابو شیاما چرن
گورمکھی	×	۵۰/=	۲۰/=	رائے مول سنگھ
اردو	۸۰/=	۱۰۰/=	۱۰/=	پول صاحب
			۱۰/=	محمد برکت علی خان
میزان	۱۴۰/=	۶۰۰/=	۱۵۰/=	

۴ اکتوبر ۱۸۶۶ء (اجلاس عام)(۱)

آج کے جلسہ میں یہ فیصلہ ہوا کہ ایک جدید اسکول جو محلہ اچھو والی میں قائم ہو چکا ہے، وہاں دو سو طالب علم پڑھ رہے ہیں اس مدرسہ کو یونیورسٹی اپنی تحویل میں لے کیونکہ یونیورسٹی کا منشا ہی یہ ہے کہ علم ہیئت، ہندسہ وغیرہ بذریعہ زبان دیسی پڑھائے جائیں اور انگریزی، عربی، سنسکرت و فارسی وغیرہ کی تعلیم میں اس مدرسہ کے ذریعہ ترقی دی جا رہی ہے۔ یہ یونیورسٹی کی منشا کے عین مطابق ہے۔ یہ درخواست گورنمنٹ کو بھیج دی گئی۔

---

(۱) رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۴، جلد ۳، بابت ماہ اکتوبر ۱۸۶۶ء مرتبہ سیکرٹری مطبع کوہ نور لاہور باہتمام منشی ہرنرائن میں چھپا۔

۹ ؍اکتوبر ۱۸۶۶ء (میڈیکل کمیٹی کا جلسہ):

میڈیکل کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ اس کمیٹی کا جلسہ ہر مہینے کے سہ شنبہ کو ہوتا ہے۔ اور اسی دن کمیٹی میوہ جات کا بھی جلسہ ہوتا ہے۔ لہذا طے کیا گیا کہ میڈیکل کمیٹی کا جلسہ چہار شنبہ کے دن ہوا کرے یہ تجویز منظور ہوئی۔

۱۷ ؍اکتوبر ۱۸۶۶ء (جلسہ عام):

اس تاریخ جلسہ عام منعقد ہوا۔ میجر لیس نے قرآن شریف مع تفسیر اور ایک گرنتھ صاحب قلمی نسخہ، منشی ہرسکھ رائے نے ایک جلد گرنتھ صاحب انجمن کو پیش کی۔

آج کے جلسہ میں بیڈن پاول نے اعلان کیا کہ جتنا چندہ جمع ہوگا اتنی ہی رقم حکومت بھی دے گی۔

پرنس آف ویلز کا خط ڈاکٹر لائٹنر نے پڑھ کر سنایا جس میں تحریر تھا کہ ہمیں اس یونیورسٹی کے قائم ہونے سے نہایت خوشی ہوئی کیوں کہ اس میں دیسی علوم کو ترقی ہوگی۔ ڈاکٹر لائٹنر نے کہا کہ ہمارا منشا یہ ہے کہ زبان عربی و سنسکرت اور فارسی کی بنیاد رکھی جائے اور اس بنیاد پر علم انگریزی بذریعہ زبان اردو پڑھایا جائے۔

ڈاکٹر لائٹنر نے بتایا کہ پرنس آف ویلز انجمن کی مدد کے لئے تیار ہیں۔ وہ انجمن کو کتابیں بھی تحفہ میں دیں گے۔ اگر انجمن چاہے تو فارسی اور گورمکھی میں انجمن کے دروازے پر سنہری حروف میں اس کا نام لکھ کر آویزاں کیا جائے۔

فقیر شمس الدین نے کہا کہ یونیورسٹی کا مقصد انگریزی زبان کی ترقی نہیں بلکہ دیسی زبانوں کو ترقی دینا ہے لہذا دیسی زبانوں کی ترویج و اشاعت پر زیادہ زور دیا جائے نہ کہ انگریزی پر۔ لہٰذا اس سلسلہ میں جو مشکلات در پیش ہیں ان کو رفع کیا جائے اور جدید نصاب تیار کیا جائے۔ پریذیڈنٹ نے کہا کہ تین ہندو اور تین مسلمان آپس میں مشورہ کر کے تجاویز پیش کریں۔

۲۰ ؍نومبر ۱۸۶۶ء (جلسہ عام): (۱)

گوجرانوالہ میں انجمن کی شاخ قائم ہوئی۔

---

(۱) رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۱۵، جلد ۲، بابت ماہ نومبر ۱۸۶۶ء، در مطبع کوہ نور زیر نگرانی منشی ہرنرائن۔

۱۔ یہ طے کیا گیا کہ مسٹر اسٹین (اسٹینز) اور مولوی علمدار حسین ہفتہ میں تین تین لیکچر دیا کریں۔
۲۔ کالج یونیورسٹی کی عمارت کا نقشہ پیش ہوا۔
۳۔ یونیورسٹی کی امداد کے لئے مضمون پڑھا گیا۔
۴۔ کتاب مہر نبوت مرسلہ مردان علی اور پند نامہ شادولی فارسی وانگریزی مالک مطبع کوہ نور نے پیش کی۔
۵۔ رسالہ کیمیائے زراعت میاں نبی بخش باغبان کو دیا گیا کہ وہ اس رسالہ پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔
۶۔ فن زراعت پر جو انعامات دیئے گئے تھے ان کی انگریزی میں فہرست پیش ہوئی۔
۷۔ ہدایت نامہ پولیس مؤلفہ سر منٹگمری۔ کتاب آرام اہتمی مرسلہ عبداللہ۔ رسالہ تاریخ ہندوستان اور سوسائٹی علی گڈھ، مخزن العلوم بریلی۔ انگریزی کی کتابوں کی نو جلدیں گرامی ٹیکا اربیکا۔ ریکارڈس آف دی گورنمنٹ، ریکارڈس آف دی گورنمنٹ آف انڈیا۔ بریشین گلف سیکرٹری جی۔ پروڈس آف سندھ۔ پرل آف دی اسٹیم برائٹ آف دی پارلسٹ آف بغداد انڈیا۔ مشن ٹو قندھار انجمن کو پیش کی گئیں۔

فقیر جمال الدین نے ایک مضمون "درباب بلوچ صلگی" پڑھا۔ اور مضمون "مفید العام (بین الاقوامی شہرت یافتہ حکما)" پڑھا گیا۔

نومبر میں جو لیکچر دیئے گئے مندرجہ ذیل ہیں: (۱)

۱ ــــ لیکچر درباب مختصر حال تمام دنیا، ۷؍ نومبر ۱۸۶۶ء
۲ ــــ لیکچر درباب مختصر حال تمام دنیا، ۱۳؍ نومبر ۱۸۶۶ء
۳ ــــ لیکچر درباب مختصر حال تمام دنیا، (تاریخ صاف نہیں لکھی)
۴ ــــ لیکچر درباب مختصر حال تمام دنیا، ۱۷؍ نومبر ۱۸۶۶ء
۵ ــــ لیکچر درباب مختصر حال تمام دنیا، ۲۷؍ نومبر ۱۸۶۶ء
۶ ــــ لیکچر درباب مختصر حال تمام دنیا، ۳۰؍ نومبر ۱۸۶۶ء

---

(۱) رسالہ میں لیکچر دینے والے کا نام موجود نہیں۔ لیکن چونکہ اکتوبر میں طے کیا گیا تھا کہ سر اورل اسٹین (SIR AURAL STIEN) صاحب بھی لیکچر دیا کریں گے، لہٰذا اندازہ یہی ہے کہ یہ ان ہی کے لیکچر ہیں۔ (مقالہ نگار)

۱۸ دسمبر ۱۸۶۶ء (جلسہ عام):

پرنسپل بی بریرٹن برٹش میوزیم نے لندن سے انجمن قائم ہونے پر مبارکباد پیش کی اور رسالہ انجمن پنجاب جاری کرنے کی ہدایت کی۔

انجمن پنجاب ۱۸۶۵ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک اورینٹیل یونیورسٹی کے قیام کے لئے سرگرداں رہی۔ انجمن کے اراکین دامے، درمے، سخنے ہر طرح اس کوشش میں ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائیڈ کے ساتھ منہمک رہے۔ لیکن انجمن کے قیام کا مقصد صرف تعلیم ہی تک محدود نہیں تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشی اور تمدنی مسائل بھی زیر نظر تھے۔ اس سلسلہ میں ماہرین اپنے مسائل اور ان کے حل انجمن کے خاص اور عام جلسوں میں پیش کرتے رہے۔

۱۸۶۶ء میں سب سے پہلے زرعی زمینوں پر کسانوں کو مستقل قبضہ دیا گیا اور ان کے مالکانہ حقوق تسلیم کئے گئے۔ نمبرداروں اور پٹواریوں کے لئے قوانین مرتب کئے گئے اور انہیں شائع کرکے ہر قصبہ اور دیہات میں نافذ کیا گیا۔ رسل و رسائل کی آسانی کے لئے پرانی اور نئی سڑکوں کو شہروں سے ملا دیا گیا۔ ڈاک کا انتظام مکمل طور پر کیا گیا اور اس کا محکمہ قائم کیا گیا۔

اورینٹیل یونیورسٹی کے لئے چندے کی فراہمی کے لئے ۱۳ اکتوبر ۱۸۶۷ء میں امرتسر میں ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جس میں امرتسر کے کمشنر فارکیٹن صاحب، گریفن صاحب اور دیگر سردار، رؤسا، ذیلدار، نمبردار شامل ہوئے۔ اس جلسہ میں یہ طے کیا گیا کہ ملک میں علوم قدیمہ کے زندہ کرنے کی ترکیب کے سلسلہ میں پانچ روپے فی ذیلدار، ایک روپیہ فی نمبردار ماہانہ چندہ دیں گے۔ جن لوگوں نے اس جلسہ میں تقریریں کیں مندرجہ بالا اشخاص کے علاوہ کپتان ہالرائیڈ، ڈاکٹر لائٹنر، آنریری سیکرٹری یونیورسٹی، سردار شمشیر سنگھ، ڈپٹی محمد حیات صاحب، اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور، رائے مول سنگھ صاحب، سید شمس الدین خان، جناب جان محمد صاحب، منشی گوبند سہائے شامل تھے اور اس طرح ایک لاکھ روپے سالانہ یک مشت جمع ہوئے۔

۳۱ مارچ ۱۸۶۷ء میں کمیٹی کے ارکان نے طے کیا کہ یونیورسٹی لاہور میں قائم کی جائے۔

۱۸۶۷ء میں "دختر کشی" کے عنوان سے مضامین لکھنے کی دعوت عام دی گئی۔ تاکہ یہ مضامین انجمن کے جلسہ میں پڑھے جائیں اور عوام اس قبیح رسم کو چھوڑ دیں۔ لہٰذا ہندی میں پنڈت پرکاش سرسکہ، پنڈت پھامدت، پنڈت دیارام، پنڈت کرپارام صاحب برتانت کے مضامین موصول ہوئے۔ اردو میں محمد حسین صاحب، پنڈت دھرم نرائن، مولوی سید مہدی حسین

منشی رجولال، منشی محمد علی، سید مقرب علی، مولوی عبداللہ، منشی غلام حسین رئیس، بابو قندہاری صاحب، محمد یار خان، محمد وزیر علی خان، سید آل حسن صاحب، پنڈت شیونرائن، رضا حسن صاحب، سید محمد تقی صاحب، محمد مظہر حق صاحب، سید آفتاب علی، دلارام صاحب، سید یوسف مرزا صاحب، محمد حسن صاحب، محمد ارتضیٰ خان، مولوی قادر بخش صاحبان کے مضامین وصول ہوئے۔

۱۴ دسمبر ۱۸۶۸ء میں کپتان ہالرائیڈ نے ڈاکٹر لائٹز کو سنسکرت کو رواج دینے کی تجویز بھیجی۔ ڈاکٹر لائٹز نے کپتان ہالرائیڈ کو انجمن کے مشورے سے جواب بھیجا جس کا متن اور اعتراض رسالہ انجمن پنجاب کی پانچویں جلد، بابت ماہ جنوری ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ "کہ یہ کام کسی ایک آدمی کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ جرمنی کے پروفیسر افریچٹ نے دس برس کی عرق ریزی کے بعد سنسکرت کی قلمی کتابوں کی فہرست تیار کی تھی۔ مذکورہ پروفیسر نے ایڈنبرگ میں مقرر ہونے سے قبل آکسفورڈ میں بھی کام کیا تھا لیکن یہ واضح نہیں ہو سکا کہ اس کا دستور العمل کیا تھا۔ سٹوکس صاحب نے ہندوستان کو اس قابل نہ سمجھا کہ فہرست تیار کرنے میں وہ بھی مدد دے سکتے ہیں۔ انجمن کو یہ یقین ہے کہ اگر ہندوستانیوں سے مدد لی جائے تو بہتر ہے۔ یہ علم ان کی میراث ہے اور وہ اس علم کی طرف توجہ دینا چاہتے ہیں۔ کسی مضمون کی محض سرخیاں پڑھ لینا اس بات کی دلیل نہیں کہ سٹوکس صاحب اس علم میں ماہر ہیں۔"

بظاہر سنسکرت کے علم کے احیاء کا خیال دیگر السنۂ شرقیہ کی ترقی کے ساتھ نہایت موزوں معلوم ہوتا ہے لیکن بابو نوبین چندر رائے کی ہندی نواز پالیسی کے پس منظر میں انگریزوں کی ہندوؤں کو مسلمانوں سے آگے بڑھانے کی یہ ایک اہم کوشش تھی۔

اس مشورے کے بعد پروسیڈنگ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنسکرت کی ترقی کے لئے گورنمنٹ نے خاص رقم کا تعین کیا تھا کیونکہ اسی پرچہ میں ایک اشتہار بھی موجود ہے کہ جن لوگوں کے پاس سنسکرت کے قلمی نسخے موجود ہوں وہ اس کی فہرست بھیجیں۔ قابلِ اشاعت کتابوں کو شائع کر کے ان کے مالکوں کو مالکانہ حقوق دیئے جائیں گے اور اس کے بعد درخواست کی گئی ہے کہ جس طرح سنسکرت کی کتابوں کی طباعت کے لئے جو رقم دی گئی ہے اسی طرح فارسی اور عربی کی کتابیں چھاپنے کے لئے بھی رقم منظور کی جائے۔ کیوں کہ اس ملک میں سنسکرت کی طرح عربی اور فارسی کی عمدہ کتابیں موجود ہیں۔

کپتان ہالرائیڈ خود ایک مستشرق تھے اور عربی اور فارسی کی اہمیت خواص وعوام میں ان زبانوں کی مقبولیت سے واقف تھے لیکن حکومت کی ہندو نواز پالیسی کے زیر اثر وہ صرف سنسکرت کے احیاء پر ہی رقم خرچ کرنے کے مجاز تھے۔ اسی لئے عربی اور فارسی کے احیاء کے لئے اور طباعت کے لئے رقم کی درخواست کرنی پڑی۔

اسی سال مس تلو لاہور آئیں اور زنانہ مدرسوں کا معائنہ کر کے تعلیم نسواں پر رپورٹ تیار کی جو ۳ر جنوری کے جلسہ میں پڑھ کر سنائی گئی۔ انہوں نے مزید زنانہ مدرسوں کے قیام پر زور دیا کیونکہ مدرسوں کی تعداد کم اور تعلیم ناقص تھی۔

۱۷ر فروری ۱۸۶۹ء کے جلسہ میں کرم الٰہی صاحب نے ایک مضمون "در باب ترقی علم ہیت" پڑھا۔ اس کے علاوہ دوسرے مضمون میں "در باب منافع اور فوائد علوم کے" عنوان سے نباتات، جمادات اور انگلستان میں نئی ایجادات سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اسی مہینہ میں تواریخ سے متعلق پانچ لیکچر سنائے گئے جو بخارا، سمرقند، روس سے متعلق تھے۔ ان لیکچروں کے ساتھ آفتاب اور زمین کے نقشے بنا کر سمجھایا گیا کہ دنیا گول ہے۔

۱۷ر فروری کے جلسہ میں طے کیا گیا کہ ان ممبروں نے جنہوں نے کسی نہ کسی طور پر انجمن کی خدمت کی ہے اگر ان کا انتقال ہو جائے تو اس کے متعلق تمام حالات درج کئے جائیں۔

بابو شیاما چرن کے انتقال پر پنڈت دیوی پرشاد کو سنسکرت کمیٹی کا ممبر بنایا گیا۔ رہنمائے پنجاب سیالکوٹ مطبوعہ ۱۸۶۸ء کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ سیالکوٹ میں انجمن کی شاخ پادری پائی سین اور ان کے رفقاء کی کوشش سے ترقی کر رہی ہے۔ اس کے جلسوں میں جو لیکچر دیئے گئے تھے وہ رسالہ انجمن پنجاب میں شائع ہوئے۔ (۱)

(۲) امین چند اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نے رشوت ستانی کے انسداد کے متعلق ایک مضمون ۲۴ر اپریل ۱۸۶۹ء کے جلسہ میں پڑھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہر کس و ناکس کو سرکاری ملازمت دیدی جاتی ہے۔ نہ اس کے چال چلن پر غور کیا جاتا ہے اور نہ خاندان کے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ تنخواہ ناکافی ہونے کی وجہ سے نہ تو وہ

---

(۱) یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان لیکچروں کے موضوعات کیا تھے؟ (مقالہ نگار)
(۲) رسالہ انجمن پنجاب، جلد ۵، اپریل ۱۸۶۹ء

آئندہ ترقی کر سکتا ہے اور نہ اپنے فرائض اطمینان بخش طریقہ پر سر انجام دے سکتا ہے کیونکہ اس کی تعلیم کا معیار بھی نہیں دیکھا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی رشوت لیتا ہے اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرتا ہے۔

۱۵ رمئی، ۱۸۶۹ء کی رپورٹ پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مہینہ میں ڈاکٹر لائٹنر چھٹی پر چلے گئے۔ اہلِ لاہور نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے سپاسنامے پیش کئے جن میں فقیر شجاع الدین پیش پیش تھے۔ ایک خط شہزادہ ویلس کے نام بھیجا گیا جس میں ڈاکٹر لائٹنر کی کوششوں کا اعتراف کیا گیا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اس جلسہ میں انجمن پنجاب کی چار سالہ رپورٹ پیش کی۔ کالج کے طلباء نے بھی ڈاکٹر لائٹنر کو سپاسنامہ پیش کیا۔

اس کارروائی کے بعد سول سروس کے امتحان کے نتیجہ کا اعلان کیا گیا۔ پھر دس مضامین پڑھے گئے جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(۱) صبح شام ہوا کھانے کو جانا، (۲) ایجاد عجیب، (۳) تار برقی، (۴) حصولِ علم کے لئے عالی ہمت رہنا، (۵) علم کہربائی، (۶) عبرتِ اہلِ ہند و پنجاب، (۷) حقوق آداب و محبت و صحبت، (۸) کمی محصول اخبار، (۹) رفاہ عام، (۱۰) کفایت شعاری۔"

(۲۰) ۸ رجون، ۱۸۶۹ء کے جلسہ کی روئداد سے معلوم ہوا کہ پہلے راجپوتانہ میں سوشل سائنس کانگریس قائم کی گئی تھی لیکن وہ کسی وجہ سے بند ہو گئی تھی۔ انجمن پنجاب کے قیام کے بعد اس ماہ کانگریس کو دوبارہ جاری کیا گیا اور اس کا تعلق انجمن سے استوار کیا گیا۔

برکت علی خان تحصیلدار لاہور نے ریلوے کی کمیٹی سے تجاویز کر کے ایک مسودہ انجمن کو پیش کیا جس میں عورتوں کو ریل گاڑی ڈبوں میں علیحدہ جگہ دینے کی درخواست کی گئی تھی اور ان تکالیف کا بھی ذکر کیا جو سفر کے دوران خواتین کو پیش آتی ہیں۔ برکت علی خان کی تجویز کو انجمن نے منظور کر لیا اور ایک ذیلی کمیٹی قائم کر کے اس تجویز پر عمل کیا گیا۔

اس ماہ انجمن کے مختلف جلسوں میں گیارہ مضامین پڑھے گئے:

(۱) جواہرات خیالات، (۲) تربیت اولاد از منشی نظام الدین، (۳) ترجمہ اخلاق ناصر (جزو)، (۴) حال کوہستان ہندوستان (HILL STATION)،

---

(۲۰) رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۶، جلد ۵، بابت ماہ جون ۱۸۶۹ء

(۵) علم ہیئت وقدرت ، (۶) آزادیٔ تجارت نے ہندوستان کو کیا بڑھایا ہے ، (۷) آرام طلبی اور مشقت کا بیان ، (۸) مضامین قابل توجہ سرکار بابت پنجاب لیٹنینسی ایکٹ ، (۹) پنجاب ریلوے ، (۱۰) دخانی جہاز ، (۱۱) بہبودیٔ ملک ۔

اس پرچے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایچ ۔ ای برکنسن صاحب کی سرکردگی میں ہوشیارپور میں انجمن کی شاخ قائم کی گئی اس کے علاوہ کانگڑہ ، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ میں بھی اس کی شاخیں قائم کی گئیں ۔

۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے جلسہ میں سید مہدی حسن نے مثنوی تنبیہ النفس سنائی دوسرا لیکچر شاہان انگلستان پر تھا ۔ تیسرا مضمون منشی کرم الٰہی نے چھاپہ خانے کی صنعت پر سنایا ۔ اس مضمون کا دوسرا حصہ ماہ نومبر میں مکمل کیا گیا ۔

انجمن پنجاب نے انگریزی اور فارسی کے الفاظ کا تلفظ درست کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی ۔ اس انجمن نے وہ تلفظ رائج کئے جو اب تک بولے جاتے ہیں ۔ لیکن چند امور پر غور کیا گیا اور ان کو درست مان کر منظور کر کے رائج کرنے پر زور دیا ۔ وہ یہ ہیں :

۱ ۔ جزم کی علامت اگر بالکل ترک کی جائے اور جس حرف پر کوئی حرکت نہ ہو اسے ساکن سمجھا جائے ۔

۲ ۔ ۔ الف ساکن کی آواز خود بھی ہے بس لفظ "فار" میں ف کے اوپر فتح اگر نہ بھی دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ۔

۳ ۔ لفظ بار میں "ب" کے نیچے ترچھا کسر چاہیئے کھڑا کسر نہیں چاہیئے ۔

۴ ۔ علیٰ ھذا القیاس تھینک کو ت ، ہ سے شروع کرنا چاہیئے ۔ یہی قاعدہ مروج ہے ۔ ت کے استعمال کی ضرورت نہیں ہے ۔ اگر یہ کہا جائے کہ ت ، ہ کی آواز اگر علیٰحدہ ظاہر کرنا ہو تو ایسے موقع پر با حرکت ہوگا اور شناخت کے لئے ہ کو دوچشمی (ھ) کے ساتھ "تھ" اس طرح لکھا جائے گا ۔

فضیلت علم پر طالب علموں کے درمیان مباحثہ ہوا تھا ۔ یہ عنوان اخبار عالم نے دیا تھا اس کی کارروائی نمبر ۵ ، مورخہ ۴ اکتوبر کے لارنس گزٹ میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی تھی ۔

اس مہینے میں جلوس سواری حضور ملکہ معظمہ وکٹوریہ اور لاہور یونیورسٹی پر مضامین کے علاوہ ۱۷ مضامین پڑھے گئے جو صنعت، سائنس، اخلاق، اخبارات اور جغرافیہ پر مشتمل ہیں۔

۱۸۶۹ء میں انجمن نے جو دیگر کام سرانجام دیئے ہیں وہ یہ ہیں:

حکومت کی مرضی کے مطابق انجمن نے پچاس روپے سے لے کر پانچ سو روپے تک انعامات ان مضمون نگاروں کو دیئے جنہوں نے امراضِ بچہ کی وجوہات اور علاج کے متعلق تحریر کئے۔ بہت سے مضامین اردو اور گورمکھی (مراد پنجابی) اور ہندی میں وصول ہوئے اور انجمن کی ایک منتخب شدہ مجلس نے تین انعامات بہترین مضمون نویسوں کو دیئے اور حکومت کو نتیجہ سے مطلع کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ اخذ کیا گیا،

۱۔ عالی خاندان ہونے کا غرور جو بعض سکھ برادری جو سوڈھی اور بیدی کہلاتے ہیں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض راجپوت قبیلوں اور مسلمانوں میں بھی یہ بے جا غرور موجود ہے۔

۲۔ کثیر اخراجات جو رواج کی پابندی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے حکومت کو تجاویز پیش کی گئیں جن میں سے اکثر حکومت نے منظور کر لیں اور دفعہ نمبر ۸، ۱۸۷۰ء میں ان کو نافذ کیا گیا۔

انجمن میں ہندی زبان کے اس مضمون کو جو تعلیم نسواں اور قبل از وقت شادی سے متعلق تھا اور جسے حکومت پنجاب نے خود بھیجا تھا بحث کی گئی۔ مضمون نگار نے تعلیم نسواں کی حمایت اور قبل از وقت شادی کی مخالفت کی تھی۔ شاستر سے اس کی دلیل پیش کی کہ شاستروں میں قبل از وقت شادی ممنوع ہے اس کے ترک کرنے سے عمدہ نتائج برآمد ہوں گے۔ خاص طور پر طوائفوں کی تعداد میں کمی ہو جائے گی جو اس وقت ایک اہم مسئلہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے

۳۔ شہزادہ ویلز جو انجمن پنجاب کے سرپرست ہیں انہوں نے اس انجمن کے مقاصد سے خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا۔

۴۔ ایک ذیلی کمیٹی آسامیوں کے حق کا مسودۂ قانون پر غور کرنے اور اس کے متعلق اطلاعات

فراہم کرنے کے لئے قائم کی گئی۔ اس کمیٹی نے پنجاب کے تمام علاقوں کا دورہ کرکے تحقیق کی اور اسی موضوع پر انجمن کے جلسوں میں مکمل مباحثہ کرکے اس کے نتائج شائع کئے۔

۵۔ حکام کی درخواست پر عورتوں کو ریل گاڑی کے ڈبوں میں جگہ دینے کے سوال پر غور کیا گیا اور اسے منظور کرکے ریلوے کے حکام کو مطلع کردیا گیا جس پر عمل کیا گیا۔

۶۔ ہندی میں ایک مضمون جس کو دہلی کے پنڈت بشمبھر ناتھ نے ہندو بیواؤں کے دوبارہ شادی کرنے اور قانونی جواز دینے کے متعلق پیش کیا تھا۔ انجمن میں اس پر بحث ہوئی اس سلسلہ میں نوبین چندر رائے نے ایک کتابچہ ہندی میں تحریر کیا جس میں یہ دلیل دی گئی تھی کہ ہندو شاستروں میں ہندو بیواؤں کی دوسری شادی کی اجازت ہے۔ یہ کتابچہ طبع کرکے پنجاب کے تمام اضلاع میں بھیج دیا گیا۔

۷۔ انجمن نے اس بات کی سفارش کی کہ اس ملک میں نمائندہ مجلس قائم کرنے کی مصلحت پر غور کیا جائے جو حکومت کو عوام کی خواہشات، ضروریات اور احساسات پیش کرسکے اور ان اصولوں اور تحریکات کو پیش کرکے تشریح و وضاحت کرسکے جو حکومت کی ملکی نظم و نسق کے لئے قوانین اور قواعد کے وضع کرنے میں پیش آئے۔ انجمن کی متعدد نشستوں میں یہ نکات زیر بحث آئے اس سلسلہ میں مقامی حکام نے جو سوالات کئے ان کو ان کے اراکین کے پاس بھیجا گیا۔ جو انجمن کے ممبر تو تھے لیکن ہندوستانی نہیں تھے یا ہندوستان سے باہر تھے تاکہ اس اہم نقطہ کے متعلق ان کی رائے معلوم ہوسکے ان کے جو جوابات موصول ہوئے انہیں رسالوں اور اخباروں میں شائع کرنے کے علاوہ انگریزی اور اردو میں کتابچہ کی شکل میں طبع کیا گیا اور عوام میں تقسیم کردیا گیا۔ اکثر اراکین ان آراء سے متفق تھے لیکن بعض کا خیال تھا کہ نمائندہ مجلس کا قائم ہونا قبل از وقت ہوگا جب تک ملک میں تعلیم عام نہ ہوجائے تاکہ ہر شخص اس امر کی اہمیت سے واقفیت رکھنے کے قابل ہوسکے۔

(۱) مسٹر ایچ۔ کننگھیم، ایڈووکیٹ گورنمنٹ پنجاب کے لیکچروں سے جنوری ۱۸۷۰ء کی ابتدا ہوئی۔ ان لیکچروں کے ترجمے ہر پرچہ میں شائع ہوتے رہے۔ پہلے لیکچر کا ایک حصہ ۸ صفحات

---

(۱) رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۵ جلد ۰، بابت ماہ جنوری ۱۸۷۰ء در مطبع ترلاس لاہور میں طبع ہوا۔

پر مشتمل ہے۔ اس کے کئی ذیلی عنوانات ہیں۔ عنوان جلی ہے "مختلف تعلیمی موضوعات پر لیکچروں کی ابتدا اور اس سے متعلق آئین وضوابط وضروریات۔" چوتھی فصل ان الواع کے بیان میں جو تحت اجناس فضائل کے ہیں۔

پانچویں فصل میں بیان اور حصر کرنا ان چیزوں کا جو ضد فضیلتوں کی ہیں جس کو رذائل کہتے ہیں۔ (ذکا، سرعت فہم صفائی ذہن، سہولت تعلیم، حسن تعقل، تحفظ تذکر۔)

مارچ ۱۸۷۰ء میں ڈاکٹر لائٹنر نے ٹی ڈی ایچ تھارنٹن، سیکریٹری گورنمنٹ پنجاب بمقام لاہور کو ایک خط لکھا جس میں تحریر کیا تھا کہ انگریز حکام انجمن کے دیسی عہدیداروں سے مناسب سلوک نہیں کرتے۔ ملاقات کے لئے بہت انتظار کرواتے ہیں اور انتظار خانے میں بیٹھنے کے لئے کوئی انتظام نہیں انہیں کئی کئی گھنٹے کھڑے ہو کر گزارنا پڑتے ہیں۔

اس خط کے جواب میں وعدہ کیا گیا کہ اہل فرنگ سے دوستانہ روابط کے لئے مناسب اقدام کیا جائے گا۔ اپریل ۱۸۷۰ء میں جغرافیہ سے متعلق لیکچر دیئے گئے۔

مسٹر ایچ کننگھم کے لیکچر کا بقیہ حصہ ان عنوانات کے تحت:

(الف) آداب کلام کرنے کے،

(ب) آداب حرکت وسکون کرنے کے،

(ج) کھانا کھانے کے آداب، اور

(د) شراب پینے کے آداب۔

مئی کے پرچے میں اسی مقالے کے چھ اور حصے شائع ہوئے جن کے عنوانات یہ ہیں:

"دوسری فصل میں طریق دریافت کرنے سیاست اور تدبر مال اور روزگار کے بیان میں تیسری فصل دریافت کرنے سیاست اور تدبیر گھر کی عورت کے۔ چوتھی فصل سیاست اور تدبر اولاد میں۔"

ڈاکٹر لائٹنر جو ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۰ء تک چھٹی پر انگلستان گئے تھے وہ واپس فروری میں آئے۔ ان کی جگہ مسٹر پول کام سنبھالے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے مسٹر پول گرلیفر کا شکریہ شکریہ ادا کیا اور انجمن کا کام پھر سے سنبھال لیا۔

محمد حیات خان جو انجمن کے بڑے سرگرم کارکن تھے ان کو ان کی خدمات کے صلے

میں تاحیات انجمن کا ممبر نامزد کیا گیا۔
محمد حیات خاں کے علاوہ مسٹر لیپل گریفن اور سوڈانلڈ میکلوڈ کو بھی تاحیات ممبر چُنا گیا۔ مسٹر میکلوڈ نے وعدہ کیا کہ وہ لندن جاکر بھی انجمن کی اعانت کرتے رہیں گے۔ مسٹر بکیس ملر نے لندن سے گرنتھ صاحب کے ترجمہ کی فرمائش کی۔

(۱) انجمن نے رفتہ رفتہ سیاسی اور سماجی ذمہ داریاں بھی قبول کرلی تھیں۔ اب ڈاکٹر لائٹنر نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے ہر صوبے میں جو ایکٹ نافذ کئے جاتے ہیں ان کا اردو ترجمہ کیا جائے اور انہیں طبع کرکے تقسیم کیا جائے۔ بظاہر یہ بات اہم نہیں معلوم ہوتی لیکن انجمن پنجاب کی ہر دلعزیزی دیکھ کر گورنر ہند کو اپنے احکامات منوانے کے لئے انجمن پنجاب کا سہارا لینا پڑا کیونکہ اہلِ پنجاب کو انجمن پر بھروسہ تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انجمن کو چند انگریزوں اور بہت سے اہل ہند حضرات کی اعانت حاصل تھی جن کے خلوص پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔
شہر اور دیہاتوں میں اکثر وبائی امراض خاص طور پر چیچک پھیل جاتی تھی۔ عوام چیچک کے ٹیکوں سے مانوس نہیں تھے۔ یہ ان کے لئے نئی چیز تھی لہٰذا وہ ٹیکے نہیں لگواتے تھے۔ انجمن پنجاب نے اس مہینے چیچک کے ٹیکے سے متعلق ایک اشتہار جاری کیا۔
اس طرح "قحط سال دور کرنے کی تدابیر" کے عنوان سے مضمون پڑھا گیا تاکہ لوگوں کو اگر اس قسم کا خطرہ درپیش ہو تو اس کی پیش بندی کرسکیں اور اس کے مقابلے کے لئے تیار ہوسکیں۔
اس ماہ لندن سے انجمن کو جو کتابیں موصول ہوئیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) اصطلاحی ناموں کی ڈکشنری از پیٹرن صاحب (۲) سماوید از اسٹون (۳) فاہیان کا سفر، (۴) روشنیہ فرقہ از لیڈن صاحب، (۵) مہمان ولسنو، (۶) تواریخ متقدمین مصر از گلیڈن صاحب، (۷) مصری ہیروگلی فک یعنی علاماتی حروف، (۸) مصری ممیاں، (۹) بیان واقعاتِ نیپال، (۱۰) تواریخ سکھان تصنیف کیننس ہیل، (۱۱) بیجا کرابیکا تصنیف مسٹر تیسیجی، (۱۲) فی بزلیس صاحب کی عربی گرامر، (۱۳) ترجمہ مقامات حریری، (۱۴) شلوک ہائے نے مننا، (۱۵) شلوک ہادیدنتا، (۱۶) بی لنس ٹائن کی سنسکرت گرامر، (۱۷) گیری صاحب کی سنسکرت گرامر، (۱۸) ترجمہ سنکیا کیری کا، (۱۹) وگ دید ولس صاحب کے، (۲۰) راجہ بال بنگال، (۲۱) انگریزی ترجمہ دابستان۔

---

(۱) رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۶، جلد نمبر ۶، بابت ماہ جون، ۱۸۷۰ء

۱۵ر جون ۱۸۷۰ء کو دو مضامین جلسہ میں پڑھے گئے :

۱۔ خدمت گاروں اور غلاموں کی سیاست کا بیان ، اور

۲۔ سیاست مدن۔ پہلی فصل "سبب احتیاج خلقت کا تمدن کی طرف"

اس میں سیاست مدن کی ماہیت اور فضیلت کا بیان ہے ۔ (۱)

اگست میں "سراج الہدایت" کے نام سے کتاب کی دو جلدیں مصنفہ معلمہ حسن جان بیگم موصول ہوئیں۔

بابو بین چند رائے اور مولوی محمد حسین کو ہدایت کی گئی کہ اس کے متعلق فیصلہ کرکے بتائیں کہ یہ تعلیم نسواں کے لائق ہے یا نہیں ۔

سیاست مدن کی دوسری فصل اسی ماہ رسالہ میں شائع ہوئی۔ عنوان ہے :

"فضیلت محبت اور اقسام اس کی بیان ہے کہ پیوند اور رابطہ اجتماعات کا محبت کے ذریعہ ہوتا ہے"

۱۸ر اگست کے جلسہ میں اس مقالہ کا تیسرا حصّہ پڑھ کر سنایا گیا۔

۳۰ر ستمبر کو ایک تجویز منظور ہوئی کہ سرمایہ داروں سے قحط سالی کے لئے چندہ جمع کیا جائے اور میونسپل کمیٹی بھی اس میں چندہ دے۔

'ایسٹ انڈین ایسوی ایشن' جس کے ممبر پنڈت من پھول کے بیٹے سورج مل تھے' اطلاع دی کہ ۲۷ر جولائی ۱۸۷۰ء میں یہ تجویز قرار پائی ہے کہ پارلیمنٹ میں درخواست دی جائے کہ چند منتخب کمیٹیاں اس غرض سے مقرر ہوں جو ہندوستان کے عام انتظام خصوصاً امور متعلقہ مالیات کی تحقیق کریں۔ اس درخواست کو پورے ہندوستان میں شائع کیا جائے اور ایک عرضداشت پر زیادہ سے زیادہ دستخط لے کر پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس سے پہلے اس کو لندن روانہ کردیا جائے۔

یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ڈیوک آف ایڈنبرا کی ہندوستان میں آمد کی یادگار میں سررشتہ فن جہازرانی قائم کی جائے۔

آثار قدیمہ کو برقرار رکھنے کے لئے جو معافیاں ٹھاکروں ، درگاہوں اور خیرات خانوں

---

(۱) یہ مقالہ کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ (مقالہ نگار)

کی مقرر کی ہیں اور جو نذر نیاز چڑھائی جاتی ہیں ان کے لئے کمیٹیاں بنائی جائیں اور آثار قدیمہ کی حفاظت کی جائے۔

انکم ٹیکس اور لائسنس بذریعہ پنچایت وصول کرنے کی درخواست گورنمنٹ کو دی جائے۔

اخبارات اور کتابوں پر محصول اسی طرح کم کیا جائے جس طرح یورپ میں کم کیا جاتا ہے۔

یہ حکم بھی جاری کیا جائے کہ وید اور حکیم بغیر امتحان پاس کئے علاج نہ کریں اور ادویات فروخت کرنے کے لئے لائسنس جاری کئے جائیں۔ اس کے علاوہ ادویات کی جانچ کی جائے۔

اس جلسہ میں کئی مضمون پڑھے گئے:

۱- مضمون کرۂ ارض، معہ نقشہ جات،

۲- فاسفورس کا بیان،

۳- فضول خرچی شادیوں کی،

۴- جلوس سواری حضور ملکۂ معظمہ وکٹوریہ - یہ مضمون سر سید احمد خاں نے بھیجا تھا۔

۵- نہر سوئز (سفرنامہ سے اقتباس' (اردو گائیڈ کے مہتمم از ذخیرہ بالگوبند)

ستمبر، ۱۸۷۰ء کے جلسہ میں نارمل اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر منشی ذکاء اللہ کا مضمون اسٹیم یعنی بخارات پڑھا گیا۔

۱۷ اکتوبر، ۱۸۷۰ء کے جلسہ میں جالندھر کے میلہ کی تجارت کے متعلق مضمون پڑھا گیا۔ اس کے بعد رئیسوں، تاجروں اور نمبرداروں کی طرف سے مسٹر ای ای پرنسپ کمشنر و پریذیڈنٹ میر مجلس میلہ تجارت جالندھر کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔

جواب میں ای ای پرنسپ نے میلوں کے ذریعہ تجارت بڑھانے کی حوصلا افزائی کی۔

۱۹ جنوری، ۱۸۷۱ء کو پہلے نہر سوئز کے مضمون کا دوسرا حصہ پڑھا گیا۔ اس کے بعد مولوی محمد حسین نے تاریخ ہند کے دو باب پیش کئے۔ ان کے بعد سیاست مدن کا تیسرا حصہ پڑھ کر سنایا گیا جس کا عنوان "فضیلت محبت اور اقسام" تھا۔

۲۰ فروری، ۱۸۷۱ء کے جلسہ میں یہ طے کیا گیا کہ ڈاکٹر رحیم اور حکیم حسام الدین طب یونانی اور ڈاکٹری سے متعلق انجمن میں لیکچر دیا کریں۔ اس کے بعد مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق تجاویز پیش کی گئیں جو پچھلے صفحات میں لکھی جا چکی ہیں۔

مولوی محمد حسین نے آج کے جلسہ میں تاریخ ہند کا ایک باب بودھ مذہب کی ابتدا

پڑھا۔ اس کے علاوہ بچّوں کی صحت اور ان کی خفیف بیماریوں کے قاعدے بیان کیے گئے۔

علم مفیدہ میں قوس وقزح مع نقشہ جات، علم ہوا اور سیاست مدن پر مضمون پڑھے گئے۔ مارچ ۱۸۷۱ء میں انگریزی تعلیم کے رواج دینے کی تجویز کا خاکہ گورنمنٹ کو بھیجا گیا۔ کیونکہ گورنمنٹ ہند نے انگریزی تعلیم کے رواج دینے کی تجویزیں طلب کی تھیں۔ لچھمی نرائن نے اور مولوی خیرالدین ڈپٹی کلکٹر ضلع بریلی نے چیچک کے ٹیکہ کے فوائد پر اور ایک مضمون بخار پر پڑھے گئے۔

۱۸۷۱ء میں انجمن پنجاب میں جو مضامین پڑھے گئے وہ ضمیمہ میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس سال انجمن کی کارکردگی میں چند اہم امور کا اضافہ ہوا۔ وہ یہ ہیں؛

۱۔ انجمن کے جلسہ میں شہر کے حکیموں کو مدعو کیا گیا اور وہاں انہیں طبی لیکچر دیئے گئے۔

۲۔ پنجاب کے مالیاتی کمشنر سے ایک سوال نامہ موصول ہوا جس میں دریافت کیا گیا تھا کہ مقامی نوجوانوں کی عمر کی تصدیق کسطرح کی جاسکتی ہے۔ جواب میں ہندو اور مسلمانوں کی عمر کا صحیح طریقہ معلوم کرنے کی نشاندہی کی گئی اور تجویز پیش کی گئی کہ کارڈ جاری کرنے کا انتظام جاری کیا جائے جس میں بچہ کی تاریخ پیدائش درج ہو۔

۳۔ حکومت کو یادداشت پیش کی گئی اور درخواست کی گئی کہ انگریزی زبان کی تعلیم کو وسعت دی جائے اور اس زبان کا مطالعہ کرنے میں جو نقصان دہ رکاوٹیں موجود ہیں انہیں دور کیا جائے۔ حکومت نے اس موضوع پر غور وفکر کرنے کا وعدہ کیا۔

۴۔ اس سال لاہور میں صنعت وحرفت کا اسکول قائم کرنے پر انجمن میں کئی مباحثے ہوئے۔ میکلوڈ میموریل میں جو چندہ مقامی رؤسا نے دیا تھا اس رقم سے اسکول قائم کرنے کی درخواست ناظم سررشتہ تعلیم کو دی گئی اور حکومت سے بھی عطیہ کی درخواست کی۔ اس پر میجر ہالرائیڈ نے وعدہ کیا کہ اس منصوبے پر جب عمل ہوگا تو ایک ہزار روپیہ دیا جائے گا۔

۱۸۷۲ء انجمن کو حکومت پنجاب کی طرف سے ایک خط وصول ہوا جس میں دریافت کیا گیا تھا کہ اگر سررشتہ داروں کا تبادلہ کر دیا جائے تو کیا رشوت ستانی کا سدباب ہوسکتا ہے؟

جواب میں مندرجہ ذیل رائیں پیش کی گئیں ۔

۱) تبادلے سے ایک حد تک رشوت ستانی کا سد باب ہو سکتا ہے لیکن تبادلہ صرف ان ہی اشخاص کا ہونا چاہیئے جن کا طرزِ عمل مشتبہ ہو، ورنہ قانوناً اگر تمام سررشتہ داروں کو تبادلے کا ہدف بنا دیا گیا تو دیسی زبانوں کے ماہر افسران جو ایماندار اور قابلِ اعتماد ہیں ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی ۔

۲) یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ عدالتوں میں ازدواجی جھگڑوں کے متعلق فیصلے اکثر تسلی بخش ہوتے ہیں اور بعض حالتوں میں مقامی عوام کے جذبات کے خلاف ہوتے ہیں ۔ اس معاملہ کو دو ذیلی کمیٹیوں کے سپرد کیا گیا جو ہندو اور مسلمانوں پر مشتمل تھیں تاکہ اس موضوع پر اپنے عقائد کے مطابق رائے کا اظہار کر سکیں ۔ چنانچہ دو رپورٹیں تیار ہوئیں ایک منشی ہرسکھ رائے سے جو ہندو ذیلی کمیٹی کے سیکریٹری تھے اور دوسری منشی محمد لطیف سے جو مسلمانوں کی ذیلی کمیٹی کے سیکریٹری تھے ۔ طویل مباحثہ کے بعد حسب ذیل نتائج وضع کئے گئے :

"فیصلوں کی بسا اوقات غیر تشفی بخش ہونے کی وجہ ججوں کی ناتجربہ کاری ہے جن میں سے اکثر و بیشتر یورپی ہیں اور جو عوام کے طور طریقے ۔ اخلاق و عادات سے ناواقف ہیں اور خانگی معاملات اور ان کے خصائل کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے ۔ ان کا فیصلہ ذاتی یا اتفاقی ہوتا ہے ۔"

اس لئے انجمن نے مشورہ دیا کہ ایسے مقدمات کی سماعت کا اختیار اگر معزز اور تعلیم یافتہ مقامی عوام کے سپرد کیا جائے یا پنچایت کے سپرد کر دیا جائے (جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) تو بہت سے اعتراضات ختم ہو جائیں گے ۔

۳) حکومت نے ایک سوال پیش کیا کہ "مسلمان انگریزی تعلیم سے اتنے بہرہ ور کیوں نہیں ہوتے جس قدر ہندو ہوتے ہیں ؟" اس سوال پر مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا جن میں اکثریت کی رائے یہ تھی کہ ملک کی مسلمان آبادی کا زیادہ حصہ دکانداروں اور پیشہ وروں کا ہے ۔ وہ انگریزی تعلیم کے لئے اسقدر فکر مند نہیں جسقدر ہندو ہیں جو عام طور پر تجارت اور پیشوں سے متنفر ہیں اور اس لئے وہ اپنے ذریعۂ معاش کو صرف تعلیم سے حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔

۴) منشی محمد لطیف نے ایک طویل مضمون پڑھا جس میں اس ضرورت پر زور دیا تھا کہ حکومت جو قواعد اور ضوابط مرتب کرتی ہے اور جو احکامات جاری کرتی ہے وہ عوام اور

کاشتکاروں تک پہنچائے جائیں انجمن پنجاب نے اس رائے سے اتفاق کیا اور یہ مضمون حکومت کو بھیج دیا۔ حکومت نے اس کا جواب دیا جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ مضمون بہت دلچسپ ہے اس میں جو مفید تجاویز پیش کی گئی ہیں ان پر عمل کرنے کے لئے قوانین اور ضوابط کو اردو زبان میں ترجمہ کر کے نشر و اشاعت کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

۱۸۷۳ء۔ اس سال ڈاکٹر لائٹنر وطن گئے۔ انکو انجمن نے ایک تحفہ اور سپاسنامہ پیش کیا۔

۲۔ گورنر ہند کے سیکرٹری کا ایک خط انجمن کو موصول ہوا جس میں گرو گوبند سنگھ کے آدی گرنتھ کے ترجمہ کے متعلق تنقید کی درخواست کی گئی تھی اور یہ بھی دریافت کیا گیا تھا کہ سیاسی نقطۂ نظر سے آیا ادی گرنتھ کا مکمل ترجمہ فائدہ مند ہو گا یا اقتباسات۔ اس پر انجمن میں مباحثے ہوئے اور انجمن کا یہ تحریری فیصلہ بھیج دیا گیا۔

"آدی گرنتھ سکھ گروؤں اور شمالی ہندوستان کے چند مشہور بھگتوں کے حسنِ اخلاق اور نیک اعمال کے متعلق گیت ہیں۔ اس میں ہندو دھرم کا لبِ لباب موجود ہے۔ لیکن دینِ محمدی سے رابطہ قائم ہونے کے بعد اس میں اصول وضع کئے گئے۔ اگرچہ یہ کتاب سکھ یا کسی دوسری قوم کے سیاسی دستور العمل پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتی لیکن سکھوں کے کردار کو بہت حد تک ایک سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ کتاب کی زبان ہندوستان کی متفرق صوبائی زبانوں کا معجون مرکب ہے اور موجودہ پنجابی زبان سے اسی قدر مختلف ہے جیسے کہ کوئی اور زبان ہو سکتی ہے۔ اس میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو ایک پنجابی کے لئے ناقابلِ فہم ہیں بہت سے مرکب الفاظ اس قسم کے ہیں کہ ان سے مختلف مفہوم قبول کئے جا سکتے ہیں۔ اسی لئے گرنتھوں اور پنجاب کے پنڈتوں کے لئے ادبی بحث کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ ادبی لحاظ سے کتاب کا مکمل ترجمہ پسندیدہ ہے۔ اور غیر ملکیوں کو سکھوں کی مخصوص عادتوں کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے مخصوص حصّوں کا ترجمہ اور باقیات کا سرسری جائزہ کافی ہے (یہ آخری حصہ ڈاکٹر ڈرپ کے مشورے کا ہے)"۔

۳) اسی سال سر سید احمد خان اور ان کے رفقائے کار اور سید محمود محمڈن کالج کے فنڈ کے لئے چندہ فراہم کرنے لاہور آئے۔ سید محمود نے اپنا مشہور تعلیمی لیکچر دیا۔

۱۔ ۱۸۷۴ء۔ ڈاکٹر لائٹنر کی غیر موجودگی میں سٹرٹ۔ ڈبلیو پارکر صدر سے فرائض

انجام دے رہے تھے اسی سال مستعفی ہوئے اور جسٹس چارلس بولینو صدر منتخب ہوئے۔ اسی زمانہ میں خان بہادر محمد برکت علی خان اور بابو چندر ناتھ مترا کو سیکریٹری اور نائب سیکریٹری منتخب کیا گیا۔

۲۔ ایک خط ڈاکٹر لائٹنر کا موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کالج کے متعلق پوری رپورٹ شہزادہ ویلیس کی خدمت میں پیش کی۔ شہزادہ ویلیس انجمن پنجاب کے مربی تھے لہٰذا انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور انجمن کی خدمات کا اعتراف کیا۔

۳۔ ایک دلچسپ مقالہ جس میں جاگیرداری کا آغاز، دیہات کے عوام کے حقوق اور سرزمین روس میں مشترکہ رفاقت کے حقوق کی درجہ بدرجہ ترقی کے متعلق انجمن کے مختلف جلسوں میں پڑھا گیا۔ یہ مقالہ فرانسیسی زبان سے انگریزی میں چارلس بولنو نے ترجمہ کیا اور منشی محمد لطیف نے اردو زبان میں منتقل کیا۔

۴۔ حکومت پنجاب نے ایک فرقے کے متعلق جو راسدھاری یا ناچنے والے لڑکے کہلاتے ہیں، انجمن سے تحقیق کرنے کی درخواست کی۔ انجمن نے ایک ذیلی کمیٹی قائم کر کے اس فرقے کے متعلق معلومات فراہم کیں۔

۵۔ ۹ اپریل ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب نے جدید مشاعروں کی بنیاد رکھی۔(۱) ان مشاعروں کو رسالہ انجمن پنجاب ضمیموں کی شکل میں "گلدستہ" کے نام سے شائع کرتی تھی۔ انجمن پنجاب کے جلسوں میں جو مضامین پڑھے جاتے تھے اور جو خاص امور بحث طلب ہوتے تھے ان کی رپورٹیں رسالہ انجمن قصور میں ملتی ہیں۔ انجمن قصور انجمن پنجاب ہی کی ایک شاخ تھی۔

> "جلد اوّل (رسالہ انجمن پنجاب) نمبر ا۔ بابت ماہ جولائی و اگست ۱۸۷۴ء رسالہ انجمن مفید عام قصور"۔

یہ سطور اسی رسالہ پر موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب انجمن پنجاب کی کارروائیاں لاہور کے بجائے قصور سے مندرجہ بالا نام کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ اس رسالے میں عام طور پر صرف مضامین ہی شائع ہوتے تھے جو مشاعروں کے علاوہ دیگر مجالس میں پڑھے جاتے تھے۔ گویا رسالہ انجمن پنجاب کے دو حصے ہو گئے۔ ایک تو بطور ضمیمہ جو کافی ضخیم

(۱) دیکھئے باب پنجم، "انجمن کے مشاعرے"۔

ہوتا تھا اور جس میں مشاعروں کی کارروائی درج ہوتی تھی۔ دوسرا حصہ نقصور سے جس میں صرف مضامین شائع ہوتے تھے۔

جلسہ ۱۰ جولائی ۱۸۷۱ء (فہرست مضامین):

۱- مضمون در تشریح لغات مستعملہ قانونی وعدالتہائے گورنمنٹ از جناب غلام نبی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر قصور۔

۲) مضمون، در صرف و نحو از مولوی حبیب اللہ خان (مدرس فارسی) برانڈرتھ اسکول قصور۔

۳) ایک شوقیہ خط از مولوی وہاب الدین صاحب مدرس اوّل گورنمنٹ اسکول، اس خط میں ہندوستان کی محفلوں، کہانیوں، زیوروں، رنگوں کے نام اور شادی کی رسومات درج ہیں

۴) مضمون۔ ڈاکٹری۔ کلوروفارم کے استعمال اور بنانے کی ترکیب از مول چند اسسٹنٹ سرجن سیکریٹری انجمن قصور۔

۵) مضمون جغرافیہ (چین کے متعلق) از مولوی محمد غلام اللہ۔

۶) مضمون اخلاق۔ معالجہ امراض قوت شہوی از مولوی عبدالوہاب۔

۷) مضمون تاریخی متعلق علاءالدین خلجی از منشی قادر بخش۔

۸) مضمون قانونی۔ شرح واصول از سوڈھی حکم سنگھ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر۔

۹) نظم کا تاریخی مضمون موسوم بہ حقیقت سخن از سیف الحق ادیب،

(دیباچہ یادگار سخن جلد اوّل۔ رسالہ انجمن قصور، بابت ستمبر و اکتوبر ۱۸۷۱ء۔

باہتمام قادری پریس انجمن قصور۔ ایڈیٹر سیف الحق:

۱- مضمون در تشریح لغات مستعملہ قانونی وعدالتہائے گورنمنٹ از ڈپٹی غلام نبی خان (مسلسل)

۲- مضمون صرف و نحو (مسلسل)

۳- مضمون جغرافیہ (چین کا باقی حال)۔

۴- ریاست جے پور کا تاریخی حال از پنڈت حکم چند۔

۵- تشریح جبر و مقابلہ از منشی بھیروں مل۔

۶۔ شکر نعمت (مطالب اخلاق ہر کیش و ملت سے متعلق) از سیف الحق۔

۷۔ شرح حکمت (مبادی حکمت سے متعلق) از ابوالبرکات مولوی فاضل محمد عبدالحکیم کلانوری، لیکچرار پنجاب یونیورسٹی۔

۸۔ مضمون قانون (مسلسل) از سوڈھی حکم سنگھ۔

۹۔ مضمون نظم (مسلسل) از سیف الحق۔

۱۰۔ ہنود کی مذہبی تاریخ از پنڈت کنہیا لال مدرس ہندی قصور۔

جلد اوّل :۔ رسالہ انجمن مفید عام قصور، نمبر ۳، بابت ماہ دسمبر، ۱۸۷۴ء

جلسہ ۲۵ نومبر، ۱۸۷۴ء :

۱۔ مضمون نظم اردو کی تاریخ کا بقیہ، از مولوی محمد حسین۔

۲۔ مضمون قانون (مسلسل) از سوڈھی حکم سنگھ۔

۳۔ مضمون رموزِ حکمت (مسلسل) از ابوالبرکات۔

۴۔ ہنود کی تاریخ مسلسل) از پنڈت کنہیا لال۔

۵۔ مضمون تشریح لغات مستعملہ قانون و عدالتہائے گورنمنٹ۔

۶۔ صرف و نحو (مسلسل) از حافظ حبیب اللہ۔

۷۔ تاریخ قصور از منشی نورالدین معہ نقشہ جات آبادی قصور، حدود میونسپل کمیٹی۔

۱۶ جنوری، ۱۸۷۵ء کو۔ مولوی عبدالوہاب، پنڈت ہردے نرائن، منشی محمد حسین صاحب، منشی قادر بخش، منشی غلام نبی نے "اظہار تکلیف زمینداران" کے عنوان سے مضامین پڑھے۔ مسلسل مضامین کے علاوہ نیپولین بوناپارٹ پر منشی اعجاز نبی اور ماءالحیات پر مولوی محمد ولی اللہ صاحب نے مضامین پڑھے۔

۱۔ ۱۳ مارچ کے جلسہ میں بقیہ مضمون لغات از منشی غلام نبی خان۔

۲۔ سرگذشت روبن سن کروسو از منشی غلام نبی خان۔

۳۔ مضمون درباب ترقی صنعت و حرفت از منشی نرائن داس۔

۴۔ میڈیکو لیگل۔ وجوہات رگ حبس دم از سبحان علی صاحب اسسٹنٹ سرجن۔

۵۔ بقیہ مضمون نحو از حافظ حبیب اللہ۔

۶۔ مضمون قانونی پنڈت ہردے نرائن۔

۷۔ اصول فن مناظرہ از مرزا فتح بیگ۔

مئی، ۱۸۷۵ء

۱۔ نقشہ توضیح معافی معاملہ سرکار بحق جاگیرداران و معافی داران پنجاب از مولوی فتح بیگ۔

۲۔ زبان اردو از مولوی محمد حسین۔

۳۔ مضمون قانونی از سوڑھی حکم سنگھ۔

۴۔ علم تاریخ از منشی غلام جیلانی۔

"(۱) جلسہ یکم جولائی ۱۸۷۵ء مندرجہ ذیل مضامین پڑھے گئے":

(۱) مضمون ترقی علم زراعت از منشی قادر بخش (۲) بقیہ مضمون لغات متعلقہ قانون عدالت (۳) بقیہ سوانح عمری رابن سن کروسو (۴) درباب ترغیب و تحریص علم زراعت، (۵) موجودہ تعلیم کی اندرونی حالت کا بیان

ماہ جولائی ۱۸۷۵ء:

(۱) نقشہ مظہر حالات ترقی و دولت و تجارت از مسٹر آرتھر برانڈرتھ کمشنر صوبہ ملتان، (۲) شکریہ آمیز تقریر اور مروجہ شکریہ پر نکتہ چینی از مرزا فتح بیگ (۳) لغات (مسلسل) از منشی غلام نبی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور (۴) علم تاریخ (مسلسل، حصہ پنجم) از منشی غلام جیلانی (۵) منطق از مولوی دین محمد (۶) مخزن العلوم از منشی رامانند (۷) فوائد صبر از نرائن داس۔

ستمبر ۱۸۷۵ء:

(۱) مضمون زبان اردو بقیہ نمبر ۵ از مولوی محمد حسین، (۲) علم زراعت (نیشکر کا بیان) از مولوی قادر بخش (۳) علم زراعت از مولوی فتح محمد بیگ (۴) سلطنت کی

---

(۱) رسالہ انجمن مفید عام قصور ضلع لاہور، ج ۲، رسالہ نمبر ۶-۷-۸-۹-۱۰-۱۱، بابت ماہ جون تا ماہ نومبر ۱۸۷۵ء مطبع قادری پریس انجمن مفید عام قصور میں چھپا۔ زیر نگرانی مرزا فتح محمد بیگ۔

حاجت اور مہذب حکومت کی تعریف اور بنیاد حصول اخراجات مملکتی سلطنت کا بیان۔

اکتوبر ۱۸۷۵ء:

(۱) فوائد اتفاق از مرزا فتح محمد بیگ (۲) درباب تائید نقشہ فروخت اشیاء نسبت اسکول۔ (اس اسکول کے متعلق دو مضامین اور پڑھے گئے۔ اسکول اور اس کی تفصیلات سنائی گئیں)

نومبر، ۱۸۷۵ء:

(۱) اردو از مولوی محمد حسین، (۲) بیان حالات رسول کریمؐ (۳) مضمون قانون از منشی دین محمد۔

پرنس آف ویلیس کی آمد کے سلسلہ میں چندہ جمع کیا گیا۔

۱۸۷۶ء میں انجمن کی یونیورسٹی کالج کی سرگرمیوں کے علاوہ مندرجہ ذیل خاص خاص تجاویز پیش ہوئیں اور مباحثے ہوئے۔ بعض تجاویز پر عملدرآمد شروع ہوا۔

۱۔ اس سال ڈاکٹر لائٹنر واپس لاہور آئے اور انجمن پنجاب کے صدر کا عہدہ پھر سے سنبھال لیا۔ ان کی آمد کی خوشی میں جلسہ منعقد ہوا۔ ان کی غیر موجودگی میں جو کام انجمن نے سرانجام دیئے ان پر ڈاکٹر لائٹنر نے اطمینان کا اظہار کیا۔ اور

۲۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے لئے ہندوستان کے سیکریٹری آف اسٹیٹ سے ملاقات کی نیز ویانا کی عالمی نمائش میں جاکر ہندوستان کے اعلیٰ نمونے اور نوادرات پیش کرنے کا اور اورینٹل کانگریس لندن سے گفت و شنید کا حال بیان کیا۔

۳۔ انجمن نے اس سال کئی جلسے منعقد کئے جن میں رومن رسم الخط رائج کرنے کے مسئلہ پر بحثیں ہوئیں۔ گورنمنٹ کی پالیسی یہ تھی کہ رومن رسم الخط رائج کیا جائے۔ لیکن انجمن کے مباحثوں میں یہ طے کیا گیا کہ اس ملک میں رومن رسم الخط رائج کرنا نامناسب ہے۔ اس کے علاوہ عملی طور پر اس کا استعمال بھی محدود رہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر لائٹنر نے اس موضوع پر مقالہ بھی پیش کیا جو سیکریٹری آف آرٹس لندن کے اخبار میں شائع ہوا تھا اس مقالہ میں بھی رومن رسم الخط کی مخالفت کی گئی تھی لہٰذا ڈاکٹر لائٹنر نے حکومت ہند کے

سیکریٹری کو رپورٹ بھیج دی کہ انجمن پنجاب اس تجویز کی مخالفت کرتی ہے

۴۔ اورینٹل کانگریس سینٹ پیٹرس برگ نے انجمن پنجاب سے درخواست کی کہ کانگریس کے دوسرے اجلاس میں اپنا نمائندہ بھیجے جو پنجاب کی نمائندگی کرے انجمن پنجاب نے ڈاکٹر لائٹنر کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ لیکن یہ وقت اتنا قلیل تھا کہ ڈاکٹر لائٹنر کانگریس کے اجلاس میں شرکت نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا جو علمی تحقیقات والسنۂ شرقیہ کے سلسلہ میں انجمن نے مرتب کی تھیں ان کو دستاویز کی شکل میں بھیج دیا گیا تاکہ مشرق سے متعلق تحقیقات کے شعبہ میں اورینٹل کانگریس کے مقصد میں توسیع ہو سکے۔

۵۔ انجمن میں متعدّد جلسے منعقد ہوتے جن میں عہدیداروں کی ریلوے کمپنی کے مقامی ملازموں کے ساتھ بدسلوکی کی شکایات پیش کی گئیں اور اس سے متعلق تحقیقات کے بعد عہدیداروں کو تنبیہہ کی گئی۔

۶۔ پیداوار اور زراعت سے متعلق نمائش گاہ کا قیام اور ملک کے فنون لطیفہ اور مصنوعات کے موضوع پر مباحثوں کے بعد ان پر تجاویز پر عمل کرنے کے لئے کمیٹیاں بنائی گئیں۔

۱۸۷۷ء یکم جنوری کو ڈاکٹر لائٹنر کی قیادت میں ایک وفد ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملکہ وکٹوریہ کو انجمن پنجاب کی طرف سے "ملکۂ ہند" یا "شہنشاہ بیگم" کا خطاب پیش کیا۔ گورنر جنرل نے مناسب الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا اور انجمن پنجاب کی خدمات کا اعتراف کیا۔

(۱) خان بہادر برکت علی خان کی تجویز کردہ نمائش کا بڑے جوش وخروش سے اہتمام کیا گیا۔ اس نمائش میں پنجاب میں پیدا ہونے والی اجناس، مصنوعات اور پھولوں کو سجایا گیا۔ نمائش کی چیزوں کو گورنمنٹ کالج کی نئی عمارت کے کمروں میں رکھا گیا تاکہ عوام اسے دیکھ سکیں۔

(۲) دہلی میں دربار منعقد ہونے اور انجمن کی کارکردگی کے اعتراف کے بعد انجمن پنجاب نے ایک اور تعلیمی اقدام کیا کہ لارڈ لٹن، گورنر جنرل ہند کی خدمت میں ایک درخواست دی کہ ہندو اور مسلمانوں کو سول سروس کے امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں لندن جانے اور امتحان کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

اس وقت تک کلکتہ یونیورسٹی کے تحت پنجاب یونیورسٹی کالج کے امتحانات ہوتے تھے لہٰذا یہ مراسلہ کلکتہ بھیج دیا گیا۔ انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ نے ہندوستانیوں کو سول سروس میں شرکت کے لئے فوراً قواعد میں چند تبدیلیاں کیں وہ قابلِ غور ہیں:۔

۲۳ جون، ۱۸۷۷ء کو یک شنبہ کے دن انجمن ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں بابو سریندر ناتھ بنرجی سابق متعلق سول سروس ہندو ممبر برٹش انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ نے تقریر کی اور بتایا کہ متعلقہ ادارے میں فوری تبدیلیاں عمل میں لائی گئی ہیں اب سول سروس کے امیدواروں کی عمر زیادہ سے زیادہ بائیس (۲۲) اور کم سے کم انیس (۱۹) سال رکھی گئی ہے انہوں نے انجمن کے ممبران پر زور دیا کہ وہ ان تبدیلیوں کو قبول کرے۔

چنانچہ اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے ۲۴ جون یوم دوشنبہ کو پھر جلسہ ہوا اس جلسہ میں بہت سے لوگ شریک ہوئے کیونکہ سول سروس کا مسئلہ اہل ہند کے لئے نہایت اہم تھا۔ یہ جلسہ شکشا سبھا میں منعقد ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل کارروائی ہوئی۔

۱) برٹش انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ نے سول سروس کے معاملہ میں جو کارروائی کی ہے اسکو اس جلسہ کے ممبر بے کم وکاست منظور کرتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ انڈین سول سروس کے امتحان میں شریک ہونے کے لئے جو قواعد جو کہ امیدواران کی عمر سے متعلق تھے حال ہی میں ان میں تغیر و تبدل کیا گیا ہے۔ اس جلسہ کے ممبروں کی یہ رائے ہے کہ عمر کی قید کو منسوخ کیا جائے۔

۲) ہندوستانی امیدواروں کے داخلے میں آسانی کے لئے جلسے کے ممبروں کی رائے یہ ہے کہ کل عہدوں میں کسی قدر عہدوں کے لئے جن کی تعداد معین ہو جائے امیدواروں کا امتحان ہر سال ہندوستان کے کسی ایک یا ایک سے زیادہ وسطی مقاموں میں ہوا کرے۔

جنوری، ۱۸۷۷ء میں جو دہلی دربار منعقد ہوا تھا اس میں مستحق اور لائق خطاب حضرات کو خطابات دیئے گئے تھے لیکن ڈاکٹر لائٹنر کی بے لوث سعی کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے اس دربار میں انجمن پنجاب کی نہ صرف نمائندگی کی تھی بلکہ اپنی خدمات اور انجمن کی کارکردگی کی رپورٹ جو ان کی نگرانی اور سرپرستی میں ہوئی تھی پیش کی تھیں۔ انجمن پنجاب نے اس سلسلہ میں ایک جلسہ کیا اور اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا اور درخواست کی کہ ڈاکٹر لائٹنر جو اہل ہند کی سود و بہبود میں پیش پیش ہیں اور خود بھی ایک مشہور مستشرق ہیں

انہیں خطاب سے نوازا جائے۔

مقامی اور ہندوستان کے دیگر صوبہ جات میں واقع انجمنیں جن کے مقاصد بنیادی رُخ سے انجمن پنجاب سے مطابقت رکھتے تھے ان میں "انجمن اسلامیہ" اور "انجمن ہمدرد اسلامیہ" انجمن پنجاب میں تقریباً ضم ہوگئیں۔ البتہ دینی مقاصد کے پیشِ نظر ان انجمنوں کے جلسے علیحدہ ہوتے تھے۔ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام انجمن اسلامیہ کا ایک جلسہ انجمن ہال میں منعقد ہوا تھا جس میں ترکی کے بیمار اور مجروحوں کی امداد کے لئے چندے کی فراہمی کے لئے کمیٹی قائم ہوئی یہ کمیٹی لندن کے ڈیوک آف سدرلینڈ کی کمیٹی کی درخواست پر قائم کی گئی تھی لندن میں بھی ترکی کی امداد کے لئے چندہ جمع کیا جا رہا تھا لہٰذا لاہور میں خان بہادر برکت علی خان اور پنڈت رام نرائن اس کے سیکریٹری (۱) چنے گئے۔ اس کمیٹی نے ۲۷ مئی ۱۸۷۷ء بروز یک شنبہ حسب ذیل قرارداد انجمن اسلامیہ کے مطابق سعد وزیرخان میں نماز عصر کے بعد کارروائی شروع ہوئی اور جس کی جو حیثیت تھی اس نے چندہ دیا یہاں تک کہ خواتین نے بالیاں، چوڑیاں، انگوٹھیاں جو جو وہ پہنے ہوئے تھیں چندے میں دے دیں۔ اس کے علاوہ چندہ دینے میں ہندو، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور انگریزوں غرض ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں نے چندہ جمع کر کے ترکی روانہ کیا۔ انجمن پنجاب کے توسط سے ہر بڑے شہر اور قصبہ میں جلسے منعقد کر کے چندہ کیا جاتا تھا اور یہ رقم سفیر ترکی مقیم بمبئی کے توسط سے ترکی پہنچائی جاتی تھی۔ اخبار انجمن پنجاب نمبر ۳۵ کے ۸ ر اگست کے رسالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸ ر ماہ کی مدت میں چار لاکھ روپے ترکی بھیجے جا چکے تھے۔

۱۸۷۸ء میں ایک متعصب ممبر نے جو انجمن پنجاب کا عام ممبر تھا خود اپنے طور پر مجلسِ عاملہ کے مقابلہ میں ایک ذیلی انجمن قائم کی جس کا مقصد انجمن پنجاب کے حسابات اور رقوم پر اعتراضات کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی ممبر جو اس انجمن اور اس کے مقاصد سے پرخاش رکھتے تھے خاص طور پر اس لئے کہ اردو کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی وجہ سے انگریزی دانوں کے مقابلہ میں انہیں قابلِ اعتناء نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی

(۱) "سول اینڈ ملٹری گزٹ"۔ مورخہ ۱۰ جون ۱۸۷۷ء، صفحہ ۳، کالم ۴-۳۔ (ایک مراسلہ) ضمیمہ اخبار انجمن پنجاب نمبر ۲۲، مطبوعہ یکم جون ۱۸۷۷ء

کر ڈاکٹر لائٹنر جو کالج یونیورسٹی کے قابل استاد ہونے کے علاوہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل بھی تھے انہیں معلوم تھا کہ امتحانوں کے نتائج نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ طالب علم جن کا ذریعہ تعلیم اردو ہے اور یونیورسٹی کالج سے اسناد حاصل کر چکے ہیں وہ گورنمنٹ کالج جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا کہیں زیادہ قابل تھے لیکن حکومت کی حکمت عملی کی وجہ سے انہیں اچھی ملازمتیں مل جاتی تھیں اور یونیورسٹی کالج کے سند یافتہ ناقابل مانے جاتے تھے۔ ان نتائج کو دیکھتے ہوئے انجمن کے چند ممبر جن میں بنیادی اراکین بھی شامل تھے بددل ہو گئے۔ جب منشی پرتول چند اور ان کے انگلستان سے نو وارد ساتھیوں نے انجمن اور خاص طور پر ڈاکٹر لائٹنر پر یونیورسٹی کالج کا روپیہ خرد برد کرنے کا الزام لگایا تو ان لوگوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس الزام پر ڈاکٹر لائٹنر نے جو نہایت نازک مزاج تھے ناراض ہو کر استعفیٰ دے دیا

اس استعفیٰ پر غور کرنے کے لئے ۲۴ اپریل ۱۸۷۸ء میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا اور ڈاکٹر لائٹنر پر عائد کردہ الزامات کی تفتیش کے لئے ایک ذیلی کمیٹی قائم کی گئی تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ صدر کے خلاف جو پرتول چند رچٹرجی نے الزامات عائد کئے ہیں کہاں تک صحیح ہیں۔ یہ مجلس نو اراکین پر مشتمل تھی جس کے صدر دیال سنگھ اور پنڈت رام نرائن معتمد اور پنڈت سورج بال، بابو پرتول چند رچٹرجی، منشی محمد لطیف اور چند دیگر اشخاص ممبر تھے۔ اس ذیلی کمیٹی کا اجلاس پنڈت سورج بال کے گھر پر منعقد ہوا۔ لیکن منشی محمد لطیف کے غیر حاضر ہونے کی وجہ سے جلسہ کی مکمل کارروائی نہ ہو سکی، کیونکہ وہ اور ان کے ساتھی جنہیں انجمن پنجاب کی اہمیت اور اس کے خلاف کارروائی کے نتائج کا اندازہ تھا پوری کوشش کی کہ ذیلی کمیٹی توڑ دی جائے اور ڈاکٹر لائٹنر کو استعفیٰ واپس لینے پر آمادہ کیا جائے کیونکہ وہی اس انجمن کے روحِ رواں تھے۔ ان کے ساتھ ہی اکثر بنیادی اراکین جو ان الزامات پر برافروختہ ہو گئے تھے فیصلہ کیا کہ اگر ذیلی کمیٹی نے من مانی کارروائی کی تو وہ بھی استعفیٰ دے دیں گے لیکن راجہ ہربنس سنگھ کے زیر صدارت خان بہادر برکت علی خان نے جو انجمن کے ایک اہم رکن تھے ذیلی کمیٹی کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے اسے منسوخ کرنے کی درخواست کی کیونکہ اس کمیٹی کے اراکین نے حساب کی جانچ پڑتال کئے بغیر اپنی رپورٹ تیار کر لی تھی اور حاضرین کی رائے شماری تک نہ کی تھی۔

خان بہادر برکت علی خان کی تقریر کے بعد منشی عبداللطیف نے اس قضیئے کو جلد از

جلد ختم کرنے پر زور دیا جو محض تعصب کی بناء پر برپا کیا گیا تھا۔ آخر کار ۳ جون ۱۸۷۰ء میں مجلس عاملہ نے ڈاکٹر لائٹنر کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لیں تاکہ انجمن پنجاب کی کارروائیاں پھر شروع کی جا سکیں جو سات آٹھ ہفتوں سے بند تھیں۔ ڈاکٹر لائٹنر نے رؤسا اور شرفاء کی درخواست پر جو انجمن کے نیک مقاصد سے آگاہ تھے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔

(۱) اپریل ۱۸۷۹ء۔ انجمن پنجاب کی جس شاخ کو قصور میں "انجمن قصور" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس نے بہت ترقی کی۔ سب سے پہلے جب لاہور سے مناظموں کی روئداد "گلدستہ" کے نام سے شائع ہوئی تھی اسی وقت قصور سے انجمن پنجاب کا رسالہ شائع ہوتا تھا جس میں انجمن پنجاب کے عمومی جلسوں کی علمی کارروائیاں شائع ہوتی تھیں اسی سال انجمن قصور نے اپنا رسالہ شائع کرنا شروع کیا جس میں انجمن قصور نے اپنے اغراض و مقاصد شائع کئے۔ یہاں انجمن پنجاب کے قائم کردہ دستکاری کے ادارے نے بڑی ترقی کی اس ادارے کا نام مدرسہ "صنعت وحرفت" تھا چنانچہ ۱۲ اپریل ۱۸۷۹ء کو یہاں ایک صنعتی نمائش کا انتظام کیا گیا جس کی صدارت لے ڈبلیو سٹگیون ڈپٹی کمشنر لاہور نے کی۔ اس نمائش اور جلسہ میں مسٹر کپلنگ میوزیم کیوریٹر اور ڈاکٹر لائٹنر کے علاوہ لاہور انجمن پنجاب کے اکثر اراکین نے بھی شرکت کی۔ یہ بڑی کامیاب نمائش تھی جس میں صنعتی مدرسہ کی بنائی ہوئی چیزوں کو پیش کیا گیا تھا۔ صاحب صدر نے اردو میں تقریر کر کے اپنے کلی اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "ہمیں صرف اطمینان ہی نہیں بلکہ آئندہ کی فلاح و بہبود کی نوید بھی ملتی ہے"۔

رسالہ انجمن قصور کے مدیر سیف الحق ادیب نے خطبہ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ۔۔۔۔

"بیت العلوم پنجاب و کالج لاہور و دیگر مدارس پنجاب کے تعلیم یافتہ لوگوں کی شرکت اس بات کی شاہد ہے کہ ہماری سوسائٹی دیگر سوسائٹیوں اور اخبارات و رسالہ جات ماہواری مطبوعہ پنجاب خصوصاً صاحبان سررشتہ تعلیم و علی الخصوص بانیان و ممبران انجمن پنجاب نے اس عمدہ کام کی اشاعت و ترویج میں سرگرمی سے کامیابی حاصل کی ہے۔ پس میری رائے میں اب وہ وقت نہیں ہے کہ صرف علمی شاخوں کی طرف ساری توجہ صرف کریں بلکہ میرے نزدیک بے شک وہ وقت آگیا ہے جس میں عمل کے جھنڈوں کو مضبوط کھڑا کرنا مناسب ہے"۔

---

(۱) پروسیڈنگ برائے ۱۸۷۹ء اور رسالہ انجمن قصور بابت ماہ نومبر ۱۸۸۰ء جلد ۷، نمبر ۱۱، ص ۱۸

(۱) ۱۳ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو لاہور میں ایک جشن فتح قندھار کے سلسلہ میں منایا گیا تھا۔ اس موقع پر انجمن پنجاب کی جس جس شہر میں شاخیں قائم کی گئی تھیں یہ ارادہ کیا گیا کہ ہر شاخ انفرادی طور پر وائسرائے کو انجمنوں کی کارکردگی کے ساتھ پیغام تہنیت پیش کرے اور اس کے ساتھ تاریخی اور جغرافیائی، ثقافتی حالات بھی درج کر کے پیش کئے جائیں۔ لیکن ڈاکٹر لائٹنر، کمشنر اور ڈپٹی کمشنر وغیرہ نے یہ طے کیا کہ انجمن پنجاب ہی اپنے خطبہ میں تمام انجمنوں کے اغراض و مقاصد، ان کی کارکردگی کے علاوہ تاریخی حالات پیش کرے۔ چنانچہ تمام انجمنوں کے صدر اور اہم شخصیتیں اپنے کوائف مع سپاسنامے کے دوسرے دن شام کو وائسرائے کے کیمپ میں گئے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے ایڈریس پیش کیا جو انجمن پنجاب اور تمام انجمنوں کے مطالب کا مختصر و جامع مضمون تھا۔ انجمن قصور سے متعلق خاص طور پر درج تھا "انجمن پنجاب نے قصور میں صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ جاری کرنے میں مدد دی ہے اور کئی نمائش گاہیں بطور خود منعقد کی ہیں۔ اور جس کو اس کی چھوٹی بہن (شاخ انجمن قصور) کو پورا پورا فائدہ پہنچانے میں مدد کی ہے، امید واثق ظاہر کرتی ہے کہ نمائش گاہ آئندہ میں اشیائے تجارتی و متعلق فنون پر حضور کی توجہ مساوی مبذول ہوگی۔

ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن قصور کے صدر جناب منشی قادر بخش خان کی ہمدردی اور لیاقت کا بھی ذکر کیا اور انجمن پنجاب کے ان کارناموں کا بھی مختصر ذکر کیا جو معہ اس کی مختصر تاریخ کاغذ مطلا پر درج تھے۔ ان کاغذات کو سنہری صندوقچے میں رکھ کر وائسرائے کو پیش کیا گیا۔ وائسرائے نے انجمن پنجاب اور اس کی شاخوں کی کارکردگی پر اپنے اطمینان اور آئندہ کے لئے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

(۲) ۸۲-۱۸۸۱ء۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اپنی بصیرت اور مشرقی علوم سے گہری واقفیت کی وجہ

---

(۱) پروسیڈنگ برائے ۱۸۸۰ء اور رسالہ انجمن قصور بابت ماہ اکتوبر ۱۸۸۰ء جلد ۷، صص ۲۶-۲۴

(۲) Memorial of the Anjuman to Government regarding the use of vernacular as the medium of instruction by order of the honourable lieutenent Governer R.G. Thomson.

Office Junior Secretary to Government of Panjab.

سے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ اس ملک میں مغربی علوم کو ہر دلعزیز بنانے کے ضروری ہے کہ قدیم مشرقی علوم کی بقا و احیاء کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں عظیم مشرق کا فکری اور ذہنی سرمایہ محفوظ ہے انہیں یہ شدید احساس تھا کہ مشرقی علوم اور السنہ کو تقویت پہنچا کر اور جدید مغربی علوم کو دیسی زبانوں میں پڑھا کر ہی یہاں صحیح معنوں میں تعلیم عامہ کا سلسلہ ہمہ گیر کیا جا سکتا ہے ان خیالات کو پنجاب کی سرکاری تعلیمی رپورٹ میں اسطرح درج کیا گیا ہے:۔

Reporton Popular Education, Panjab 1880-81
page 80 XXXV

"The view set forth by the anjuman in their memorial of Government, especially as regards the use of the Vernacular as the medium of instruction, were in consistent with much that had been urged at public meetings for the support of the qriental movement, who were present." [1]

۱۸ نومبر ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی معرض وجود میں آئی اور اس کے پہلے کانووکیشن پر ڈاکٹر لائٹنر کی خدمات کے اعتراف میں انہیں ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری عطا کی گئی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس کانووکیشن کی پوری کارروائی اردو میں کی گئی۔

۱۸۸۳ء کے متعلق کوئی دستاویز حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر اس زمانے میں یونیورسٹی کے کاموں میں مصروف رہے۔ اگرچہ انکی صحت خراب تھی مخالفین کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی لوگ مشرقی علوم کی اہمیت سمجھنے کے باوجود انگریزی ذریعہ پر مائل ہو رہے تھے لیکن ڈاکٹر لائٹنر روز اوّل کی طرح اپنی دھن میں لگے رہے۔

۱۸۸۴-۱۹ء تک حساب کی جانچ پڑتال سے معلوم ہوا کہ شعبۂ السنہ شرقیہ میں جہاں

---

[1] A History of the University of the Panjab by F.J. Bruce (M.A. Oxon & Syd) University professor of History (Lahore 1933. page 43-48-92-70).

ڈاکٹر لائٹنر منتظمِ اعلیٰ تھے ۱۰۳۷۹ روپے خرد برد ہو گئے اس واقعہ کی خبر لارڈ رپن تک پہنچائی گئی۔ انہوں نے اس روپے کے متعلق اور غیر تسلی بخش اصراف پر اپنی تقریر میں اشارہ کیا۔ جب یہ تقریر اور رپورٹ شائع ہوئی تو ڈاکٹر لائٹنر نہایت بددل ہوئے۔ اسی زمانہ میں انجمن کی کارکردگی میں کمزوری پیدا ہو گئی تھی "سراج الاخبار" نے اپنے ۱۴ اپریل، جلد ۳، کے شمارہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایک ماہ اور ۲۰ یوم کی چھٹی لی تھی اور لوگوں کو امید نہیں تھی کہ اب وہ واپس آئیں گے۔ ان کی جگہ بابو نوبین چندر نے کام سنبھال لیا، لیکن ڈاکٹر لائٹنر چھٹیاں گزار کر واپس آئے اور دوبارہ السنہ شرقیہ کا منصب سنبھال لیا جسے یونیورسٹی کا ایک حصہ قرار دیا گیا۔

(۱) ۱۸۸۵ء میں یونیورسٹی سینیٹ نے اورینٹل کالج کے نظم و نسق کے سلسلہ میں ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ارکان وائس چانسلر، پرنسپل اورینٹل کالج، "مسٹر پاکنز"، ڈاکٹر لائٹنر، نواب نوازش علی خان، فقیر سید قمر الدین، رائے کنہیا لال، مسٹر ایباسن اور مہاراجہ پٹیالہ کے نمائندے پر مشتمل تھی۔

(۲) ۱۸۸۶ء انجمن پنجاب قائم تھی اور ڈاکٹر لائٹنر اس کے سربراہ تھے۔ لیکن اس سال ڈاکٹر لائٹنر زیادہ بیمار ہو گئے اور یکم دسمبر ۱۸۸۶ء سے انہیں پانچ ہزار روپے سالانہ کی پنشن مل گئی اور وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد انجمن پنجاب کی کارروائیوں کا پتا نہیں چلتا۔ اسی زمانے میں لاہور اور صوبۂ پنجاب میں کئی انجمنیں قائم ہو گئیں اور ان انجمنوں نے جنہیں انجمن پنجاب نے مختلف شہروں میں قائم کیا تھا اپنے طور پر علیحدہ ہو گئیں۔ رؤسا اور عمائدین نے چندہ دینا بند کر دیا جن کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔

---

(۱) "تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور" از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مطبع جدید اردو پریس، ۱۹۶۲ء

(۲) سراج الاخبار، جلد ۲، مطبوعہ ۱۳ ستمبر، ۱۸۸۶ء، روز دوشنبہ، نمبر ۳۶، ص ۶، مطبع سراج المطابع چھپا۔

باب - چہارم

انجمن کے کارنامے

(۱) احیائے علوم مشرقی

(۲) اُردو زبان و ادب

باب چہارم

انجمن کے کارنامے

احیائے علوم مشرقی

(معہ بحث یونی ورسٹی کالج اور اورنیٹیل کالج)

سنہ ۱۸۱۳ء میں لارڈ منٹو کے عہد میں ایک مخصوص کمیٹی کی سفارش پر حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں پہلی مرتبہ باقاعدہ تعلیم دینے کے لیے ایک لاکھ روپے سالانہ کی رقم منظور کی اور گورنر جنرل کے نام ایک مراسلہ جاری ہوا جس میں قدیم زبانوں کی سرپرستی کی ہدایت کی گئی۔ دس سال تک اس رقم کو خرچ نہیں کیا گیا سنہ ۱۸۲۴ء میں کمپنی کی حکومت نے کچھ دیسی اور کچھ مشنری درس گاہوں کو مدد دینی شروع کی۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں جو تعلیمی کمیشن قائم ہوا اس کا چیرمین خود لارڈ میکالے تھا۔ برعظیم کے باشندے کو جدید علوم کی تعلیم دیسی زبان میں دی جائے یا انگریزی کے ذریعے؟ اس سوال پر کمیٹی میں دو گروہ بن گئے جن کی تعداد برابر تھی لیکن لارڈ میکالے کے اپنے صدارتی ووٹ کی وجہ سے انگریزی ذریعہ تعلیم منظور رہا۔ لارڈ میکالے نے اپنی سفارشات میں مشرقی علوم والسنہ کا ذکر بڑے تحقیر آمیز لہجے میں کیا تھا لیکن بعض حقیقت پسند انگریز لارڈ میکالے کے

نظریے سے متفق نہیں تھے۔ یہ لوگ جدید علوم کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم کے احیاء کے بھی قائل تھے۔ اِن دو نظریوں کا تصادم درحقیقت مشرقی علوم کی خوش نصیبی کی علامت ہے کہ وہ مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچ گئے۔

جب پنجاب حکومت برطانیہ سے ملحق ہوا تب ۱۸۴۹ء میں تعلیم کا جدید نظام نافذ کیا گیا۔

رزلیوشن جناب لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی

"جنرل ڈپارٹمنٹ ۹ر فروری، ۱۸۵۰ء نمبر ۱۴۹۔ ان دنوں میں تحقیقات و تفتیش نسبت بہ کمیت اور کیفیت ان تدابیر کے جو خلائق کی تعلیم کے لیے مروج ہیں عمل میں آتے ہیں۔ اِس سے یہ بات متحقق ہوتی ہے کہ جہالت عظیم بہ امور التزامی کے خلائق میں پہلے ہی اور کوئی ایسے وسائل اور مسالک مقرر اور جاری نہیں ہیں جو غربائی تعلیم کو بکفایت کریں بلکہ علم کی تحصیل کی سبیل تنگ اور جو تعلیم ہوتی ہے وہ بھی خام اور عمل روزمرہ میں گویا بے کار۔

دفعہ ۲۔ اب جو تجویز ہوتی ہے اِس سے مقصد یہ ہے کہ ایسا سررشتہ جاری کیا جائے کہ اس کے باعث سے خلائق خواب جہالت سے بیدار ہو کے تحصیل علم کے اجتہاد میں از خود مصروف ہو اور پردہ غفلت کو دور کر کے علم کی رغبت پیدا کرے اور یہ بھی مد نظر ہے کہ اس کے لیے معلم لائق اور کتب مناسب بہم پہنچائی جائیں اور جو معلم اپنے کار دہی میں جیسا کہ چاہیئے کمر سعی باندھے اور شاگرد جو علم کی تحصیل میں کما حقہ کوشش کرے اس کو صلہ مناسب مرحمت ہو اور کلام تحسین سے اس کی سرفرازی کرے۔

دفعہ ۳۔ مال گزاری کے انتظام کے لیے ایک یہ صورت ہے کہ سال بہ سال کل قلمرو سرکاری میں علاقہ جات کی حقیقت کہ کس کی ہے اور کیسی ہے سررشتہ سرکار میں داخل ہوا کرتی ہے بس ایسی صورت کے انتظام کو تعلیم

کی تدبیر کا مبدء قرار دینا مقصود ہے۔

دفعہ ۴۔ کسی پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ رعایا اور پرجا کے درمیان اراضی کی تقسیم جزو سے کل تک عمل میں آتی ہیں . . . . (گویا اراضی کی کیفیت ظاہر کرنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے تاکہ گورنمنٹ کو معلومات ہو (صیغہ)

دفعہ ۵ :- . . . . اراضی . . . کی بقا و حفاظت اِس کے تحصیل علم پر منحصر ہے اور جب قوت طفلی کو تحریک ہوگی تو قرین قیاس ہے کہ طلباء قوم کو آگے بڑھا کے علم کے مدارجِ اعلیٰ کو پہنچنے کے لیے کمریں باندھیں گے۔

دفعہ ۶ :- اور بغرض حصول اِس مقاصد کے سررشتہ اور قواعد اِس خط پر ہوں گے۔

دفعہ ۷ :- ہر تحصیلداری کے صدر مقام میں سرکار کا ایک مکتب دیہاتی ہوگا اور دو یا چھ علاقہ جات تحصیل داری کے لیے ایک مہتمم پرگنے کا مامور ہوگا ان سب پر ہر ضلع میں ایک ضلع کا مہتمم قرار دیا جائے گا۔

دفعہ ۸ :- ہر تحصیل داری میں سرکار کا ایک مکتب دیہاتی منتصب ہو کر ایک معلم کے اہتمام میں رہے گا اور سوائے اس رسوم کے جو معلم کو طالب علموں سے ملتا ہے اِس کو سرکار کی طرف سے تنخواہ میں پندرہ یا بیس روپے سالانہ ملا کرے گی۔ اور اس قسم کے مکتب میں ترتیب درس اِس خط پر ہوگی کہ زبان مروجہ ہندوستان یعنی "اُردو" اور ہندی کا پڑھنا اور لکھنا علم حساب اور علم مساحت حسب رواج ہندوستان کے سکھایا جاوے گا اور اگر خلائق قبول کرے گی تو علم جغرافیہ اور علم تواریخ اور علم ہندسہ وغیرہ علوم عامہ بھی زبان ہائے مروجہ ہندوستانی (اُردو مولف) میں پڑھائے جائیں گے۔ . . . سرکاری مکتب میں طالب علم تب ہی بلا معاوضہ داخل ہونے پاوے گا جب کہ ہندوستانی مکتب کا

معلم جس کا نام مہتمم کی فہرست میں داخل ہونے کی سفارش کرے۔

دفعہ ۹:۔ پرگنے کے مہتمم ۔۔۔۔ کے عہدے کی شرط یہ ہوگی کہ وہ اپنے علاقہ کے ہر قصبے اور آبادی کلاں میں جاکر اس بات کی تحقیقات کرے کہ خلائق کی تعلیم کے لیے کیا سامان موجود ہیں۔

دفعہ ۱۰:۔ ضلع کے مہتمم کو مشاہرہ بشرح سو روپے تا دُو سو روپے ماہانہ ملا کرے گا۔ (جو اس بات کی تحقیق کرے گا کہ آیا مدرسوں میں حسب منشا تعلیم دی جاری ہے یا نہیں۔ قابل طالب علموں کا امتحان ہوا کرے گا اور رپورٹ سالانہ بھیجا کرے گا۔) ۔۔۔۔ اس پر لازم ہوگا کہ روساء اور شرفا میں تعلیم خانگی کس درجہ اور کس طرح ہوا کرتی ہے (کتابوں کی فروخت و تقسیم بھی اسی کے ہاتھ میں ہوگی۔)[۱]

صیغۂ تعلیم کے پہلے سربراہ رابرٹ منٹگمری تھے۔ ۱۸۵۴ء میں نظم و نسق کی تبدیلیوں کی ذمہ داری فنانشل کمشنر سرڈانلڈ میکلوڈ کو سونپی گئی اِس تبدیلی سے پہلے سکھوں کے عہد میں پنجاب کی زبان فارسی تھی۔ انگریزی قبضہ کے بعد فارسی کی جگہ اردو نے لے لی اور اسکول میں ذریعہ تعلیم اُردو ہو گیا اس زمانے میں اردو میں نصابی کتب تیار ہوئیں اور ترجمہ تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو گیا اسی سال ہر صوبے میں باقاعدہ تعلیمی محکمے قائم کئے گئے اور ان درس گاہوں کو جو سرکاری تحویل میں نہیں تھیں، امدادی رقوم دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں مدراس اور بمبئی میں یونی ورسٹیاں قائم کی گئیں۔ لیکن پنجاب میں ۱۸۵۶ء میں باقاعدہ محکمہ تعلیم قائم کیا گیا۔ جس نے اسکول کھولے اور مشنری اسکولوں کو مدد دی گئی۔ بجائے یونی ورسٹی قائم

۱۔ "کوہ نور"، لاہور: ۱۱ مارچ، ۱۸۵۰ء، روز دوشنبہ، نمبر ۹،
"گزٹ"، لاہور: ۱۹ فروری، ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۷

کرنے کے ۱۸۵۸ء میں کالج قائم کرنے کی تحریک شروع کی گئی جو طلباء کی کمی کے باعث بار آور نہ ہو سکی لیکن لاہور اور راولپنڈی میں اساتذہ کی تربیت کے لیے نارمل اسکول قائم کئے گئے۔

۱۸۵۸ء میں پنجاب میں از سر نو ایک ایسے کالج کے قیام کی کوششیں شروع ہو گئیں جہاں میٹرک کے بعد طلباء اپنی اعلیٰ تعلیم کو جاری رکھ سکیں چناں چہ ۱۸۶۳ء میں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی تجویز منظور ہوئی اور جنوری ۱۸۶۴ء میں لاہور میں گورنمنٹ کالج قائم ہوا جہاں طلباء کو کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ڈبلیو۔ جی۔ لائٹنر، ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی بارایٹ لا جو پہلے کنگز کالج لندن میں عربی اور مسلم قانون کے پروفیسر تھے گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اور انھوں نے ۱۸۶۴ء کے نومبر میں اس منصب کو سنبھالا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے مشرقی علوم والسنہ کی بقاء اور احیاء میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ یہ ایک صاحب نظر مستشرق تھے انھوں نے نئے تعلیمی نظام کی خامیوں اور کوتاہیوں کو بھانپ لیا تھا۔

لارڈ میکالے کی نافذ کردہ تعلیمی سفارشات کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ انگریزی زبان کے نفاذ سے اہل ہند اپنی روائتوں اور تہذیب سے کٹ کر بالکل الگ ہو جاتے۔ سر سید نے بھی ابتدا میں قدیم علوم کے احیاء اور خاص طور پر اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی پر زور سفارش کی تھی۔ اِس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُردو زبان سے پہلے فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی وہ ختم کی جا چکی تھی۔ اہل فکر برصغیر میں سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں کو متحد کر کے ایک نئے تعلیمی نظام کی بنیاد ڈالنے کی فکر میں تھے۔ جدید علوم کو سیکھنے کے لیے وہ اپنی زبان ہی کو ترجیح دیتے تھے لیکن ہندوؤں کے عام برتاؤ اور انگریزوں کی سازش نے سر سید کے

اِس خواب کو پورا نہ ہونے دیا اور وہ پورے خلوص کے ساتھ انگریزی زبان کے ہم نوا ہو گئے لیکن پنجاب کی حالت مختلف تھی۔ اگرچہ یہاں بھی انھوں نے فارسی کو کمزور کرنے کی پوری کوشش کی لیکن اہل پنجاب اپنی تہذیب و روایات کے تحفظ کے لیے ہم خیال ہو گئے اور قدیم علوم و السنہ کے احیاء پر کمربستہ ہو گئے۔

ڈاکٹر لائٹز نے سیاست اور زبان کے نازک مسئلے کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ لگا لیا تھا۔ چناں چہ اِس تجربہ اور مشاہدے کے بعد انھوں نے آئندہ جد و جہد کے لیے ایک ہمہ گیر نظریہ قائم کر لیا وہ کلکتہ یونی ورسٹی کے محدود اور سطحی نصابات، طریق کار اور نئے نظام تعلیم کے اس پہلو سے مطمئن نہیں تھے۔ جس میں ذریعہ تعلیم انگریزی زبان کو بنا دیا گیا تھا۔ اِس تعلیم کے نتیجے میں طلبا اپنی زبان اور تہذیبی و ثقافتی روایات سے جو مشرقی ادبیات میں موجود ہیں منقطع ہوتے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فارغ التحصیل طلباء نہ جدید مغربی علوم سے پوری طرح واقف ہوتے تھے اور نہ اپنی تہذیبی اور ثقافتی روایات سے آگاہ ہوتے تھے۔ کلرکوں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو رہی تھی جو سرکارِ انگلشیہ کے دفتروں میں احکام بجا لانے کے قابل بن گئی تھی لارڈ میکالے کا مقصد بھی یہی تھا اور اسی طرح ملک کی ذہنی اور اخلاقی نشو و نما اور ترقی کا خاتمہ یقینی تھا۔

یہ بات برعظیم کے باشندوں اور انسانیت سے ہمدردی رکھنے والوں کو پسند نہ تھی۔ اھل پنجاب صحیح معنوں میں برعظیم کے طلباء کی ذہنی اور اخلاقی ترقی کے خواہاں تھے۔ ڈاکٹر لائٹز کے علاوہ دوسرے حقیقت شناس انگریز بھی ان کے ہم نوا بن گئے۔

F. WILLMAT گورنمنٹ کالج دہلی کے پرنسپل مسٹر ایف ولمٹ نے اپنی رپورٹ مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۸۶۷ء میں اِس خیال کی تائید کی ہے

کہ "ہمارے طلباء کی کثیر تعداد انگریزی زبان اور ان علوم کا جو انگریزی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں سطحی علم حاصل کرتی ہے۔ جس کو محض نقالی کہا جاسکتا ہے۔ اور جس سے حریت فکر کی عادت مفقود ہو جاتی ہے۔ یونی ورسٹی کے نصابات اور طریق کار کی پر زور مذمت کی ہے۔[1]

ڈاکٹر لائٹز نے انجمن پنجاب کے ذریعہ اپنے ہم خیال علماء اور مفکرین کو ایک مرکز پر جمع کیا اور تعلیم کے لیے ایک کمیٹی بنائی جو علوم و فنون کو دیسی زبانوں میں منتقل کردے۔ اِس کے علاوہ انجمن پنجاب کے قیام کے پہلے سال ہی میں یعنی ۱۸۶۵ء ہی میں علوم مشرقی کا ایک مدرسہ بھی جاری کر دیا۔ اگرچہ وہ علوم مشرقی کی ایک ایسی یونی ورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے جس میں جدید علوم اور قدیم علوم کا امتزاج ہو اور جو یہاں کے باشندوں کی ذہنی اور اخلاقی سطح کو بلند کر کے انھیں صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ اور مہذب بنا دے۔

۱۰ر جون، ۱۸۶۵ء کو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر ڈانلڈ میکلوڈ نے ناظم سررشتہ تعلیم کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس میں دیسی زبانوں کی توسیع و ترقی اور ان میں مغربی علوم و ادبیات کو سمونے کے لیے تجاویز طلب کیں اور سید احمد خان اور ان کے رفقائے کار کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر کیا تھا:

"پنجاب گورنمنٹ کو اِس امر میں مساعی ہونا ضرور ہے کیوں کہ ہندوستان کی آئندہ بہبودی اس سے متعلق ہے جس قدر انگریزی زبان کی ترقی ہوتی جاوے گی اسی قدر علوم و فنون اور انشائے مغرب کا دیسی زبان میں ترجمہ

---

[1] جے۔ ایف۔ بروس، "ہسٹری آف دی پنجاب یونی ورسٹی"، ص ۱۰-۹

شائع ہونا آسان ہوتا جاتا ہے مگر اِس میں کچھ شک نہیں
کہ جب تک اس باب میں ترجمہ خاص نہ کی جاوے اور کوئی
خاص طریقہ عمل میں نہ لایا جاوے تب تک جس قدر ضرورت
ہے ترقی نہیں ہوگی۔"[1]

جناب ممدوح نہایت خوشی سے ان وجوہات کو ملاحظہ
فرمائیں گے جو آپ ازراہ مہربانی اس باب میں مناسب خیال
کر کے بعد مشورہ دیگر اشخاص کے جو اِس میں مشورہ دے
سکتے ہوں۔ اطلاع دیں گے۔ علاوہ اِس کے اگرچہ تعلیم
کے لیے روپیہ آپ کے پاس محدود ہے مگر جناب ممدوح
کے نزدیک نہایت ضرور ہے کہ کچھ روپیہ اِس غرض کے
لیے سالانہ علیحدہ کیا جاوے اور جناب ممدوح حسب
سفارش آپ کے جس قدر روپیہ مطلوب ہو منظور کرنے
کو مستعد ہوں گے۔"

ڈاکٹر لائٹز نے ۲۲ر اگست، ۱۸۶۵ء میں اِس مراسلے کو پیش کرنے کے لیے انجمن پنجاب کے عام جلسے میں خطاب کیا۔ اس جلسے میں پنجاب کے چیدہ چیدہ امراء، رؤساء اور علماء مشورے کے لیے جمع ہوتے ڈاکٹر لائٹز نے یونی ورسٹی کا تصور خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا :

گورنمنٹ نے ترقی علوم اور رواج دینے زبانِ مشرقی
کے لیے سرکلر بھیجا ہے اس کی تکمیل کے واسطے ضروری
ہے کہ دارالسلطنت پنجاب میں ایک یونی ورسٹی کو امداد

---

[1] "کیلنڈر" (دستور العمل)، پنجاب یونی ورسٹی"، لاہور: مطبع انجمن پنجاب، (باہتمام منشی نظام الدین)، ۷۵-۱۸۷۴ء

شمولیت روسا، سے بنائی جائے اور اس یونی ورسٹی میں سب طرح کے علوم و فنون مشرقی و غربی سکھلائے جائیں اِس امر بزرگ میں پنجاب کے راجہ مہاراجہ اور روسا دل کھول کر چندہ دیں پھر سرکار سے درخواست کی جائے کہ وہ بھی مدد دے۔۔۔۔ مد نظر یہ ہے کہ سلف کی مشرقی تعلیم کو از سرِ نو جاری کیا جائے جس سے زبان ہائے دیسی کی تکمیل ہو سکے اِس لیے یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ لاہور میں ایک یونی ورسٹی قائم کی جائے جس کا کام یہ ہو کہ انشاء وغیرہ میں سب سے اعلیٰ بیت العلوم ہو اور علوم مشرقی اور علوم مروجہ میں امتحان اور تعلیم کیا کرے۔ اور جو اسباب تعلیم کے فی الحال موجود ہیں اِن کو استعمال میں لا کر واجب طور پر وسعت دیوے۔ زبان ہائے مشرقی تعلیم کی بنیاد ہوں اور اِن زبانوں کے ذریعہ سے یورپ کے علوم کی تعلیم ہو اور ہر ایک شخص اِس تجویز کی کامیابی کے لیے کوشش و سعی کرے۔"

اِس جلسہ میں ڈاکٹر لائٹنر کے خیالات سے اتفاق کیا گیا۔ لاہور امرتسر کے مشاہیر کی دوسری مجلس ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء کو منعقد[۱] ہوئی جس میں لائٹنر نے اورینٹیل یونی ورسٹی کا منصوبہ منظوری کے لیے پیش کیا۔ اس منصوبے میں یہ تجاویز شامل تھیں :

۱۔ ایک سینٹ اور افسران یونی ورسٹی مقرر ہوں۔

۲۔ ایک کمیٹی علمی مقرر کی جائے جس کا کام یہ ہو گا کہ انگریزی کتب درسی کو منتخب کر کے ان کا ترجمہ دیسی زبانوں میں کرے اور زبان ہائے مشرقی کی تعلیم کو باقاعدگی سے جاری کرے اور صرف نحو کی کتب اور ابتدائی رسالہ جات تیار کروائے۔

۳۔ ایک کمیٹی واسطے زبان ہائے مشرقی کے مقرر ہو جس کا کام یہ ہو کہ عربی و فارسی و سنسکرت کی باقاعدہ تعلیم کرائے اور عربی و سنسکرت میں بڑے بڑے شاعروں اور مورخوں کی کتابیں صحیح کروائے اور زبان و علوم مشرقی کا کتب خانہ قائم کرنے اور بڑھانے میں مدد اور سعی کرے۔

۴۔ زبان ہائے مندرجہ ذیل میں امتحان کرنے کی تجویز ہوئی۔ عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، ہندی اور کوئی مضمون علمی یا زبان مشرقی جس میں طلباء امتحان دینا چاہیں۔

۲۷ ستمبر ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب کا جلسۂ خاص منعقد ہوا۔ اس جلسے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ان انگریز مفکروں کی کثرت تھی جو اورینٹل یونی ورسٹی کے حامی تھے۔ اس جلسے میں ۱۱ ستمبر کے منعقدہ جلسے کی کارروائی پر غور کیا گیا اور طے کیا گیا کہ انگریز افسروں کو بھی اس تجویز میں دلچسپی لینی چاہیے اور اس کی حمایت کرنی چاہیے۔ اس جلسے میں تین امور کو زیر بحث لایا گیا:

۱۔ سرمایہ فراہم کرنے کے لیے کون سے وسائل عمدہ ہیں؟

۲۔ کیا تجویز کرنی چاہیے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ سرکار کہاں تک اس تعلیمی منصوبے کی مدد کرے گی، اور

۳۔ کون سا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے امدادی کمیٹی تعلیمی کمیٹی کے منشاء کے پورا کرنے میں مدد دے۔

اس تائیدی کمیٹی میں جو انگریز حکام شریک تھے ان میں سے چند خاص لوگ یہ تھے:

مسٹر برانڈرتھ (کمشنر لاہور)، مسٹر سی۔ یو۔ ایچی سن (ڈپٹی کمشنر)، مسٹر ایگزنڈر (انسپکٹر آف اسکولز)، مسٹر لیپل گریفن، وغیرہ۔"

یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب کا جلسہ عام منعقد ہوا۔ اس جلسے میں

امدادی کمیٹی جو اصلی تعلیمی کمیٹی کی مددگار اور حامی تھی ارکان نے جمع ہو کر یونی ورسٹی کی بنیاد قائم کرنے کی تجویز پر غور کیا اور امدادی کمیٹی نے درخواست کی کہ ہمیں اِس کام میں یہ ہدایت امور مصلحت" اور فراہمی چندہ کے لیے امداد دے اور لیفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں یونی ورسٹی کے قیام کی سفارش کرے۔ اس جلسے میں یونی ورسٹی کی آمدنی اور خرچ کا تخمینہ بھی پیش ہوا۔

شرکائے جلسہ نے یونی ورسٹی کے منصوبے کو منظور کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا یونی ورسٹی کی مجوزہ اسکیم کی ایک نقل لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو بھیجی جائے۔ امید واثق ہے کہ ہز آنر اِس منصوبے کو زیادہ ہمہ گیر سہیل الحصول اور قابل عمل محسوس فرمائیں گے۔

۱۳ر اکتوبر کو لاہور کے کمشنر برانڈرتھ صاحب اور ایچی سن ڈپٹی کمشنر لاہور نے اورینٹیل یونی ورسٹی کی تجویز کو لیفٹیننٹ گورنر سر ڈانلڈ میکلوڈ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے یونی ورسٹی کے قیام پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا لیکن ڈگری اور اسناد دینے کے سلسلے میں کہا کہ گورنمنٹ ہند سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ اور ساتھ ہی وعدہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہے وہ ان تجاویز کی حمایت کریں گے۔[۱]

درحقیقت قدیم مشرقی علوم کے احیاء کی تحریک کو حکومت ناپسند کرتی تھی اِس لیے یہ بات آگے نہ بڑھ سکی لیفٹیننٹ گورنر نے اِس مسئلے پر بعض دوسرے ماہرین تعلیم سے بھی مشورہ کیا میجر این۔ لیز پرنسپل مدرسہ کالج کلکتہ نے گورنر کو محتاط رہنے کی تلقین کی[۲] لیکن

---

[۱] ضمیمہ

[۲] ہسٹری آف دی پنجاب یونی ورسٹی، محولہ بالا، ص ۱۲

انجمنِ پنجاب نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور مدارس قائم کرکے اور دیسی زبانوں کی ترویج و اشاعت کرکے حکومت وقت پر ثابت کر دیا کہ اِس کی تجاویز کتنی ٹھوس اور حقیقت پسندانہ ہیں۔

انجمن پنجاب کی اِس سعی و کاوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے برصغیر کے مختلف علاقوں سے بھی ایسی قسم کے اورینٹیل یونی ورسٹیوں کے قیام پر زور دیا جانے لگا۔ اگست ۱۸۶۷ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے بھی ایک عرضداشت وائسرائے ہند کی خدمت میں پیش کی جس میں دیسی باشندوں میں علو ہمتی اور بلند خیال پیدا کرنے کے نقطۂ نظر سے مروجہ طرزِ تعلیم کو ناقص بتایا گیا تھا اور جدید علوم مفیدہ کو دیسی زبانوں میں پڑھائے جانے کی موقف کی حمایت کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

> ہماری دانست میں حال کے طریقہ تعلیم سے جو سرکار کی طرف سے مقرر ہے یہ مقاصد حل نہیں ہوتے۔ لاکھوں میں سے صرف چند اشخاص کو عمدہ تعلیم کے فوائد حاصل ہوتے ہیں باقی سب محروم رہتے ہیں۔ موجودہ یونی ورسٹیوں میں صرف انگریزی کی تعلیم ہوتی ہے۔ مشرقی اور دیسی زبانوں کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ گو انگریزی مفید اور ضروری زبان ہے تاہم یہ غیر ملک کی زبان ہے۔ اور ہنوز اِس ملک کے لوگ اس کے دقائق کو نہیں پہنچے۔ موجودہ سررشتہ تعلیم کو وسعت دینی چاہیئے۔ اور انگریزی اور دیسی زبانوں زبانیں دونوں سررشتہ تعلیم میں شامل کرنی چاہئیں۔ اس سوسائٹی کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ زبان مشرقی کی تعلیم معہ ان کے کہنہ مشق اور فرسودہ علوم و فنون کے جاری کی جاوے بلکہ ان کی یہ رائے ہے کہ ملک کی زبانوں کو تقویت دے کر مغربی علوم و فنون

کی تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعہ سے کی جاوے اگرچہ لوگ علوم و زبان ھائے مشرقی کے خواھاں ہیں اور اس کو بہت مفید اور دل چسپ جانتے ہیں۔"[1]

اِس عرضداشت میں انجمن پنجاب کی تجاویز کا ذکر کرتے ہوتے یہ بھی کہا گیا تھا کہ:

"اگرچہ اِن تجاویز کا مدعا مقصود بہت عمدہ ہے مگر اِس یونی ورسٹی کے مطالب جو ہم اِن اضلاع کے لیے تجویز کرتے ہیں اِس سے اعلیٰ ہیں۔ پنجاب کی یونی ورسٹی کا منشا یہ ہے کہ یورپ کے علوم اور شائستگی کل ملک میں دیسی زبانوں کے ذریعہ سے پھیلا دے۔"[2]

لیکن یہ بیان درست نہیں، کیوں کہ انجمن پنجاب علوم مشرقی کے احیا کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم کو دیسی زبانوں میں پڑھانے جانے کی بھی شدت سے حامی تھی۔ انجمن کی رائے یہ تھی کہ اُردو اور ہندی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتیں جب تک عربی فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کو تقویت نہ ہو جن سے یہ زبانیں بنی ہیں۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن صرف دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنا دینے کی حامی تھی لیکن انجمن پنجاب مشرقی علوم والسنہ کو بھی ترقی دینا چاہتی تھی اس لحاظ سے انجمن کا موقف ایسوسی ایشن کے موقف سے اعلیٰ تر تھا۔

پنجاب یونی ورسٹی کا قیام:

[3] حکومت برطانیہ برصغیر میں اعلیٰ تعلیم عام کرنے کے منصوبہ پر عمل کرتے

---

[1] ہسٹری آف دی پنجاب یونی ورسٹی، محولہ بالا،

[2] کیلنڈر، یعنی دستور العمل پنجاب یونی ورسٹی کالج، سنہ ۷۵-۱۸۷۴ء، صص ۲۱-۲۵

[3] ایضاً، صص ۲۱-۲۵

تے نئی یونی ورسٹیاں قائم کرنے کے حق میں نہ تھی دوسری طرف کلکتہ یونی ورسٹی اہل پنجاب اور یوپی کے باشندوں کی ضروریات کے مطابق اپنے طریقہ تعلیم کو بدلنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ چناں چہ چھ فروری ۱۸۶۸ء میں اپنے طریقہ کار میں تبدیلی سے قطعی انکار کرتے ہوئے شمالی ہند کے باشندوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے لیے علیحدہ یونی ورسٹی قایم کرلیں۔ ۱۲ر مارچ، ۱۸۶۸ء کو لاہور کے ایک جلسہ عام میں جس کے صدر سر ڈانلڈ میکلوڈ تھے لاہور میں یونی ورسٹی قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔ ۲۷ر مئی، ۱۸۶۸ء کو گورنمنٹ پنجاب نے گورنمنٹ ہند کی خدمت میں یونی ورسٹی قائم کرنے کی سفارش کرتے ہوئے لکھا:

صوبہ ہذا کے اعلیٰ افسران تعلیم کی رائے یہ ہے کہ کلکتہ یونی ورسٹی کا طریقہ پنجاب کی تعلیم کی ضروریات کے مطابق نہیں کیوں کہ اس نے علوم مشرقی کو اپنے سر رشتہ میں مناسب دخل نہیں دیا ہے۔ بلکہ صرف انگریزی کو ذریعہ تعلیم کا مخصوص کیا ہے اور امتحان کا ایسا طریقہ مقرر کیا ہے جس سے اِس صوبے کے افسروں کی رائے میں ایسے کم لیاقت طلباء نکلتے ہیں جو علوم کے دقائق کو نہیں پہنچتے۔" صوبائی حکومت اور مرکزی حکومت کے درمیان یہ خط وکتابت ڈیڑھ سال تک جاری رہی صوبائی حکومت کی طرف سے ۱۱ر فروری کے ایک مراسلے میں ایک نہایت بے لاگ رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا:

یہ امر ظاہر ہے کہ جنھوں نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے وہ اِس تعلیم کے

۱۔ کیلنڈر یعنی دستور العمل پنجاب یونی ورسٹی کالج، ۷۲-۱۸۷۵ء، ص ۳۶

باعث اپنے ہم وطنوں سے علیحدہ ہو گئے ہیں اور اخلاقی نتیجہ اس تعلیم کا اچھا اور عمدہ نہیں ہوا۔"

آخر کار حکومت ہند یونی ورسٹی کے قیام پر اس شرط پر آمادہ ہوئی کہ مجوزہ یونی ورسٹی" یونی ورسٹی کالج" کہلائے اِسے صرف اُسناد دینے کے اختیار ہوں گے۔ لیکن ڈگری دینے کی مجاز نہ ہو گی۔ نیز یونی ورسٹی کالج کے متعلقہ تدریسی اداروں میں انگریزی زبان اور علوم پڑھائے جائیں گے البتہ بعض مضامین دیسی زبانوں میں پڑھائے جائیں گے۔

انجمن پنجاب نے حکومت کی اِس پیش کش پر غور و فکر کے بعد عذرات پیش کیے۔ اور حکومت ہند کے ہر اعتراض کا جواب تفصیل سے دیا کہ وہ اعلیٰ مقصد جس کے لیے چندہ جمع ہوا یعنی" یونی ورسٹی" کے قیام کے ذریعہ زبان ھائے مشرقی کو از سر نو جاری کرنا، اس سے گورنمنٹ عالیہ نے ہم سے انکار کیا ہے۔

لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے اِس کے جواب میں یہ لکھا کہ ہماری رائے بھی آپ کے مطابق ہے مگر ہمارے نزدیک یہ مناسب اور شایان نہیں کہ اِس فیصلے پر کچھ اعتراض کریں جو گورنمنٹ ہند نے اِس قدر غور کے بعد کیا ہے۔[۱]

انجمن پنجاب نے اِس فیصلے کو اِس یقین دھانی کے ساتھ قبول کر لیا کہ یونی ورسٹی کالج علوم مشرقی کے فروغ میں سعی کرتا رہے گا اور جب تک دیسی زبان میں علوم مفیدہ کی تعلیم ہو انگریزی اختیاری زبان ہو گی۔ اس کے علاوہ سینٹ میں دیسی لوگ بھی شامل کیے جائیں گے

۱؎ کیلنڈر ۷۶-۱۸۷۵ء، محولہ بالا، صص ۵۰-۹۴

۸ر ستمبر، ۱۸۶۹ء کو یونی ورسٹی کالج کے اجرا کا اعلان کر دیا گیا اعلان میں "بیت العلوم" کا نام یونی ورسٹی کالج" لاہور رکھا گیا لیکن بعد میں اس کا نام "پنجاب یونی ورسٹی کالج" رکھ دیا گیا۔ سینٹ کا پہلا اجلاس ۱۱ر جنوری ۱۸۷۰ء کو سر ڈانلڈ میکلوڈ کی صدارت میں منعقد ہوا افتتاحی تقریر میں اپنے مراسلے مورخہ ۱۰ر جون ۱۸۶۵ء کا حوالہ دے کر کہا:

"اس چھٹی کی نقل ڈائریکٹر نے اِن اشخاص کے پاس بھیجی جن کو صاحب موصوف نے سمجھا کہ اس معاملہ میں غالباً شوق رکھیں گے۔ اِس امر میں لاہور امرت سر کی انجمن نے بلا تامل و توقف بہت شوق سے تعلق اختیار کیا اور ڈاکٹر لائٹز صاحب کی صلاح سے انجمن نے میری ہدایت کو بہت وسعت دی اور یہ تجویز پیش کی کہ خاص زبان ہائے اور علوم مشرقی کے مطالعے کی ترغیب کے لیے اور دیسی علم و ادب کے قائم کرنے کے واسطے لاہور میں ایک "بیت العلوم" مقرر کیا جائے جس کا نام "اورینٹیل یعنی مشرقی یونی ورسٹی" رکھا جائے دیسی عمائدین اور شرفا نے خود بخود اپنی مرضی سے چندہ جمع کرنے کی تجویز کی اور اس تجویز کی پیروی اس شوق سے ہوئی کہ اِس میں کچھ شک کی گنجائش نہیں رہی کہ رئیس اور شریف نہایت تعلق خاطر اور شوق سے اِس کے گردیدہ ہیں۔ میری رائے میں لفظ مشرقی کا استعمال ہونا مناسب معلوم ہوا اِس واسطے کہ میری دانست میں یہ بات تحقیق ہے کہ "بیت العلوم" مجوزہ کے قائم ہونے سے جن علوم وغیرہ کی ترقی منظور

ہے۔ ان کے مطالعہ میں یورپ کی زبان اور علوم کی تحصیل کے داخل ہوئے بغیر جو اصل مقصد ہے اس کے حاصل ہونے کا امکان نہ ہو گا۔ کچھ مباحث کے بعد یہ نام ترک کیا گیا۔ باقی جو تجویز میرے پاس بھیجی گئی میں نے غور کامل کے بعد اس کی اور اس موقعہ پر میں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ جن وجوہات پر میں نے یونی ورسٹی کے قائم کرنے کی سفارش کی ہے کہ جس کی ضروریات یا مناسب ہونے کی نسبت پہلے مجھے شک تھا وہ تو یہ ہیں کہ کل شمالی ہند کی جو ضروریات ہیں وہ کلکتہ یونی ورسٹی سے پوری نہیں ہو سکتیں مگر خاص وجوہ یہ ہیں کہ مجھے خوب یقین ہے کہ ہم اس مقصد کو جو مدت سے میرے دل میں جاگزین تھا یعنی تعلیم کی ترقی کی مساعی میں خلائق کے سرکردہ اشخاص جب تک ہمارے تعاون نہ کریں اس مقصد کو کسی دوسرے طریق سے مناسب اور موثر طور پر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔"[1]

غرض انجمن پنجاب کی پر خلوص جدوجہد، پنجاب کے نوابوں، راجاؤں اور دیگر امراء و رؤسا اور اشخاص کے تعاون اور دریادلی سے بیت العلوم کا خواب شرمندۂ تعمیر ہوا اور "پنجاب یونی ورسٹی کالج" کا قیام عمل میں آیا جس سے کچھ عرصے بعد مکمل یونی ورسٹی قائم ہونے کی امید بندھ گئی۔

ڈاکٹر لائٹنر پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور انجمن پنجاب یونی ورسٹی کالج کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ پنجاب یونی ورسٹی کالج کے خاص مقاصد یہ قرار دیئے گئے:

۱. جہاں تک ممکن ہو پنجاب کی دیسی زبانوں (اردو و ہندی) کے ذریعہ یورپین علوم و فنون کو شائع کرنا اور دیسی ادبیات کو ترقی اور وسعت دینا۔

---

[1] "کیلنڈر"، ۱۸۷۶ء-۷۷ء محولہ بالا، صص ۵۵-۵۶

۲۔ مشرقی السنہ (عربی، فارسی، سنسکرت) اور ادبیات کی تعلیم تعلیم کو ہر طرح سے تقویت دینا
۳۔ تعلیم عامہ کی نگرانی اور ترقی میں صوبہ ہذا کے اہل علم اور معزز اشخاص کو سرکاری افسروں کے ساتھ شامل کرنا۔

امور مذکورہ بالا "بیت العلوم" ہذا کے خاص مقاصد ہیں مگر یہ امر ملحوظ رہے کہ انگریزی زبان اور ادبیات کی تعلیم کو ہر طرح تقویت دی جائے گی اور جن مضامین کی تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعہ سے مکمل نہیں ہو سکتی اِن مضامین کی تعلیم اور امتحان انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہوں گے۔

احیائے علوم مشرقی

اورینٹیل کالج:

ڈاکٹر لائٹنر کی راہنمائی میں انجمن پنجاب نے اورینٹیل یونی ورسٹی کی تحریک جاری کرنے کے ساتھ ساتھ "احیائے علوم مشرقی" کی عملی کوششیں بھی کیں اِس سلسلے میں ان کا ایک اہم اقدام مدرسہ علوم الشرقیہ کا قیام تھا۔ جو انجمن نے اپنے قیام کے پہلے سال یعنی ۱۸۶۵ء ہی میں کیا تھا لاہور میں سکشا سبھا نے ۱۸۶۳ء میں ہیرا منڈی کے قریب ایک پاٹھ شالہ قائم کیا تھا جس میں ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ پاٹھ شالہ انجمن نے اپنی تحویل میں لے کر اس کی از سر نو تشکیل کی اور اس میں عربی فارسی اور اردو کی تعلیم کا اضافہ کیا۔ اس مدرسے کے سامنے راجہ دھیان سنگھ کی حویلی تھی جہاں گورنمنٹ کالج پہلے پہل قائم ہوا۔ محکمۂ تعلیم کی طرف سے انجمن کے اس نو تشکیل مدرسے کو پچاس روپے ماہوار دینے کا وعدہ کیا گیا جو کبھی پورا نہیں ہوا اور یہ مدرسہ اہل لاہور کی مدد سے کام کرتا رہا۔

مئی ۱۸۶۶ء میں تجربے کے طور پر مدرسہ کے ساتھ کالج کی جماعتوں کا بھی اجرا ہو گیا۔ جن میں مولوی علم دار حسین (اسسٹنٹ پروفیسر عربی د

فارسی گورنمنٹ کالج) اور مسٹر اسسٹنٹ ہفتہ میں دو مرتبہ علی الترتیب اُردو اور طبیعات بذریعہ اُردو پڑھاتے تھے۔ اکتوبر ۱۸۶۶ء میں انجمن کو کالج کے لیے محلہ وچھووالی میں ایک ہندو مدرسہ کی عمارت مل گئی لیکن مالی دشواریوں کے سبب انجمن پنجاب کا یہ اسکول ۱۸۶۷ء میں بند ہو گیا۔ لیکن کالج کی جماعتوں کو جن کے سالانہ اخراجات ۱۶۶۴ روپے تھے جاری رکھا گیا لیکن کالج کی یہ جماعتیں بھی جون ۱۸۶۸ء میں بند کر دی گئیں۔

اس نازک مرحلے پر بھی اہل پنجاب نے ہمت نہ ہاری اور انجمن نے یہ قرار داد منظور کی کہ جس وقت خاطر خواہ امدادی رقم جمع ہو جاتے تو انجمن کی مجوزہ اورینٹیل یونی ورسٹی کے مقاصد کے مطابق مدرسہ اور کالج از سر نو جاری کر دیے جائیں گے۔ اِس سلسلے میں ڈاکٹر لائٹز اور کرنل ہالرائیڈ کے درمیان گفت و شنید ہوتی رہی لیکن السنہ مشرقی کے احیا کے سلسلے میں اس لیے کوئی عملی قدم نہ اٹھایا گیا کہ یونی ورسٹی کے قیام کا مسئلہ تقریباً طے ہوا چاہتا تھا۔ جب ۱۸۶۹ء میں "لاہور یونی ورسٹی کالج" قائم ہو گیا تو اس کے فوراً بعد سب سے اہم مسئلہ مشرقی علوم و السنہ کے ایک عظیم اور باوقار ادارے کے قیام کی کوششیں از سر نو شروع کی گئیں۔

اِس ادارے کے قیام کے لیے انجمن پنجاب نے کئی عام و خاص اجلاس منعقد کیے۔ اشتہارات جاری کیے اور اِس طرح اہلِ پنجاب کو اس بات کا پوری طرح اندازہ ہو گیا کہ پنجاب میں مشرقی علوم کی کسی یونی ورسٹی کے لیے مناسب فضا کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ ڈاکٹر لائٹز نے ہمارے قومی مزاج اور ہمارے تہذیبی شعور کا پورا اندازہ لگانے کے بعد اس اورینٹیل یونی ورسٹی کے قیام کی تحریک شروع کی جس کے قیام کے لیے پنجاب کے امراء اور رؤسا، اور اہل ثروت نے دل کھول کر چندہ دیا۔ چناں چہ یونی ورسٹی کالج کی سینٹ نے اس مسئلے پر فوری توجہ دی اور اپنی پہلی ہی

مجلس میں ایک ایگزیکٹو کمیٹی مقرر کی جسے ہدایت کی گئی کہ علاوہ دیگر ضروری امور کے علوم مشرقی کے فروغ کے سلسلے میں تجاویز پیش کرے اس کمیٹی نے پندرہ مارچ ۱۸۷۰ء کو اپنی تجاویز مرتب کر کے پیش کر دیں جن میں یہ کہا گیا تھا کہ چوں کہ یونی ورسٹی کے لیے چندہ دینے والے دیسی باشندے متفقہ طور پر ایک ایسے عظیم الشان اور باوقار مشرقی بیت العلوم کے قیام کے حامی ہیں جہاں مشرقی علوم والسنہ کی تعلیم جدید تقاضوں کے مطابق ہو۔ لہٰذا کمیٹی اسی سال ایک مدرسہ "مدرستہ العلوم مشرقی" کی سفارش کرتی ہے جس میں سولہ برس سے زیادہ کے طلباء جنھوں نے عربی، فارسی اور سنسکرت میں اوسط درجہ کی تعلیم حاصل کی ہو یہاں داخل کئے جائیں اس سلسلے میں کمیٹی نے دیگر متعلقہ امور کے بارے میں بھی تجاویز پیش کیں۔ سینٹ نے مئی، ۱۸۷۰ء میں سال رواں کا بجٹ منظور کرتے ہوئے ان تجاویز کو منظور کر لیا اور لاہور میں مدرستہ العلوم مشرقی کے قیام کا فیصلہ کر دیا۔ اِس طرح ۱۸۷۰ء میں پنجاب یونی ورسٹی کالج کے قیام کے فوراً بعد یونی ورسٹی کا پہلا باقاعدہ تدریسی ادارہ معرض وجود میں آگیا۔

اگرچہ یہ ادارہ اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے انجمن پنجاب کے اس کالج سے قدرے مختلف تھا جو ۱۸۶۸ء میں بند کر دیا گیا تھا۔ تاہم مقصد اور طریق کار کے اعتبار سے یہ اِدارہ سابقہ کالج اِس تحریک کی قدرتی پیداوار تھا جسے انجمن پنجاب نے ۱۸۶۵ء میں شروع کیا تھا۔

اورینٹیل کالج کے بنیادی مقاصد میں مشرقی علوم کی ترقی اور فروغ اور مشرقی زبانوں کی تدریس و ترویج اور دیسی زبانوں کی حوصلہ افزائی شامل تھی۔ یہ مقاصد اپنے مخصوص انداز میں اِس کالج کے پیش نظر رہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اورینٹیل کالج نے پنجاب یونی ورسٹی کے

قیام اور ترقی میں بھی بڑی مدد دی۔ پنجاب میں کلکتہ یونی ورسٹی سے الگ نظام تعلیم قائم کرنے کی جو جد وجہد انجمن پنجاب اور ڈاکٹر لائٹنر نے شروع کی تھی اِس کا ایک بڑا مقصد جدید علوم کی ترویج کے ساتھ ساتھ مشرقی اور اسلامی علوم کو ترقی دینا بھی تھا۔ اِس زمانے میں مشرقی اور اسلامی علوم کی تدریس و ترویج ہی کو ترجیحی اہمیت حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ انجمن پنجاب کی یہ تعلیمی تحریک بہت جلد صوبے بھر میں پھیل گئی ہمین اسی زمانے میں جب ملک کے دوسرے حصوں میں سر سید احمد خان کو اپنی تعلیمی تحریک پھیلانے میں ناکامی ہو رہی تھی اور طرح طرح کی مشکلات درپیش تھیں انجمن پنجاب کی آواز کو قبول عام حاصل ہوا اور اس کی شاخیں امرت سر، گوردا س پور، قصور، راولپنڈی میں بھی قائم ہو گئیں، اس کے اثرات دہلی اور میرٹھ تک جا پہنچے۔ لوگوں میں تعلیم کے لیے ایک عام تڑپ اور علم کی خاص طلب پیدا ہو گئی۔

اورینٹیل کالج کے مقاصد میں تدریس علوم والسنہ کے علاوہ تحقیق و تصنیف اور ان کی طباعت واشاعت کا کام بھی شامل تھا۔ اِس مقصد کے لیے کالج کے ساتھ مندرجہ ذیل ریسرچ فیلو منسلک تھے۔ الگزنڈر فیلوشپ، میکلوڈ کشمیر سنسکرت فیلوشپ، میکلوڈ پنجاب عربک فیلوشپ، جالندھری طبی فیلوشپ، پٹیالہ میتو فیلوشپ، کپورتھلہ علوم طبی فیلوشپ، پٹیالہ ٹرانسلیٹر، بہاول پور عربی سکالر وغیرہ۔

تدریسی شعبہ کے ارکان درس وتدریس کے علاوہ تحقیق و تصنیف کا کام بھی کرتے تھے۔ کالج سے عربی اور سنسکرت کے علمی و تحقیقی ماہ وار رسالے بھی جاری ہو گئے عربی کا "شفاء الصدور" مولانا فیض الحسن کی اِدارت میں اور سنسکرت کا رسالہ "ودیوداتی (VIDYODAI) پنڈت رکھی کیش شاستری کی اِدارت میں نکلتا تھا۔

ڈاکٹر لائٹنر نے مشرقی زبانوں کی تحصیل کے پرانے طریقوں میں ایک خاص تبدیلی یہ پیدا کی کہ زبان کے مطالعہ کی بنیاد فقہ اللسان پر رکھی اور ادب کے مطالعہ کے لیے سیاسی اور سماجی پس منظر پر زور دیا۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے میں بھی تراجم پر تخلیق کو ترجیح دی۔ ۱۸۷۳ء میں ڈاکٹر لائٹنر بوجہ علالت یورپ چلے گئے اور فروری ۱۸۷۶ء میں واپس آئے۔ جلسۂ عام میں ڈاکٹر لائٹنر نے اس عرصے کی کارکردگی پر اپنی عدم اطمینانی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اورینٹل کالج کی نئے سرے سے ایسی تنظیم کی کہ اس کی علمی شہرت دور دور تک پھیل گئی ۱۸۸۶ء میں ڈاکٹر لائٹنر صحت کی خرابی کی وجہ سے پھر یورپ چلے گئے اور پھر ۱۸۹۹ء میں انتقال ہوگیا۔

ڈاکٹر لائٹنر کی ۱۸۸۱ء تک کی تعلیمی رپورٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورینٹل کالج تدریس و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا ایک ایسا عظیم الشان ادارہ بن گیا تھا کہ اکثر علمی حلقوں میں یہ صحیح معنوں میں "بیت العلوم" کہا جانے لگا۔

"یونی ورسٹی کالج" کے مقابلے میں بعض لوگ کم علمی یا تعصب کی وجہ سے اورینٹل یونی ورسٹی کو غیر مفید یا کم حیثیت ادارہ متصور کرتے تھے۔ خود محکمۂ تعلیم کا رویہ بھی اس کے ساتھ منصفانہ نہیں تھا حالاں کہ حکومت اس عظیم ادارے کو کوئی مالی امداد نہیں دیتی تھی سوائے اس کے کہ اس کے قیام کے لیے یونی ورسٹی کالج کا ایک گوشہ عنایت کر دیا گیا تھا۔ جس کا معاوضہ یونی ورسٹی کالج تدریسی امداد کی صورت میں وصول کر لیتی تھی۔ اورینٹل کالج کی کفالت درحقیقت عوام کی نجی امداد اور امراء و روسا کے عطیات کے منافع سے ہوتی تھی اگر کوئی تعلق تھا تو صرف اتنا کہ اس کالج کا الحاق رسمی طور پر "پنجاب یونی ورسٹی کالج" کے ساتھ تھا۔

ان مشکلات اور غلط فہمیوں کے باوجود اس کا مقابلہ باعتبار معیار

و فضیلت کسی دوسرے جدید طرز کے تعلیمی ادارے سے کیا جا سکتا تھا بلکہ برعظیم کے جدید کالجوں اور یونی ورسٹیوں سے زیادہ باوقار ادارہ تھا یہ دو حیثیتوں کی وجہ سے ممتاز تھا۔ اول یہ کہ اس کے اخراجات کم تھے اور دوسرے یہ کہ اِس کا ذہنی و علمی معیار بلند تر تھا۔ کیوں کہ قدیم و جدید اور مشرقی و مغربی علوم کا سنگم ہونے کی حیثیت سے ایک صحت مند تہذیبی و ثقافتی روایات کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ بجائے نقالی کے یہاں، سیاق و سباق کے حوالے کے ساتھ ملکی زبانوں میں تعلیم دی جاتی تھی جس سے طلبا کے تحقیقی تفکر کو ابھرنے کا موقع ملتا تھا۔

ڈاکٹر لائٹز گورنمنٹ کالج کے پرنسپل بھی تھے اور اورینٹیل کالج کے بھی وہ ان دونوں اداروں کے علمی نتائج سے پوری طرح باخبر تھے اپنی رپورٹوں میں انھوں نے دونوں کالجوں کا موازنہ کرتے ہوتے حکومت کے ترجیحی سلوک کا شکوہ کیا ہے۔

اورینٹیل کالج اپنی شہرت کی وجہ سے دور دور کے لوگوں میں بھی مشہور ہو گیا تھا۔ برعظیم کے علاوہ وسط ایشیا، بخارا، کابل، بدخشاں، تبت، گلگت، سوات، ہنزہ کے علاقوں سے طلباء تحصیل علم کے لیے آتے تھے۔ علامہ شبلی نے بھی مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے فیض حاصل کیا تھا

اورینٹیل کالج کی کارگردگی پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ابتدائی بارہ برس کے عرصے میں ڈاکٹر لائٹز کی کارکردگی میں اور انجمن پنجاب کے مقاصد کی تکمیل میں جو کوششیں ہوئیں وہ بارآور ثابت ہوئیں۔ اورینٹیل کالج نے اِس قلیل عرصے میں تدریسی میدان میں علوم و فنون اور زبان و ادبیات کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ تحقیق و تصنیف کے میدان میں کالج کے علماء و فضلا کے وسیع اور وقیع کام کو برصغیر کے علاوہ یورپ کے مستشرقین نے بھی سراہا ہے کیوں کہ

یہ اپنے محدود وسائل اور محدود دائرہ عمل میں ہندوستان میں ایک ایسے بیت العلوم یا یونی ورسٹی کی مثال پیش کر رہا تھا جو حقیقت میں تو یونی ورسٹی کی سطح پر کام کر رہا تھا لیکن یونی ورسٹی نہیں تھا۔

اورینٹیل یونی ورسٹی کے متعلق سر ڈانلڈ میکلوڈ، لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کا ایک اہم خط

۱۰ر جون، ۱۸۶۵ء کو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر ڈانلڈ میکلوڈ نے ناظم سر رشتہ تعلیم کے نام خط بھیجا تھا جس میں دیسی زبانوں کی توسیع و ترقی اور ان میں مغربی علوم و ادبیات کو سمونے کی تجاویز طلب کی تھیں۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اس سلسلے میں اگست، ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کا جلسۂ عام منعقد کر کے پنجاب کے چیدہ چیدہ امراء روسا اور دیگر اشخاص سے مشورہ کیا اور السنہ شرقی کی ترقی اور دیسی زبانوں کی یونی ورسٹی کے قیام کا خاکہ پیش کیا (جس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے) اس پر ۶۵ امراء اور روسا کے دستخط تھے اِس خاکے کے ساتھ یونی ورسٹی کے قیام کی درخواست منسلک تھی۔

۲ر فروری، ۱۸۶۶ء کو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے اس محضر نامے کا جواب ایک طویل خط کی صورت میں دیا جس میں اِن تجاویز پر اظہار خوشنودی کیا گیا تھا۔ تاہم کوئی حتمی وعدہ نہیں کیا گیا تھا وہ خط یہ ہے:

”میں بڑی خوشی سے بیان کرتا ہوں کہ مجھ کو ڈاکٹر لائٹنر صاحب سے آپ کا ایڈریس درباب ان تجاویز کے جو آپ نے بتجویز کر کے کچھ جاری بھی کر دی ہیں پہنچا یعنی علوم

اور زبان ہائے مشرقی کو ترقی دینا اور علوم و فنون کو دیسی زبانوں کے ذریعہ سے پھیلانا۔ مجھ کو بڑی خوشی ہوئی جب میں نے دیکھا کہ چند الفاظ جو میں نے ڈائریکٹر صاحب سررشتہ تعلیم کو لکھے تھے ان پر اتنی غور ہوتی اور آپ نے توجہ اور بڑی سرگرمی سے اس کو وسعت دی تھی باوجود کہ اس توجہ اور سرگرمی کا آپ سے میں کچھ حق نہ رکھتا تھا۔ :

آپ کے ہمدرد دوست اور صلاح کار جو سینکڑوں میل سفر طے کر کے آپ کے ایڈریس پہنچانے آتے ہیں تاکہ تمہاری خواہشوں اور دلی منشا کو بیان کریں نہ صرف ان کو یورپ کے علوم میں بڑی دسترس ہے بلکہ زبان مشرقی سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں کیوں کہ انھوں نے اور ملکوں میں رہ کر مشرقی قوموں سے ملاپ اور رابطہ پیدا کیا ہے اس لیے وہ جانتے ہیں کہ کیا بات آپ کو پسند ہوگی اور کیا ناپسند ہوگی۔ میں اس کا نہایت مشکور ہوں کہ انھوں نے اِس بات کو سمجھا اور آپ کو راستہ دکھلایا۔ اور آپ کا بھی مشکور ہوں کہ آپ نے یہاں تک ان کی ہدایتوں کی دل و جان سے پیروی کی۔

آپ میں سے اکثر کو معلوم ہوگا کہ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ صاحب کی ہدایت سے جو اس وقت گورنر جنرل ہند تھے قواعد و اصول تعلیم سرکار، افسران سرکار کی ہدایت کے لیے جدید بنیاد پر قائم کئے گئے تھے۔ اِس تجویز کے صلاح کاروں میں لارڈ میکالے صاحب، ٹریویلین صاحب اور ڈاکٹر ڈف صاحب اور دیگر ایسے صاحبان تھے جو ہندوستان کے باشندوں کے دوست اور خیرخواہ منصور ہوتے ہیں۔ چوں کہ دیسی زبانوں کے ذریعہ تعلیم دینے کے نتائج حسب اطمینان ظہور میں نہ آئے اِس لیے

یہ قرار پایا کہ انگریزی کے ذریعہ باشندگان ہندوستان کو علوم وفنون مغربی کی تعلیم ہونی مناسب اور ممکن ہے۔ اِس وقت کسی نے اِس بات کی کوشش نہ کی کہ اِن زبانوں کے ذریعہ تعلیم دی جائے جن کو اقوام یورپ بہت بیش قیمت سمجھتے تھے۔ پس یہ تعجب نہیں کہ اِس قسم کی ناراضگی لوگوں میں پائی جاتے۔ تاہم اِس وقت بھی اکثر لوگوں کی یہ رائے تھی کہ نقشہ تعلیم کا جو مقرر ہوا ہے یک طرفہ اور نامکمل ہے۔ کیوں کہ اِس میں وہ مضامین شامل نہیں جن کی آپ قدر کرتے ہیں۔ اگرچہ بڑی ترقی ہوئی اور ہمارے اہل وطنوں میں سے عمدہ عمدہ طلباء تعلیم حاصل کر کے نکلے اور ہر طرف تعلیم کی خواہش بڑھ گئی۔ تاہم اب بھی بہت سے آدمی ہیں اور ان میں سے ایک میں بھی ہوں جس کی یہ رائے ہے کہ نتائج جو حاصل ہوئے ہیں ان سے یہ پایا جاتا ہے کہ جو صلاح آپ دیتے ہیں درست اور مناسب ہے، کیوں کہ اگرچہ بعض عمدہ طلبا کامیاب ہوئے ہیں تاہم بہت سے طلباء تھوڑی لیاقت حاصل کرتے ہیں خواہ زبان انگریزی کی ہو خواہ اِن مضامین کی جو انگریزی کے ذریعے حاصل کریں اور تعلیم ذہنی عموماً ایسی ناقص ہے کہ اِس سے یہ امید نہیں ہو سکتی کہ اس ملک کے لوگوں میں خود بخود عمدہ خیالی کی عادت پیدا ہو جائے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ غیر ملک کی زبان میں تعلیم دینے سے ضرور تعلیم کی مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ انگلستان میں جہاں شائستگی تعلیم کے لیے لاطینی اور یونانی سیکھنا ضرور رہے وہاں بھی عام تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ ہوتی ہے اِس لیے کوئی وجہ نہیں کہ یہاں کسی مغائر اصول پر عمل کیا جائے بے شک اِن صاحبان عالی شان کو جنھوں نے یہ تجاویز ترمیم شدہ جاری کی تھیں قوی امید تھی کہ جو طلباء ہمارے کالجوں سے پڑھ کر نکلیں گے ان کے دلوں میں ان ملکوں کے علوم وفنون اور انشا کا شوق پیدا ہوگا

اور ان میں اعلیٰ لیاقت حاصل کر کے اپنے ہم وطنوں کے لیے آسان راستہ بنانے میں کوشش کریں گے اور اس طور سے دیسی زبان میں اعلیٰ درجے کے انشاء پرداز پیدا ہو جائیں گے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسی انشاء پردازی کی ضرورت مدنظر نہیں رکھی گئی اور یہ امر صاف ہے کہ اردو اور ہندی میں جو شمالی ہندوستان کی دیسی زبانیں ہیں اس بارے میں کچھ ترقی نہیں ہوئی پس آپ کے ہم وطن لوگ اب تک کچھ وسائل نہیں رکھتے کہ اپنی دیسی زبانوں کے ذریعہ سے ان علوم کو حاصل کریں جو زبان ہائے مغربی میں موجود ہیں۔

مجھ کو اس بات کی امید نہیں کہ زمانۂ حال میں اصلی اور عمدہ انشاپردازی دیسی زبان میں حاصل ہو سکے۔ الاّ اس صورت میں کہ اس غرض کے لیے خاص توجہ اور کوشش ظہور میں آئے۔ طریقہ حال معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ مطلب برآری نہیں ہوتی جو وقت اِن مختلف مضامین کے مطالعے میں جو ہمارے مدارس میں سکھلائے جاتے ہیں جہاں کہ ان مضامین میں بذریعہ انگریزی کے تعلیم ہوتی ہے۔ صرف کرنا ضرور ہے، اگر صرف کیا جائے تو طلباً کو اس زبان میں پختہ ہونے کے لیے وقت کم رہ جاتا ہے۔ بہت سے آدمیوں نے اپنے لڑکوں کی نسبت مجھ سے شکایت کی۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اِس صوبے میں کوئی عمدہ انگریزی دان طالب علم اب تک نہیں نکلا بلکہ ان میں سے بھی نہیں جنھوں نے یونی ورسٹی کا امتحان پاس کیا ہو۔ تعلیم ذہنی میں بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ ہمارے کالجوں اور مدرسوں میں طلباء صرف اِس غرض سے داخل ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو سرکاری ملازمت کے لائق بنا دیں یا صرف انگریزی بول چال سیکھنے میں کوشش کریں۔ اِس قسم کے طلباء نہیں ہیں جو علم کی خاطر پڑھتے ہوں۔

اس سے مجھ کو وہ نقص یاد آتا ہے جس پر مجھے خود افسوس ہے کہ طریقہ تعلیم حال صرف یک طرفہ ہے گو یہ ارادتاً نہیں ہوا بلکہ نتیجتہً اس کا یہ

ہوا کہ عمدہ تعلیم دان تمہارے ہم سے جدا ہوتے جاتے ہیں اور ان کے ہم اختلاط کے لیے کچھ کوشش نہیں ہوتی اور نیز جس انشاء اور علوم کی دیسی لوگ قدر کرتے ہیں اس کی ترقی میں عدم توجہ رہی۔ اسی سبب سے اکثر جانبین کے اہل علم آپس میں غیر محتاط رہے اور ایک دوسرے کے منشا کو نہ سمجھ سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اس مدد اور شراکت سے جو دیسی انشا کے پیدا کرنے میں ان سے کما حقہ حاصل ہو سکتی تھی محروم رہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جہاں کہیں کسی ایک شخص نے اپنی ہمت اور عقل کے بموجب عمدہ علوم کے حاصل کرنے میں کوشش کی ہے وہاں بے شک خاطر خواہ نتائج ظہور میں آتے ہیں۔

سنسکرت کا ایک اشلوک ہے جس کو آپ میں سے اکثر احباب بے شک جانتے ہوں گے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ جس طریقے کو لوگ پسند نہ کریں خواہ کیسا ہی عمدہ ہو اس پر چلنا مناسب نہیں۔ اگر یہی اصول حال کی صورت سے متعلق کیا جائے تو میری رائے میں کوئی طریقۂ تعلیم جس کو آپ پسند کرتے ہیں داخل نہ ہو مکمل یا مناسب تصور نہیں ہو سکتا۔ جب کہ مغرب کے لوگ وحشیانہ حالت میں تھے اور زمانہ بھی تاریکی کا تو اکثر ممالک مشرقی میں علم اور فضیلت میں کمال رونق اور ترقی تھی اور اس ملک کے مصنفان قدیم روشن طبع کی تصانیف کے پڑھنے سے بھی خوب معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں ان لوگوں میں عمدہ قابلیت تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ان کے بعد پیدا ہوئے ان میں وہ قابلیت نہ رہی حالاں کہ دنیا کی عمر جس قدر بڑھتی گئی اسی قدر علوم وفنون ترقی اور منزلت پاتے گئے۔ پس واجب ہے کہ اول تو آپ اس قابلیت کو پھر از سر نو بیدار کر کے ممالک مشرقی کے لیے وہ فضیلت حاصل کریں جو آپ کے حریفوں نے بزور عقل آپ سے چھینی ہوئی ہے

جب آپ کی اولاد عمدہ تعلیم یافتہ اشخاص کے زیر ہدایت اس درجے تک تعلیم پائے گی جو آپ کے بزرگوں کو حاصل تھا تو وہ خود اس بات کو معلوم کر کے اقرار کرے گی اور بڑی سرگرمی سے ان ترقیات کے حاصل کرنے میں کوشش کرے گی جو حال کے زمانے میں زمانۂ گذشتہ پہ ایزاد ہوتے ہیں۔ بلکہ یقین ہے کہ اکثر اشخاص کا مدعا اور فخریہ ہوگا کہ ان علوم کو اپنے ملک میں جاری اور شائع کریں۔ اگرچہ یہ صوبہ تعلیم کے باب میں فی الحال ہندوستان کے دیگر صوبوں کے برابر نہیں کیوں کہ کئی حیثیتوں سے اِس کی حالت امور عالمی کے باب میں ابتر رہی ہے بلکہ اب تک بہ نسبت اور صوبوں کے ابتر ہے۔ یعنی اور صوبوں نے از روئے تجارت اور دیگر اسباب میں ترقی کی ہے۔ تاہم اس باب میں آپ نے ان سے بڑھ کر یہ ایسا قدم آگے رکھا ہے کہ جس سے آپ کو بے حد عزت حاصل ہوئی۔ پس جس سرگرمی اور محنت سے آپ کارروائی کرتے رہے ہیں اِس سے آئندہ کے لیے بہتری کی امید ہو سکتی ہے اور اگر آپ اپنی تجویز کو عقل اور اعتدال سے مکمل طور پر عمل میں لائیں گے تو کچھ شک نہیں کہ عمدہ نتائج ظہور میں آئیں گے اور ہم کو یقین ہے کہ وہ اصول جن پر یہ تجویز قائم کی گئی ہے صحیح اور درست ہیں اور اس اعتبار سے ہم کو امید ہے کہ اس کے فوائد کل ملک میں جاگزین ہو جائیں گے اور نیز یہ بھی یقین ہے کہ اس تجویز کو مغرب کے لوگ بھی دل و جان سے مدد دیں گے اور یونی ورسٹی کلکتہ نے آپ کی زبان ہائے مشرقی کو اپنے اعلیٰ امتحانوں کی تعلیم میں داخل کیا ہے اور نیز مطالعہ اخبار اِن ٹیلی جن سر (INTELIGENSER) ۱ اکتوبر، ۱۸۶۳ء و دیگر کاغذات مندرجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے دیگر اضلاع میں بھی صاحبان انگریز آپ کے حامی اور خیر خواہ ہیں

آپ پر یہ امر مخفی نہ رہے کہ آپ کی کارروائی ان صاحبان کی صلاح اور استصواب رائے سے جو اس باب میں تندہی سے مدد دینے کے قابل ہوں برابر جاری رہنی چاہیئے اور اس کا تصفیہ بڑی احتیاط اور غور سے ہوتا رہے تاکہ اس کام کو جواب سررشتہ تعلیم کی معرفت ہوتا ہے آپ بہت عمدہ طور سے انجام دے سکیں۔ میری رائے میں اس طریق پر مختلف آدمیوں کی رائے سے اتفاق حاصل ہو کر ایسے بڑے بھاری اور جدید کام کا قیام سہل الحصول ہو جائے گا۔ اور یہ بات بھی مد نظر رکھنی چاہیئے کہ یہ ایک بڑا اہم اور عظیم کام آپ کے درپیش ہے۔ پس اول اول آپ کو مناسب ہے کہ آسان امور کے اہتمام پر مضبوط ہو کر بتدریج اس کے اعلیٰ مراتب کے حصول کے لیے کمربستہ رہیں اور جہاں تک مناسب اور اشخاص کو بھی اس باب میں ترغیب دے کر جوش ہمدردی سے اپنے ساتھ متفق اور شریک کریں نہ یہ کہ صرف اپنی کارروائی پر قناعت کر کے غیروں کی اعانت اور شمولیت سے مستغنی ہو جائیں۔

....

فی الحال اِن امورات کی نسبت مباحثہ کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا جو آپ کے ایڈریس میں درج ہیں مثلاً آپ کی یونی ورسٹی کو اختیارات عطائے اسناد و خطاب و ڈگری وغیرہ کا اور ان امیدواروں کو جو یونی ورسٹی سے خطاب وغیرہ حاصل کریں سرکاری ملازمت میں ترجیح دینا۔ مگر ہم کو امید ہے کہ جس وقت آپ کی تجاویز پختہ ہو جاویں گی تو یہ سب امور خاطر خواہ فیصلہ پا کر ہر ایک قسم کے مناسب اختیارات عطا ہو جائیں گے اور قبل اختتام اِس مراسلے کے چند امور ضروری کا تذکرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

آپ درخواست کرتے ہیں کہ حتیٰ الامکان جس قدر چندہ یک مشت لوگوں سے وصول ہوا ہے اسی قدر سرکار والا سے بھی نقد روپیہ عطا ہو اور سالانہ چندے کے مساوی امداد ملا کرے۔ جو نقشہ جات آپ کے خط کے ساتھ منسلک ہیں اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ بروقت تیار ہونے نقشہ جات کے ۸۱۳۸ روپے چندہ یک مشت اور ۱۸۱۰ روپے چندہ سالانہ کا اقرار ہوا۔ چوں کہ تعداد بڑی ہے اور اِس میں چندہ نواب گورنر جنرل بہادر نائب السلطنت ہند اور جناب راجہ صاحب والئی کپورتھلہ معہ چند رئیسان لاہور و امرت سر شامل ہے اور دیگر اضلاع کے لوگوں نے بھی مدد دینے کی خواہش ظاہر کی ہے اغلب ہے جس قدر آپ کی کارروائی مشہور ہوگی اسی قدر روپیہ کے زیادہ وصول ہونے کی امید ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس قدر آمدنی آپ کو اس طور سے حاصل ہو اسی قدر سرکار بھی امداد فرمائے گی۔ لیکن ہم کو جس قدر معلوم ہوا اسی قدر سال آئندہ کے بجٹ میں روپیہ درج کر دیا ہے۔ جو کوششیں تعلیم کے باب میں آپ سے ظہور میں آئی ہیں مراسلت سررشتہ تعلیم مصدورہ ۱۸۵۴ء کے مطابق ہیں اور قواعد امداد بھی اسی مراسلت پر مبنی ہیں۔ اِس لیے ہم کو امید قوی ہے کہ بالفعل ان کوششوں کو تقویت دینے کے لیے جس قدر روپیہ کا محاصل سرکاری میں گنجائش ہو سکا، نہایت خوشی سے عطا فرماتے گی بشرطیکہ سررشتہ تعلیم سرکاری میں کسی طرح ہرج نہ ہو۔

آخر میں ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اپنی کوشش یا سرگرمی اور امید کو جس کے باعث سے آپ نے اس کام کو اختیار کیا ہے خواہ کیسی ہی تکلیف یا ناامیدی ظہور میں آتے دور یا کم نہ ہونے دیں گے کیوں کہ آپ کے منشاء اعلیٰ ملک کی بہبودی اور بہتری پر مبنی ہے پس آپ امید کریں کہ تمام فیاض آدمی جو اس کی بہبودی چاہتے ہیں دل و جان سے آپ کو مدد

دینے میں کوشش کریں گے۔ چوں کہ تعلیم کی حیثیت موجودہ اور اصول اس امر کے مانع ہیں کہ ملک کو ایسے اعلیٰ مضامین میں تعلیم دی جائے جو انسان کے لیے نہایت مفید ہوں۔ لہٰذا سرکار عالیہ انگلشیہ کو اِس باب میں بہت سی مشکلات درپیش ہیں۔ اِس لیے واضح ہو کہ جو مساعی بلیغہ اس باب میں آپ لوگوں سے خود بخود اپنی بہبودی اور ترقی کے لیے ظہور میں آ رہی ہیں ان کو سرکار نہایت خوشی اور اطمینان سے ملاحظہ فرماتی ہے پس ہم خدائے عزوجل سے دست بدعا ہیں کہ وہ قادرِ مطلق اپنی عنایت ازلی سے آپ لوگوں کے جملہ کاروبار میں برکت دے اور اِن کا سرانجام خاطر خواہ فرمائے۔ اور امید غالب ہے کہ ان کے عمدہ نتائج کے فیض سے عوام الناس ایسے بہرہ یاب ہوں جس سے یقین کامل ہے کہ موجب خوشنودی جمیع اہل آفاق ہوگا۔[۱]

۲۔ اُردو زبان و ادب:

انجمن پنجاب کا ۱۸۶۵ء تا ۱۸۸۰ء تک کا پندرہ سالہ دور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں اُردو کی ادبیات کے فروغ کے لیے جو کوششیں کی گئیں وہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بہت سی علمی و ادبی تراجم اردو میں کیے گئے اس کے علاوہ کئی اخبارات، رسائل، اور ادبی اور علمی انجمنیں قائم کی گئی جن کے زیر اثر بلند پایہ تصانیف اردو کے قالب میں ڈھالی گئیں۔ غرض کہ اردو ادبیات میں نشاۃ الثانیہ کا دور شروع ہوا۔

اِھل پنجاب کی زبان اگرچہ پنجابی ہے اور روزمرہ کی ضروریات

۱۔ "ہسٹری آف دی پنجاب یونی ورسٹی"، محولہ بالا، ص ۱۲

کے لیے پنجابی ہی بولی جاتی ہے لیکن علمی و ادبی زبان اردو ہی رہی اس اہم دور میں اُردو زبان کو دیگر مروجہ السنہ پر فوقیت حاصل تھی اہل فرنگ نے بھی اردو ہی کو دفتری زبان قرار دیا۔ اس کی وجہ سے اردو زبان و ادب کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ہندو مسلمان غرض کہ تمام اقوام اردو ہی کو مشترکہ زبان سمجھتی تھیں۔ اس لئے زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے زیادہ سے زیادہ کوششیں کی گئیں۔

نصابی کتب کی فراہمی کے لیے یہ اہتمام کیا گیا کہ ادبی اور معاشرتی مسائل پر کتابیں لکھوائی گئیں اور ایک ذیلی کمیٹی بنائی گئی جو مولوی علمدار حسین، بابو نوبین چندر رائے، بابو چندر ناتھ پر مشتمل تھی اور اس طرح تقریباً ۲۶۰ مضامین اور کتابیں تیار کی گئیں۔ یہ مضامین اور طویل مقالے حسب ضرورت انجمن پنجاب کے رسالے میں قسط وار شائع ہوتے تھے۔ اِن میں کبھی کبھی ذخیرہ بال گوبند، تہذیب الاخلاق وغیرہ رسائل سے کار آمد مضامین بھی منتخب کر کے شائع کئے جاتے تھے۔"[ا]

ا۔ درسی کتب :

اس کتاب میں ہندوؤں اور سکھوں کی مذہبی رسومات بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے حصے میں سنگھی اور سندر سنگھ کا قصہ ہے۔ جس میں کہانی کے انداز میں ہندوستانیوں کی طرز معاشرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اس کے ۸۰ صفحات ہیں۔ تیسرے حصے میں خوش حال چند کا قصہ ہے اس کے ۱۲۱ صفحات ہیں۔ چوتھا حصہ مسلمانوں کی مذہبی روایات کے بیان میں ہے۔ اس میں قرآن شریف، احادیث اور بعض پیغمبروں کے حالات

ا "رپورٹ" سہ سالہ۔ بابت ۱۸۶۶ء، ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء، لاہور: مطبع گنیش پرشاد، باہتمام منشی ہرسکھ رائے وگوبند سہائے)، ۱۵/ اپریل، ۱۸۶۹ء

درج ہیں۔ اس کے ۴۰ صفحات ہیں۔ پانچویں حصّہ میں جہاں آرا بیگم اور محمد یوسف، گیتی آرا بیگم اور محمد جمال کا قصّہ ہے۔ یہاں بھی کہانی کے پیرائے میں مسلمانوں کی طرزِ معاشرت کا موقع کھینچا گیا ہے۔

۲۔ **جوہرِ عقل** : تصنیف منشی عزیز الدین صاحب سررشتہ محکمہ تعلیمات نے یہ کتاب بچوں کے لیے لکھی تمثیلی انداز میں دو کردار کذب و صدق برسرِ پیکار نظر آتے ہیں آخر کذب کو شکست اور صدق کو فتح حاصل ہوئی۔ چوں کہ یہ کتاب بچوں کے لیے لکھی ہے۔ اِس کی زبان بہت آسان ہے۔ عبارت سادہ، صاف اور ثقیل عبارت کی جگہ عام فہم اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

۳۔ **منتخباتِ اُردو** : مختلف کتابوں سے مختلف کہانیاں منتخب کر کے آسان زبان میں لکھی گئیں۔

۴۔ **مفتاح القوٰعد** : یہ انگریزی زبان کی گرامر کی کتاب ہے جس کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ میں روانی نہیں لیکن آسان عام فہم کتاب میں انگریزی زبان کے اصول بتلائے گئے ہیں۔

۵۔ **قصصِ ہند** : مولانا آزاد کے اردو کی پہلی دوسری کتاب ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ کے تحت تحریر کی۔[1]

۶۔ لانگ مین (LONG MAN) کی ریڈر کا ترجمہ لالہ بھرون پرشاد نے کیا۔ مشکل الفاظ سے پرہیز کیا ہے اور آسان طرزِ بیان ہے۔

۷۔ **گل زارِ کشمیر** : مرتبہ پنڈت بشن نرائن۔ اردو الفاظ و محاورات کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا گیا۔

---

[1] مولانا کی تحریر کے متعلق باب ششم میں ذکر آئے گا۔

۸ مختصر جغرافیہ کرۂ ارض : حافظ عبدالرحمٰن نے تحریر کیا۔

۹۔ مفتاح الادب : از مولوی عبداللہ۔ یہ عربی کی قواعد ہے جو آسان اُردو میں تحریر کی گئی تاکہ عربی زبان آسانی سے سمجھ میں آسکے

۱۰ علم حرکت : از بابو ایس۔ ایم۔ مکرجی، پنجاب یونیورسٹی نے (DYNAMICS) پر لکھوائی۔

اِسی طرح منطق، تاریخ اور علم کیمیا وغیرہ پر مضامین اور کتابیں لکھی گئیں جن میں قدیم زبان کو ترک کرکے آسان زبان وبیان اختیار کیا گیا ہے۔

اِخلاقی و مذہبی کتب :

۱۔ "مسئلہ شرعی درباب دعویٰ وراثت منجانب اھل نسواں" یہ کتاب نورمحمد صاحب کمشنر جالندھر نے تحریر کی۔ اِس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ بعض مسلمان فرقوں میں عورتوں کو حقِ وراثت نہیں دیا جاتا لہٰذا یہ حق انھیں ملنا چاہیئے کلام پاک کی آیات اور احادیث سے ان کا حق ثابت کیا گیا ہے۔ اِس مضمون میں فقیر سید شمس الدین صاحب نے مثبت رائے دی اور دیگر مسلمان ممبروں نے اسے بہت پسند کیا۔

۲۔ لیکچر اثبات واجب الوجود و تعالیٰ وتقدس بدلائل عقلی مُنشی کرم الٰہی نے وحدت الوجود کو ثابت کرنے کے لیے چار طویل لیکچر دیئے جن میں پیدائش حیوانات، نباتات اور معدنیات کی دلیلیں پیش کیں۔ یہ ضرورت اِس لیے بھی پیش آئی کہ اکثر لوگ سائنس وغیرہ کی تعلیم کے بعد دھریہ ہو جاتے تھے۔

۳۔ "متاکشرا": یہ کتاب پنڈت گورو پرشاد نے لکھی جس میں مفید شاستر جو عدالت سے متعلق تھے تحریر کئے تاکہ ہندوؤں کے لیے قوانین تیار کرتے وقت اِن کا لحاظ رکھا جاسکے۔

۴۔ "سبب دروغ گوئی" اِس عنوان پر مختلف ادیبوں نے چودہ، مضامین پڑھ کر سنائے جس میں بتایا گیا تھا کہ ملازمت تعلیم کے فقدان کے سبب نہیں ملتی لہٰذا لوگ جھوٹ بول کر اور بے جا خوشامد کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں وغیرہ۔

۵۔ "درباب علو حوصلگی" مصنف فقیر جمال الدین صاحب، اِس مضمون میں حوصلہ پیدا کرنے کی تدابیر بتائی گئی تھیں۔

۶۔ "دختر فروشی" پر چھبیس ۲۶ مضامین مصنفہ محمد حسین، پنڈت دھرم نرائن، مولوی سید مہدی حسینی، منشی رجو لال، منشی محمد وغیرہ۔ انھوں نے بتایا کہ شادی کا نام کر کے کس کس طرح مختلف عقائد کے لوگ اپنی بیٹیوں کو فروخت کرتے ہیں۔

۷۔ "علم اخلاق" از منشی کرم الٰہی۔ اِس مضمون میں اخلاقیات کی تشریح اور اِس کی خوبیوں پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔

۸۔ "در بیان مضرت بے اتفاقی"، منشی کرم الٰہی صاحب نے اِس مضمون میں بے اتفاقی کے ضرر رساں ہونے کی دلیلیں پیش کیں۔

۹۔ درباب انسداد رشوت ستانی" از امین چند اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور۔ اِس مضمون میں مصنف نے بتایا کہ تنخواہ کا کافی نہ ہونا، آئندہ ترقی کی امید نہ ہونا، اچھی تعلیم کا نہ ہونا، بلا دریافت کئے چال چلن شرافت خاندانی کے ہر کس و ناکس کو سرکاری ملازمت میں لے لینا کس کس طرح عوام کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

علم طب: خان بہادر ڈاکٹر عبدالرحیم جو طبی رسالے "بحر حکمت" کے مدیر بھی تھے بہت سی کتابیں تصنیف کیں:

۱۔ رسالہ چند امراض مویشی ہند،

۲۔ "نیا میٹریا میڈیکا"

۳۔ "قرابادین رحیمی"

۴۔ رسالہ علم فزیالوجی" (یہ انگریزی سے ترجمہ ہے)،

۵۔ "علم وعمل": دائیوں کے لیے ہدایات اور زچگی کے متعلق اصول تحریر کیے ہیں۔

۶۔ "علم وفن جراحی" از جناب برج لعل گھوش۔ جراحی کے متعلق مبسوط کتاب ہے۔ پراسپیکٹس آف میڈیسن مولفہ جناب ولسن۔ امراض کا علاج اور مختصر علم جراحی کا اردو ترجمہ ہے۔ امراض کا علاج یونانی اور انگریزی دونوں طریقوں سے بتایا گیا ہے۔ یونانی نسخے حکیم فضل الدین عرف حکیم بوڑا کے ہیں۔

۷۔ "بحرالجواہر" مولفہ ڈاکٹر چتین شاہ۔ یہ عربی کی طبی کتاب کا ترجمہ ہے جسے مترجم نے بہ اعانت مولانا اللہ بخش و میاں احمد جان پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ اِس کے علاوہ لغت کے طرز پر ردیف وار بیماریوں کے نام دے کر ان کی تشریح کی گئی ہے۔ عربی الفاظ کا تلفظ بھی دیا گیا ہے۔

۸۔ رسالہ ہیضہ" مولفہ ڈاکٹر ٹوتا مل صاحب۔

۹۔ "رسالہ فصد از احمد علی۔

۱۰۔ زمرد، اخضر، یاقوت، احمر" از حکیم منور علی۔ اِن جواہر کے خواص اور ان سے علاج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تاریخ:

حکومت پنجاب کی طرف سے پنجاب کے مختلف اضلاع کی تاریخیں شائع ہوئیں ہر ایک کتاب میں پہلے جغرافیائی حالات درج ہیں پھر وہاں کے باشندوں کے رہنے سہنے کا طریقہ، ان کے ذرائع بودوباش، پیداوار وغیرہ اور مختلف اقوام جو جو اس ضلع میں آباد ھیں

ان کے تاریخی حالات درج کیے گئے ہیں:

۱۔ "تاریخ گجرات" از مرزا محمد اعظم اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر،
۲۔ "تاریخ جہلم" " از مرزا محمد اعظم اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر،
۳۔ "تاریخ ہزارہ" از مرزا محمد اعظم اکسٹرا اسسٹ کمشنر،
۴۔ "تاریخ ضلع گڑگاؤں" از سید الطاف حسین اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر،
۵۔ "تاریخ تحصیل فاضلکا" از محمد عظیم، اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر،
۶۔ "تاریخ پنجاب مع حالات لاہور" (مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات سے لے کر اس وقت تک) از سید محمد لطیف، اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر،
۷۔ "تاریخ مدینہ و کعبہ" از نصرت علی، اور
۸۔ "سیر پنجاب"، حصہ اول و دوم، از کالی رائے۔

فلسفہ، اخلاقیات و نفسیات:

۱۔ "رسالہ خواب" اردو ترجمہ از پنڈت بشن نرائن
۲۔ "رسالہ علم منطق" ڈاکٹر اسکاٹ کی کتاب کا ترجمہ،
۳۔ "دستور المعاش والمعد، یعنی دین و دنیا کا رہبر" از منشی گیان چند
۴۔ "رسالہ علم ہیت" از مولانا محمد حسین آزاد،
۵۔ "رسالہ علم اصول قانون" از مولانا محمد حسین آزاد،
۶۔ "رسالہ علم سیاست" از مولانا محمد حسین آزاد، اور
۷۔ "اخلاق برج باشی" حصہ اول، مولفہ لالہ برج باشی لال۔ اردو کی یہ کتاب ہندی کے طالب علموں کے لیے لکھی گئی تاکہ وہ اپنے ماحول کی بے ہودہ فضا سے متاثر نہ ہوں۔ اس کے چار حصے ہیں۔ پہلا حصہ علم، دوسرا عقل، تیسرا دولت اور چوتھا تندرستی کے فوائد ہیں۔

تجزیہ:

ہندوستان میں اپنی حکومت کے استحکام کے سلسلے میں انگریزوں

کے سامنے یہ تجربہ موجود تھا کہ جدید علوم پڑھانے کے لیے دہلی کالج میں اعلیٰ طبقے کو چنا گیا تھا۔ نتیجتاً ان میں سے چند لوگ یقیناً اِس تجربے میں کام یاب رہے لیکن متوسط اور ادنیٰ طبقے اس سے محروم رہ گئے۔

انجمن پنجاب کی تصانیف کو بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انجمن کے سامنے نہ صرف علوم مشرقی کا احیاء تھا بلکہ وہ متوسط اور ادنیٰ طبقوں حتیٰ کہ وہ دیہاتیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مقصد اس کا زرکشی ہو یا کچھ اور لیکن طریقہ تعلیم یقیناً نہایت دور رس نتائج کا حامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی پنجاب کے ادنیٰ سے اعلیٰ طبقے تک چاہیے وہ شہری ہوں یا دیہاتی اردو زبان و ادب کے دل دادہ ہیں۔

انجمن پنجاب میں مختلف علوم پر ۱۸۶۵ء سے عمدہ مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ نصابی کتب کی غیر موجودگی میں اور نیشنل یونی ورسٹی کے لیے نصاب تیار کرنے کے منصوبے پر فوری عمل درآمد شروع ہوا۔ چناں چہ بذریعہ اشتہار جو پہلے کوہِ نور میں شائع کیا جاتا تھا۔ مضامین لکھنے کی دعوت دی گئی اور ان پر انعام دینے کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد خود انجمن کے ادبی رسالے "انجمن پنجاب" میں اور دستی اشتہارات کے ذریعہ مضامین لکھنے کی فرمائش کی گئی۔

ابتدائی ۱۸۶۶ء سے ۱۸۶۸ء تک مختلف مضامین پر عمدہ عمدہ مضامین تیار ہوئے۔ جو پہلے مجلس عاملہ میں پڑھے جاتے تھے اس کے بعد ان مضامین کو انجمن کے جلسہ عام میں پڑھ کر سنایا جاتا تھا اور ان پر بحث و تنقید ہوتی تھی اور معیاری قرار دیے جانے کے بعد انجمن کے رسالے میں شائع کر دیا جاتا تھا۔

اس طرح ۱۸۶۹ء تک صرف و نحو، اردو زبان کی ترقی اور اصلاح

کی تجاویز"، اردو میں علمی اصطلاحات کے اضافے سے اردو کی علمی حیثیت کا تعین"، اردو کو ایک سرکاری، تعلیمی، اور کاروباری زبان کی حیثیت سے فروغ"، اردو زبان کی تاریخ" اور اردو میں دوسری زبانوں کے تراجم کے ذریعہ نئے خیالات اور نئے اسالیب" پر تقریباً تین سو ساٹھ (۳۶۰) کتابیں اور مضامین لکھے گئے اور پسند کئے گئے اور ان میں سے اکثر و بیشتر اسکول اور کالج کے نصاب میں شامل کر لیے گئے۔

یہ کتابیں اور مضامین طبع زاد بھی ہیں اور تراجم بھی بڑی تعداد تراجم کی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ جدید مضامین پر کتابیں موجود نہ تھیں۔ لہذا جو ترجمے کئے گئے ان میں تاریخ تہذیبی روایات کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ چناں چہ فارسی کی ایسی کتب کے ترجمہ کئے گئے جن کی تہذیبی اہمیت مسلم ہے۔

انگریزی کی جن کتابوں کے ترجمے کیے گئے ان میں تاریخ، جغرافیہ سیاست مدن، عدالتی قوانین کی اصطلاحات، اخلاق وغیرہ اور نقشوں کی تیاری شامل ہے۔

یہ تمام مضامین اور طویل مقالے قسطوں میں رسالہ "انجمن پنجاب" میں شائع ہوتے تھے۔ جس کے لیے مطبع انجمن پنجاب قائم کیا گیا تھا۔

"انجمن پنجاب" پورے ہندوستان میں واحد ایسا ادارہ تھا جس میں السنہ شرقیہ کو نئی زندگی نصیب ہوئی۔ کیوں کہ انگریز یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر اہل ہند جدید علوم کے ساتھ ان کی تہذیبی اقدار کو علیحدہ کر دیا گیا تو اہل ہند من حیث القوم خود ان کے لیے ایک ایسی رعایا بن جائیں گے کہ جن کا سنبھلنا اور سنبھالنا ناممکن ہو جائے گا۔ ان کی اخلاقی اقدار کھوکھلی ہو جائیں گی لہذا اسنسکرت، گورمکھی ہندی کے علاوہ فارسی اور عربی کتابوں کے خاص طور سے ترجمے کیے گئے۔ جن پر مسلمانوں ہی کی نہیں

بلکہ اصل ہند کی تہذیب اور ثقافت کی بنیاد موجود تھی۔

یہ ترجمے بڑی احتیاط اور انتخاب کے بعد کئے جاتے تھے۔ ہر موضوع پر اس کے عنوان اور مقصد کے لحاظ سے اسالیب وضع کئے جاتے تھے۔

جدید علوم اور جدید خیالات کا خاص طور پر انگریزی خیالات کا ان تراجم پر براہ راست اثر پڑا۔ یہ ایک سیل رواں تھا جس سے ہر شخص حسب استطاعت فیض یاب ہو رہا تھا۔

اس طرح ان تراجم کے ذریعہ اردو زبان، ادب، خیالات، اسالیب میں انقلاب عظیم برپا ہوگیا۔ اور ساتھ اردو کی لغت میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا۔ نئے خیالات اپنے ساتھ نئے الفاظ کے ذخائر ساتھ لائے اور اس طرح یہ، سرکاری، دفتری، سیاسی، کاروباری، زبان بن گئی اور اس قابل ہوگئی کہ ادبیات کے علاوہ ہر شعبہ ہائے زندگی کی ترجمان بن گئی۔ یہ واحد زبان تھی جس میں تمام جدید رائج علوم کے خزانے منتقل ہو گئے۔

باب پنجم ۵

انجمن کے مشاعرے

۱۔ مفصل رُوداد،

۲۔ موضوعات، اور

۳۔ شرکاء وغیرہ

باب۔ پنجم

انجمن کے مشاعرے

۱۔ مفصل روداد

تاریخ ادب پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں دیگر ادبی روایتوں کے ساتھ مشاعرے بھی فارسی ادب کے ساتھ ہندوستان میں رائج ہوئے۔ "ملک الشعراء" کا لفظ ہی اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ بادشاہوں اور امیروں کے درباروں میں شعراء کی سرپرستی کی جاتی تھی تاکہ وہ فکرِ معاش سے آزاد ہو کر ادبی تخلیقات میں منہمک رہیں۔ شاہی درباروں میں شعراء کی شعر خوانی مشاعروں کی ابتدائی شکل قرار دی جا سکتی ہے۔

اردو نظم کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے اولین شاعر حضرت امیر خسرو نہ صرف دربار میں بلکہ جنگ و جدال میں بھی بادشاہوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اسی طرح قطب شاہیہ اور عادل شاہیہ سلاطین کے درباروں میں اِس قسم کی محفلوں کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ درحقیقت مشاعرے کا مقصد بڑا عظیم تھا۔ مشاعروں میں اپنی تخلیقات پیش کرنے کے لیے صاحب علم و فضل ہونا ضروری تھا۔ کسی ایک شب مشاعرے کے انعقاد کا اعلان ہوتا تھا اور مصرع طرح دے دیا جاتا تھا۔ مشاعرے میں شرکت کے لیے اساتذہ بڑی عرق ریزی سے غزلیں لکھتے اور مشاعروں میں سناتے۔ یہاں غزلیں پیش کرنے

پر انھیں جس قدر داد ملتی اسی قدر وہ مشہور ہوتے۔ یہ مشاعرے تنقیدی نشستوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اشعار کی بندش اور زبان و بیان پر داد دی جاتی۔ میر تقی میر کے متعلق آب حیات میں درج ہے کہ وہ دوسرے شعرا کا کلام سن کر سر ہلانا تک گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن جب کوئی اچھا شعر سنتے تو بے ساختہ داد دیتے تھے گویا شاعر کو سند مل جاتی تھی۔ بادشاہ یا نواب مشاعرہ منعقد کرنا فخر سمجھتے تھے۔ ان ہی مشاعروں کی بدولت شعراء کا کلام سامعین کی وساطت سے عوام تک پہنچتا اور پسند عام و خواص حاصل کر کے استادوں کے زمرے میں شامل ہوتا۔

شاعر حسب علم و توفیق شعر کے فن میں باریکیاں پیدا کرتے اور مشاعروں کی تنقید کی وجہ سے کلام میں عظمت پیدا کرتے۔ کسی ایک ہی خیال کو تخیل کی باریکیوں کے ساتھ مختلف انداز میں پیش کیا جاتا۔ اِس طرح نئے نئے اسالیب اور انداز بیان اور زور تخیل کا اندازہ کیا جاتا تھا۔

"دہلی میں خواجہ میر درد کے یہاں جو مشاعرے ہوتے تھے ان کا ذکر بڑی تفصیل سے مختلف تذکروں میں ملتا ہے۔ اِن کے ھاں جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے ان میں شرکت کرنے کے آداب مقرر تھے۔ ایک مرتبہ بادشاہ وقت ان کے یہاں مشاعرے میں شرکت کی غرض سے آتے لیکن ٹانگ پھیلا کر بیٹھے اور عذر پیش کیا کہ ٹانگ میں تکلیف ہے۔ خواجہ میر درد نے کہا:
"تو پھر تکلیف کرنے کی ضرورت کیا تھی؟" اِس واقعہ سے اس زمانے کی تہذیب ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ بادشاہ ہو یا گدا، جب وہ محفل مشاعرے میں شرکت کرتا تھا تو آداب محفل کا پاس کیا کرتا تھا۔ لوگ اپنے روائتی لباس حسب توفیق پہن کر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ گویا یہ مشاعرے نہ صرف ادبی حیثیت سے بلکہ تمدنی، تہذیبی اور ادبی لحاظ سے اپنے

زمانے کی پوری پوری نمائندگی کرتے تھے۔" [1]

ہندوستان کے صرف تعلیم یافتہ لوگوں ہی میں حضرت امیر خسرو کا کلام مقبول نہیں تھا بلکہ دیہاتوں کی ان پڑھ عورتیں بھی ان کے کلام سے محفوظ ہوتی تھیں۔ دوسری طرف قوالوں نے آپ کے کہے ہوئے قول اور قلبانہ محفلوں میں گا کر اہلِ تصوف کے دلوں کو بھی مسخر کر لیا تھا۔

دکن میں قطب قلی شاہ کی سرپرستی میں مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ خود قطب قلی شاہ پہلا صاحب دیوان شاعر تھا اور مشاعروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ سرکاری اور دفتری زبان اردو تھی لیکن شعر و شاعری کے میدان میں مشاعرے ہی اردو غزل کی ترویج و اشاعت کا کام کر رہے تھے۔ اِن مشاعروں ہی کی بدولت ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کا کلام مقبول ہوا اور صنف غزل کو عروج نصیب ہوا اور اِس طرح شمالی ہند کے گلی کوچوں میں ولی کی غزلیں گائی جانے لگیں۔

شمالی ہند میں خاص طور پر دہلی میں جہاں فارسی اور عربی کا قبضہ تھا یہاں بھی مشاعروں میں لوگ تفنن طبع کے طور پر اردو میں غزلیں سنانے لگے۔ آبرو، ناجی، یکرنگ، حاتم، فغاں، تاباں وغیرہ نے فارسی کے علاوہ اردو غزل پر توجہ دی اور جب صنعت ایہام پسند عام ہوئی تو مشاعروں پر یہی صنعت چھا گئی۔ اُردو زبان میں فارسی کی تراکیب اور مرکبات مقبول ہوئے۔ خود محمد شاہ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جس کی وجہ سے امیر و غریب، ہندی اور غیر ہندی کا فرق ختم ہو گیا۔ محمد شاہ خود بھی شاعر تھا اور مشاعروں کی سرپرستی کرتا تھا۔

شاہ حاتم کے متعلق مولانا آزاد نے آب حیات (ص ۱۱۴) میں لکھا ہے کہ:

"کلیات ان کا بہت بڑا ہے جو اکثر زبان قدیم کی غزل اور قصائد اور رباعیات و مثنوی پر مشتمل ہے۔ . . . . . وہ شاہ آبرو اور

---

[1] آزاد، مولانا محمد حسین، "آب حیات"، لاہور: ص ۱۸۶

ناجی کی طرز میں ہے۔ آخر عمر میں کلیات مذکور سے انتخاب کر کے ایک چھوٹا سا دیوان مرتب کیا اس کا نام دیوان زادہ رکھا۔ کیوں کہ پہلے دیوان سے پیدا ہوا تھا۔ وہ صاحب زادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے۔" اِس کلیات میں مشاعروں کی طرح غزلیں موجود ہیں۔

اِس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آبرو اور ناجی کی طرز غیر مقبول ہو گئی تھی۔ اور دیوان دوبارہ مرتب کرنے میں یقیناً زمانے کی پسند اور ناپسند کا خیال زیرِ غور تھا۔ اِس زمانے میں مشاعروں میں شرکت سے اساتذہ شاگردوں کے کلام کی تصحیح کرتے تھے اور استاد اپنی غزل شاگردوں کو سنا کر اِس کے مقبول ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ خود حاتم جیسے استاذ زمانہ کے سامنے رنگین جو طفلِ مکتب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے انھوں نے جب جرأت اور ادب کے ساتھ حاتم کے شعر کے مصرعہ ثانی کو بدل کر سنایا تو حاتم بہت خوش ہوئے کہ میں اپنے دیوان میں اِس طرح لکھوں گا۔[۱]

مشاعروں کا یہ دور نہایت اہم تھا۔ اگر کسی شاعر کا ایک شعر یا مصرع نئے اسلوب اور جدت کے ساتھ پیش کیا جاتا تو دوسرے دن زبان زد خاص و عام ہو جاتا تھا استاد اپنے شاگردوں کو اپنے مکتبہ فکر سے تربیت دیتے تھے اور شاگرد ان کے نقش قدم پر چل کر اِس مکتبہ فکر کی ترویج و اشاعت کرتے تھے۔

مشاعروں نے عوام کے عقائد کی بھی نمائندگی کی ہے اِس کا ثبوت یہ ہے کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوستان جس سیاسی ابتری میں مبتلا تھا اس کا اثر شاعری پر بھی پڑا۔ آلام و مصائب اور بے کسی کے عالم میں خدا ہی یاد آتا ہے۔ اور اس کے علاوہ تصوف جامی، خسرو اور حافظ کا محبوب

---

[۱] "آب حیات"، محولہ بالا، ص ۱۱۶

موضوع رہا ہے لہٰذا میر و سودا کے زمانے میں خواجہ میر درد کا کلام اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ ایسا موضوع تھا جو عوام میں مقبول ہوا۔ اور متقدین و متبعین شعرا نے اپنے کلام میں تصوف کو خاص مقام عطا کیا۔ تصوف کے علاوہ اثنا عشری شاعروں کے مرثیے مشاعروں کے ذریعہ مقبول ہوئے۔ دہلی کے شعرا نے نہ صرف نظم کے اسالیب میں انقلاب برپا کیا بلکہ زبان میں سادگی سلاست اور روانی بھی پیدا کی۔ دبستان دھلی کی ابتداء بھی ان ہی بزرگوں کے ہاتھوں پڑی لیکن شاعرانہ چشمک نے نظم میں ہجونگاری کی راہ بھی ہموار کردی۔ محفل مشاعرہ میں ہجوگوئی نے بھی راہ پائی۔ سودا اور میر ضاحک کی ھجویات زبان زد عام کرنے میں مشاعروں نے زبردست کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ میر تقی میر جیسے شاعر بھی اِس سے محفوظ نہیں رہے۔

جب مغل سلطنت کا مرکز کمزور ہو گیا، روھیلوں اور جاٹوں کی لوٹ مار احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں دہلی برباد ہونے لگی تو اھل فن نے فرخ آباد، فیض آباد اور اس کے بعد لکھنؤ کا رخ کیا۔ انگریزوں نے نواب غازی الدین حیدر کو شاہی تاج پہنایا اور اب لکھنؤ شاھی دربار بن کر دہلی کا مقابلہ کرنے لگا۔ نواب شجاع الدولہ کے دربار میں عیش و دولت کی فراوانی تھی لہٰذا میر حسن، میر سوز، سودا، میر تقی میر، مصحفی، انشاء، جرات وغیرہ بھی رفتہ رفتہ یہاں پہنچ گئے۔

لکھنؤ کی عیش و عشرت کی فضا میں شجاع الدولہ نے مشاعرے منعقد کئے۔ دھلی کے اہل کمال شعراء نے صنعف نظم کو معراج کمال تک پہنچایا تھا۔ لیکن لکھنؤ کی رنگین فضا میں شعر و ادب کا سرمایہ بھی اِسی رنگین اور تعیش پسندی کا آئینہ دار بن گیا اور معاملہ بندی اور ریختی ایجاد ہوئی۔ ان موضوعات کو ہوا دینے میں مشاعروں کا بڑا حصہ ہے۔ خاص طور پر انشاء اور مصحفی کا دور اِس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ یہ شعرا دربار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرلے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے مشاعروں میں اپنے اپنے شاگردوں کی فوج لے کر جایا کرتے تھے۔ میر مشاعرہ خود

نواب تھے ان کے لیے اِس تماشے سے بڑھ کر اور کوئی دل چسپ تماشہ نہ تھا پورا شہر مشاعروں کی بدولت اِن کی ھجویات سے گونج رہا تھا، لکھنؤ کی فضا میں اچھے شریف خاندانی بزرگ بھی ہزل گوئی اور فحاشی کو اپنی غزلوں میں جگہ دینے لگے۔ کیوں کہ نواب اور اہل دربار ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

انشاء کے علم و فضل کا ہر دانشور نے اعتراف کیا ہے[1] لیکن خود انشاء نواب آصف الدولہ کے دربار میں کبھی شاعر، کبھی بھانڈ اور کبھی نقال نظر آتے ھیں انشاء و مصحفی کی شاعرانہ چشمک نے شہر میں دو گروہ پیدا کر دیے تھے۔ دونوں گروھوں کو دربار کی سرپرستی حاصل تھی آخری معرکہ جس میں سید انشاء نے گڈے اور گڑیا لڑاتے ہوئے ھاتھیوں اور مختلف سواریوں کا جلوس نکالا تھا اِس کی وجہ سے شہر میں فساد اور خونریزی کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ آخر نواب کی مداخلت سے مصحفی کا جلوس روک دیا گیا۔ یہ مشاعروں کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ ایک زمانہ تو وہ تھا جب مشاعرے تنقیدی نشستوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن اب مشاعروں میں اھل علم و کمال کی پگڑیاں اچھالی جاتی تھیں۔ جو دربار کبھی علم و فن کی سرپرستی کرتے تھے۔ اب وہ مشاعروں کے دست و گریبان کا اکھاڑہ بن گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب دہلی کے مرکز کی سرپرستی حاصل تھی اور سرکاری زبان فارسی تھی تو یہ سولھویں صدی تک ہندوستان کی تمام زبانوں کے لیے الہام بنی ہوئی تھی۔ جب قومی ادبار کا زمانہ شروع ہوا تو فارسی پر ایسا جمود طاری ہوا کہ اِس کی بقاء کی تمام علامتیں مفقود ہو گئیں اور جب مرکز سے اُردو شاعری کو سہارا نصیب ہوا۔ اُردو شاعری مشاعروں کی سرپرستی کی وجہ سے پھلی پھولی لیکن یہی

---

[1] شیرانی، محمود خان (مرتب)، "مجموعہ نغز"، لاہور: کریمی پریس، ۱۹۳۳ء

دربار اور مشاعرے اس کے انحطاط کا باعث ہوئے اور خود لکھنؤ کے مشاعروں کی تقلیدی ذہنیت اور درباروں کی عیاشی کا رنگ نئے راستوں کی تلاش میں مزاحم ہوئے۔

اِن طرحی مشاعروں کی بدولت شاعری ایک طرح کا مجلسی اکھاڑا بن گئی جس سے شاعری کے مزاج کو نقصان پہنچا اور شاعری کا مقصد قدرت کلام کا اظہار رہ گیا۔ مشکل زمینیں عجیب وغریب ردیف دقوافی، دو غزلے، سہ غزلے جواب غزل وغیرہ اسی کا ایک نمونہ ہے۔ مضمون کی طرف سے لاپروا ہو کر قافیہ پیمائی شاعری قرار پائی۔ ایک قافیہ میں مضامین کی جدت اس کی ایک مثال ہے۔

لیکن اِن ادبی غلاظتوں میں ہمیشہ بیش بہا شاہکار بھی مل جاتے ہیں جو درباروں کی سرپرستی کے بغیر تخلیق نہیں کئے جا سکتے تھے۔ یہ فن مرثیہ گوئی اور فن مثنوی گوئی ہے۔ اگر درباروں کی سرپرستی نصیب نہ ہوتی تو میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے عوام تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اِس کی ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ نوابین اثنا عشری تھے دوسرے علمائے فرنگی محل علوم قدیمہ پر توجہ دے رہے تھے۔ میر حسن کی "سحرالبیان" کے مقابلے میں دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گل زار نسیم" اپنی نظیر آپ ہے۔

اِن بگڑے مشاعروں کا ایک عظیم فائدہ غزل گوئی کو اور نصیب ہوا کہ آخری دور میں غالب، ذوق، مومن اور ظفر نے ایک ایسی طرح کی بنیاد ڈالی کہ دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی کا فرق ایک حد تک ختم ہو گیا۔

قلعہ معلی میں مشاعرے منعقد ہوتے تھے جہاں اہل کمال جمع ہوتے۔ بادشاہ خود میر مجلس ہوتے تھے۔ اِس دور کے مشاعروں کی غزلیات ندرت خیال، جودت طبع، تخیل کی بلندی کے اعتبار سے اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔

زبان اور لغت کے سلسلے میں بھی اِن مشاعروں نے کارھائے نمایاں انجام دیئے قدیم الفاظ ترک کر کے نئے الفاظ سے اُردو زبان کو مالا مال کیا۔

فارسی کی لطیف تراکیب، نئے نئے اسالیب اور نئے خیالات سے اُردو روشناس ہوئی

اِس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو شاعری کی ترقی کے تمام قدیم راستے مسدود ہو چکے تھے۔ لیکن شاعری فنا نہیں ہو سکتی وہ باقی رہی اور اس کے ساتھ اُپج کا فطری مادہ بھی باقی رہا۔ اگرچہ اس زمانے میں اپج اور جودت طبع کا معیار پست ہو گیا تھا لیکن بعض صورتوں میں جہاں یہ مادہ عام سطح سے اعلیٰ اور بلند تھا اپنا راستہ مسدود ہو جانے کی وجہ سے انوکھی شکلیں اختیار کرنے لگا۔ عوام اور نوابین کے مذاق کی پستی نے مشاعروں کے اِس جذبے کو اِن راستوں پر ڈال دیا جن سے کسی نہ کسی طرح جذبات کی تشفی ہو سکتی تھی۔ ھزل، ریختی، واسوخت غزل کی طرح کی تمام اختراعات اِسی طرح کی اپج کے نتیجے ہیں۔ اِن کے ذریعہ شاعر اِس دورِ انحطاط اور فلاکت میں بھی ذہنی عشرت سے لطف اندوز ہوئے لیکن ایسے مبتذل مذاق اور ایسی پست تحریروں کو کبھی ادبیات عالیہ میں جگہ نہیں مل سکتی۔ ایسی تحریریں عموماً شاعروں کی ذہنیت کے تنزل کا ثبوت سمجھی جاتی ہیں۔

جدید اردو شاعری کی اصلاح اور توسیع کا احساس سب سے پہلے انگریزی ترجموں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شرر، طباطبائی اور اسمٰعیل میرٹھی کے بعض ترجمے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جب انگریزی تعلیم کا چرچا ہندوستان میں عام ہو گیا تو ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ نئی طرز شاعری سے آشنا اور بے حد متاثر ہوا ترجموں کے ساتھ ساتھ نئی طرز کی نظمیں بھی اردو میں لکھی جانے لگیں۔ اِس وقت اردو شاعری کا ذہن اور اسلوب ہندی تھا۔ بحریں فارسی کی اور خیالات انگریزی سے ماخوذ۔ رفتہ رفتہ یہ اجزا ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئے اور ایک ایسا مرکب تیار ہو گیا جسے ہم خالصتاً ہندوستانی کہہ سکتے ہیں۔ اِس تبدیلی کا احساس مقدمہ شعر و شاعری اور مقالات آزاد میں ملتا ہے۔

قومیت، وطن، اور آزادی کا احساس اس وقت پیدا ہوا جب انگریزوں

کا تسلط ہندوستان پر جم چکا تھا۔ ایسے نازک وقت میں اصلاحی جذبات کی بیداری کی ضرورت تھی۔ اُردو شاعری کو معنویت کے اعتبار سے نہیں بلکہ ظاہری شکل و صورت بدلنے کی بھی ضرورت تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جدید شاعروں نے اِس نکتے کو محسوس کر لیا تھا کہ قنوطی شاعری ہر زمانے اور ہر وقت کے لیے موزوں نہیں ہوتی۔ انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ حالات بدل جانے کی وجہ سے قوم کے مردہ جسم میں زندگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ خود انگریز بھی ہندوستانیوں کے تعلیمی نصاب کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔ حکومت کے اشارے پر جب انجمن پنجاب قائم ہوئی اور احیائے علوم مشرقی اس کا نصب العین قرار دیا گیا تو نصاب کی کتابیں تیار کرنے کے سلسلے میں حصہ نظم کا جائزہ لیا گیا۔ نثر میں تو فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، وغیرہ نے معتدبہ کام کیا تھا لیکن حصہ نظم نصاب کی تیاری کے لیے موجود نہ تھا۔ مولانا آزاد نے اِس موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ وہ شیفتہ کی صحت مند تنقید، غالب کی جدت طرازی اور سرسید کی تعلیمی تحریک سے واقف تھے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا اِس سے بہتر موقع اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ نصاب نظم کی تیاری میں غالب بھی شریک رہے۔[۱]

صوبہ پنجاب کی یہ خوش قسمتی تھی کہ کرنل ھالرائیڈ جیسا ذی اثر حاکم جو السنہ شرقیہ میں دلچسپی لیتا تھا۔ وہاں ناظم تعلیمات تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر جو مشرقی زبانوں کے ماہر تھے انھوں نے مولانا آزاد کے مشورے سے جدید مشاعروں کی بنیاد رکھی۔ خود آزاد نے ۱۵ راگست، ۱۸۶۷ء کے جلسے میں کلام موزوں کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا جس میں انھوں نے اردو شاعری کے ادبی معیار میں انقلاب اور شاعروں کے نصب العین میں تبدیلی کی ضرورت پر زور دیا۔[۲]

---

[۱] "اردوئے معلیٰ"، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع جدید، مقدمہ،

[۲] "رپورٹ سہ سالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب، بابت ۱۸۶۶ء، ۱۸۶۷ء، ۱۸۶۸ء، لاہور: مطبع گنیش پرکاش،

مصرعہ طرح پر پڑھنے کی عادت اُردو مشاعروں میں پڑ گئی تھی۔ انجمن پنجاب کے جدید مشاعروں نے اِس کو دور کرنے میں بڑی مدد دی۔ اردو شاعری کے بڑے مراکز مشاعرے ہی ثابت ہوئے ہیں تقریباً تمام قدیم اساتذہ کے شعری مذاق کو سنوارنے اور نکھارنے میں مشاعروں نے بڑا حصہ لیا تھا۔ مشاعرے کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ اردو داں اِس سے مانوس تھے۔ اِس لیے جدید شاعری کو مقبول کرنے کا کوئی ذریعہ مشاعرے سے بڑھ کر کار گر ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ جدید مشاعرے کے پہلے اعلان نے ہیجان پیدا کر دیا۔ اِن حیرت زدہ سامعین کے مجمع کا بھی آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو اِس مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ ان جدید مشاعروں کے بانیوں کی یہ کوشش قدیم حزنیہ شاعری کی بساط ہی الٹ دے گی۔ اور یہ ایک عہد آفرین کوشش ہو گی۔ نئے اصناف سخن، نئے موضوع اور نئے اسالیب محض مشاعروں کی وجہ سے اردو شاعری میں ایک نئے عہد کا آغاز کریں گے۔

مولانا آزاد کو حالی جیسے سنجیدہ اور پر خلوص معاون و مددگار ملے جنھوں نے ان کی کوششوں کو بار آور ہونے میں مدد دی سر سید نے اپنے خط کے ذریعہ ان کی حوصلہ افزائی کی خود حاکم وقت کا مقصد بھی یہی تھا۔ لہٰذا یہ جدید مشاعرے جدید اردو شاعری کے بانی و مبانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جدید اُردو مشاعرے۔

اِن مشاعروں کے انعقاد کی تاریخ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پنڈت کیفی اور ڈاکٹر محمد صادق نے اِس جلسے کی تاریخ ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء لکھی ہے۔ آغا محمد باقر مرحوم[1] اور آزاد کے شاگرد غلام حیدر نثار اِس جلسے کی تاریخ ۸ مئی قرار

---

[1] آغا باقر مرحوم کے پاس مطبوعہ مشاعرے "گلدستہ" کی شکل میں موجود تھے جواب بیگم آغا باقر کے پاس موجود ہیں۔

دیتے ہیں۔ کیفی کی تحریر کے مطابق اِس جلسے کی روئداد ضمیمہ کوہ نور، لاہور مطبوعہ ۱۶ مئی ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ منشورات کے صفحہ بیس (۲۰) پر کیفی لکھتے ہیں:

یہ عظیم الشان جلسہ ادبی دنیا میں کسی جلسے سے کم نہیں ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء کو شام کے چھے بجے انجمن کے اہتمام سے سکشا سبھا کے مکان میں منعقد ہوا۔ حاضرین میں ہندوستانی اصحاب کے علاوہ کرنل ھالرائیڈ، مسٹر جسٹس بولنو جج چیف کورٹ، مسٹر تھارنٹن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ، کرنل میکلیگن، مسٹر ینگ کمشنر اور مسٹر نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور اور نواب عبد المجید خان، فقیر سید قمرالدین وغیرہ اصحاب تشریف رکھتے تھے۔"

آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد نے "نظم آزاد" میں پہلے مشاعرے کی تاریخ ۸ مئی ۱۸۷۴ء لکھی ہے۔ یہی تاریخ درست ہے۔ کیوں کہ اِن کے پاس "رسالہ انجمن پنجاب" کے پرچے موجود ہیں۔ اور اِس میں یہی تاریخ درج ہے۔

۲ مئی ۱۸۷۴ء کی شام کو جلسۂ عام منعقد ہوا اِس جلسے کی ابتداء مولانا محمد حسین آزاد کی اِس تاریخی تقریر ہوئی جس سے اردو شاعری میں انقلاب عظیم برپا ہوا۔ اِس تقریر کے بعد مولانا نے اپنی پہلی نظم "شام کی آمد" اور "رات کی کیفیت" پڑھی۔ جدید شاعری کے متعلق آزاد کی تقریر پر اخبارات[۱] میں مخالفت اور موافقت میں کئی مضامین شائع ہوئے۔

ــــــــــــــــــــــــــ

مــ آزاد، "تقریر"، محولہ بالا۔

[۱] عام طور پر لوگ نئے تجربات سے ڈرتے تھے اور روایت پر جان دینا فرض سمجھتے تھے۔ مولانا آزاد کی تقریر پر مخالفت کے متعلق گارسان دتاسی نے مقالات گارسان دتاسی

باقی فٹ نوٹ ۲۳۰ پر

مولانا آزاد نے اپنی اِس اہم تقریر میں بتایا کہ اُردو زبان کی ابتدا برج بھاشا سے ہوئی اور فارسی الفاظ اِس میں ضم ہوتے چلے گئے۔ درباروں اور عالموں کی زبان سنسکرت کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی لیکن ادائیگی مطلب بڑی خوش اسلوبی سے پورا ہی نے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

رفتہ رفتہ یہ زبان وسیع ہونے لگی۔ امیر خسرو کے زمانے ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِس زبان میں اشعار بھی کہے جانے لگے تھے۔ لیکن شاہجہاں کے عہد کے بعد سے ولی دکنی کے زمانے تک اس میں ادب تخلیق کیا جانے لگا تھا اور دواوین مرتب ہونے لگے تھے لیکن اِن پر فارسی کا رنگ غالب تھا اور آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ خود برج بھاشا کے مقامی خیالات اور اسالیب غائب ہوگئے اور ان کے بدلے فارسی تلمیحات اور محاورات نے جگہ لے لی۔

مخالفت اور موافقت کے باوجود جس نیک کام کی ابتداء ہوچکی تھی وہ اور مشاعروں کا سلسلہ آگے بڑھا لیکن ہم اس جلسے کو مشاعرے کا نام نہیں دے سکتے کیوں کہ محض ایک تقریر اور ایک نظم پڑھنے سے لفظ

باقی ۲۲۹ کا صفحہ ۲۲۹ کا باقی فٹ نوٹ

حصہ دوم صفحہ ۲۰ پر لکھا ہے:

"پنجابی، بابت تیس (۳۰) مئی، ۱۸۷۴ء میں آزاد کی پوری تقریر کی مخالفت کی گئی۔ اِس کے علاوہ اخبار سررشتہ تعلیم اودھ بابت یکم جولائی، ۱۸۷۴ء میں منشی سید غلام حسین اور منشی گوبند لال مدرس نارمل اسکول لکھنؤ نے آزاد کے لیکچر پر تفصیلی تبصرہ کیا۔ اِن تبصروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کے ادیبوں اور شاعروں نے آزاد کی تقریر کو درخور اعتنا ہی نہ سمجھا اور اس کی روح پر غور کرنے کے بجائے فروعی بحثوں میں الجھ گئے۔ قدامت پسندی اور روایت پسندی آزاد کی تجویزوں کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔"

مشاعرے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ البتہ اِس جلسے کو مشاعرے کی ابتدائی کارروائی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

۸ رمئی کی اِس نظم میں "مثنوی موسوم بہ شب قدر" ایک سو پندرہ اشعار ہیں اِس نظم میں اِن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے :

اے آفتاب تو صبح سے طلوع ہوا۔ عالم کے کاروبار میں دن بھر مصروف رہا ہے اب شام ہوئی تو تھک چکا ہے۔ دامن کوہسار میں جا کر سورہ۔ دن میں تیرا حکم چلتا تھا لیکن رات آرام کے لیے بنائی گئی ہے۔ اے لیلائے شب آ! کہ میں تیری آمد کی شان میں قصیدہ لکھوں۔ اب شام ہوتی ہے اور تیرا آبنوسی تخت رواں ہوگا۔ صبح تک تیرا حکم چلے گا اور ــــ

تا صبح ہووے کارگہ روزگار بند آرام حکم عام ہو اور کاروبار بند

تو مشک و عنبر بکھیرتی آئی۔ اب روئے زمین چراغوں سے روشن ہے اور آسمان پر تاروں کے باغ کھلے ہوئے ہیں :

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے
اِس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے

گدا خاک پر، شاہ تخت پر، مچھلی پانی میں اور پرندے درختوں پر سو رہے ہیں۔ گھوڑے پر سوار بھی اونگھ گیا ہے۔ امیر و فقیر، عورت، مرد بچے غرض سب کو نیند آ گئی ہے دن کے تھکے ہارے مزدور، دن بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد مسافر، سب حسب حیثیت اپنے بستروں میں پڑے سو رہے ہیں۔

لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ ہر شخص آرام کر رہا ہے۔ ملائے نکتہ داں چراغ دان کے سامنے بڑی بڑی کتابیں رکھے پڑھ رہا ہے۔ طالب علم امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں کہ کل امتحان ہے۔ لکھ پتی مہاجن اس وقت اکیلا بیٹھا ایک ایک دمڑی کا حساب لکھ رہا ہے۔ نجومی کی ایک آنکھ آسمان پر ہے اور ایک کتاب پر، کیوں کہ

اسے نئی جنتری تیار کرنی ہے۔ اے رات تیرے اندھیرے میں چور نقب لگائے بیٹھے ہیں کہ موقع ملے تو سب کچھ لُوٹ لیں۔ شاعر مضمون تازہ کی فکر میں غرق ہے۔ حق پرست خدا سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔ دور سمندر میں کوئی جہاز چل رہا ہے۔ اہل جہاز خدا اور ناخدا پر امید باندھے بیٹھے ہیں۔ ماں اگرچہ دن بھر کے کام سے تھک گئی ہے لیکن ہاتھ سے بچے کو تھپک رہی ہے کہ ڈر کر جاگ نہ پڑے۔ جس مریض کی یہ آخری رات ہے اس کی عمر کی شمع جھلملا رہی ہے۔ پھر خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

کوئی گھڑی تو ہوش و خرد سے بھی کام لے
وقت سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

آزاد نے اپنی اِس پہلی نظم سے انجمن پنجاب کے مشاعروں کی بنیاد رکھی۔ طرز قدیم سے ہٹ کر، سچائی، سادگی اور سلاست سے ایسی نظم پڑھی جس میں جھوٹے عاشق اور ظالم محبوب کا ذکر تک نہ تھا۔ اصلاحی جذبات کی بیداری نے ظاہری اور معنوی حیثیت کو یکسر بدل دیا۔ رات کی کیفیت کو ایسی خوبی سے بیان کیا کہ قدیم اصناف سخن میں نئی رُوح پھونک دی۔ حالات کے بدل جانے کی وجہ سے قوم کے مُردہ جسم میں زندگی کی لہر دوڑانے والی یہی نظمیں ہیں جن کی ابتدا آج ہوئی تھی۔

انتخاب از مثنوی شب قدر:

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے — اِس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی — اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی
سوتا گدا ہے خاک پر اور شاہ تخت پر — ماہی ہے زیر آب ہے طائر درخت پر
ہے بے خبر پڑا جو پھولوں پہ گھر میں ہے — داماں دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پہ اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی — چوکا ہے بلکہ راہزن نابکار بھی
القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے — عورت ہے یا کہ مرد جواں ہے کہ پیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں — سب آگئے ہیں نیند کی اِس دوم پیٹ میں

جس کو پکارو وہ سوئے خواب عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا

مزدور جا بجا تھے جو دکھ درد پار ہے — اور پاؤں تک سروں کے پسینے بہار ہے
بار گراں غریبوں نے سر پر اٹھائے ہیں — جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں

اب شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے
تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوئے پسار کے

آزاد کی مثنوی کے بعد کرنل ھالرائیڈ نے انگریزی میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا:

یہ جلسہ اِس لیے منعقد کیا ہے کہ نظم اُردو جو چند عوارض کے باعث تنزل اور بدحالی میں پڑی ہوئی ہے اِس کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں اِس واسطے جملہ روٴسا اور اھل علم لوگوں سے جو شعر وسخن اور تصانیف کا ذوق رکھتے ہیں درخواست کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اِس کی طرف توجہ دیں اِس وقت مولوی محمد حسین نے جو مضمون پڑھا اور زات کی حالت پر شعر سنائے وہ بہت تعریف کے قابل ہیں اور ہم سب کو مولوی محمد حسین کا شکر گزار ہونا چاہیئے یہ نظم ایک عمدہ نمونہ اِس نظم کا ہے جس کا رواج مطلوب ہے۔

"نواب لیفٹیننٹ بہادر کو جو اس امر کی طرف توجہ خاص ہے وہ سکریٹری گورنمنٹ کی تحریر سے واضح ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

"جناب لیفٹیننٹ گورنر بہادر ایک اور امر کی نسبت ہدایت فرماتے ہیں جس کا کمیٹی نے کچھ ذکر نہیں کیا اور جو ممدوح کے نزدیک اس ملک کے سررشتہ تعلیم کے افسروں کے لیے قابل غور ہے وہ یہ کہ اردو کی درسی کتابیں جو بالفعل رائج ہیں یا جس کے پڑھانے کی کمیٹی نے سفارش کی ہے ان میں اردو نظم بالکل نہیں۔ مگر اِس میں کوئی کلام نہیں کہ عمدہ نظم تعلیم کا وسیلہ ہے۔"

اِس خط میں ہدایت کی گئی تھی کہ ایسی نظمیں کہی جائیں جو نصاب میں شامل ہو سکیں۔

کرنل ہالرائیڈ کی تجویز کے مطابق پہلا باقاعدہ مشاعرہ تیس مئی ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا۔ اِس کا موضوع برسات تھا۔ گارساں دتاسی[۱] اور ڈاکٹر محمد صادق دونوں نے اِس مشاعرے کو دوسرا مشاعرہ لکھا ہے لیکن درحقیقت یہ پہلا مشاعرہ تھا۔

اِس مشاعرے کے متعلق کیفی اور دتاسی کے بیان میں تضاد ہے۔ کیفی کے بقول اِس مشاعرے میں نو شعرا شریک تھے۔ گارساں دتاسی نے اخبار "پنجابی" کے حوالے سے دس یا بارہ شعرا کی تعداد لکھی ہے جس کو پہلی مرتبہ اپنا کلام سنانے کا موقع ملا۔ لیکن دتاسی کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے کیوں کہ اِس نے جو شہادت پیش کی ہے[۲] وہ یہ ہے:

"پنجابی اخبار نے حالی کی نظم برکھارت کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے:

"جس نے یہ نظم نہ پڑھی ہو وہ پڑھ کر دیکھے کہ شاعر نے کس خوبی سے یہ تصویر بنائی ہے جنھوں نے شاعر کی زبان سے اسے سنا وہ مرحبا کہہ اٹھا اور کوئی صاحب ذوق اِس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ وطن کی خصوصیتوں کو ایسی عمدگی سے بیان کیا ہے کہ اور کسی مثنوی میں اِس کی نظیر نہ ملے گی۔ بڑی بات یہ ہے کہ شاعر نے کوئی بے موسم کی راگنی نہیں چھیڑی اور نہ حسن و عشق کے چرچے کئے پھر بھی اِس

۱۔ "گارساں دتاسی" "مقالات" دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، حصہ دوم، صص ۳۰۔۲۹

۲۔ فرخی، ڈاکٹر محمد اسلم، "محمد حسین آزاد"، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، حصہ اول، ص ۲۵۶

کی سادگی و رنگینی کام کر گئی ہے[1]

حالی کی "برکھارت" (ایک سو بائیس) اشعار پر مبنی ہے جس میں مندرجہ ذیل کیفیات نظم کی گئی ہیں :

"گرمی کی تپش بجھانے والی اور سردی کا پیغام لانے والی "برکھا رت" ہے۔ یہ موسم عارف کے لیے کتاب عرفان اور قدرت کے عجائبات کی کان ہے۔ پورے برس کی جان یہی برسات ہے۔ بہت دعاؤں اور سینکڑوں التجاؤں کے بعد آئی ہے ورنہ ہر جان دار گرمی سے تڑپ رہا تھا۔ صحرا کی ریت بھوبل کی طرح گرم تھی۔ چیتے اور شیر اپنی کچھاروں میں بے سدھ پڑے تھے۔ ڈھور ڈنگروں نے کندھے ڈال دیئے تھے۔ بھینسوں کا دودھ سوکھ گیا تھا گھوڑوں نے دانہ اور گھاس کو منہ لگانا چھوڑ دیا تھا۔ لو کے آرے سے چلتے تھے اور سوار اور پیدل چلنے والوں کے پاؤں گرمی سے نہ اٹھتے تھے :

تھی سب کی نگاہ سوئے افلاک
پانی کی جگہ برستی تھی خاک"

بازار سنسان پڑے تھے البتہ جہاں کنواں تھا وہاں زندگی کے آثار تھے۔ برف فالودے پھل اور پھولوں پر طبیعت لوٹ پوٹ ہوتی جاتی تھی۔ بھوک ختم ہو چکی تھی :

بچوں کا ہوا تھا حال بے حال کملائے ہوئے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا ان کے پیاس سے دم تھے پانی کو دیکھ عم عم

دفعتاً پروائی ہوا چلنے لگی اور آسمان پر دل کے دل بادلوں کے چھانے لگے۔ گھنگھور گھٹائیں، بجلی چمکنے اور جنت کی ہوا چلنے لگی نیز ہر سو بارش ہونے

---

[1] "مقالات گارساں دتاسی"، محولہ بالا، حصہ دوم، ص ۳۳

لگی۔ باغوں نے غسل صحت کیا۔ سبزے میں چمک پیدا ہوئی بارش کا وہ زور بندھا کہ راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اٹکل سے لوگ چل رہے تھے۔ جنگل میں مور اور پپیہے بولنے لگے۔ کوئل کی کوک جی لبھانے لگی۔ مینڈک بھی ٹرانے لگے۔ مسجد اور مندر میں خدا کا شکر ادا کیا جانے لگا۔:

ہے دیس میں کوئی گنگناتا — اور جاتا ہے کوئی ملہار گاتا
اور بانسریاں بجاتے پھرتے — بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے

اے برکھا رت! تو نے گلشن کو جمال دیا۔ کھیتوں کو نہال کیا۔ مور ناچتے ہیں۔ کوئل کوکتی ہے۔ ایک ہی رات میں دنیا بدل گئی۔ تو نے دریاؤں اور جنگلوں میں جان ڈال دی۔ دانے جو خاک میں مل رہے تھے تو نے اِن کو پروان چڑھایا باغوں میں جھولے پڑے ہیں۔ لیکن اِس برسات نے وطن کی برسات یاد دلا دی۔ اے برسات کی ہواؤ! اگر تمہارا گذر وطن کی طرف ہو تو اہل وطن کو ہمارا سلام کہنا۔ ہمارا تمہارا صبح و شام تالاب پر جانا سبزہ و گل کی صحبت وہ آموں کا ٹپکا یہ سب کچھ یاد آجاتا ہے۔

اِس طویل نظم میں حالی نے موسم برسات کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کھینچ کر مناظرِ فطرت کی ترجمانی کی ہے۔ گرمی اور انسانوں کے جھلسنے کی جو ان گنت تصویریں کھینچی ہیں اس نے ان کی اِس نظم کے لیے پس منظر کا کام کیا ہے۔ اِس سلسلے میں انھوں نے جو جزئیات نگاری کی ہے اس کو واقعیت سے قریب کر دیا ہے۔ اور پھر برسات کی آمد اور پُروا ہوا، ابر، بجلی، گھٹا، باغوں کی ہریالی، درختوں کی شادابی کوئل کی کوک، پپیہے کی پی پی کی پکار، مور کی جھنکار اور مجموعی طور پر انسانوں کے حواس پر ان کے اثرات کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس نے اِس نظم کو نہ صرف حقیقت سے بھرپور بلکہ رنگین اور پرکار بھی بنا دیا ہے۔ مقامی فضا اور ہندوستان کے مخصوص ماحول کی ترجمانی بھی اِس نظم کی حقیقت ہے۔ اِس نظم میں حالی نے تصور کی حدیں حب وطن کے اجتماعی

تصور سے ملا دی ہیں اور اِس طرح انھوں نے اِس موضوع کو پیش کیا جو اِس زمانے کا تقاضہ تھا۔ شاعرانہ اعتبار سے یہ نظم بڑی ممتاز ہے۔

حالی کو مبالغے سے نفرت تھی اور وہ اردو شاعری کو زیادہ سے زیادہ حقیقت اور واقعیت کے قریب لانا چاہتے تھے۔ انھیں اس بات کا پورا احساس تھا کہ اردو شاعری اور مغربی شاعری کے مزاجوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن اس کے باوجود ان کی طبیعت کی سادگی پسندی اور واقعیت پرستی انھیں جدید اردو شاعری کی تحریک کے قریب تر لے آئی۔ ان کی تخلیقی کاوشیں اِس تحریک کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔ زبان کی سادگی اور جذبات کی پاکیزگی حالی کی شاعری کے خاص اوصاف ہیں۔ اپنے کلام کو بعید از فہم ترکیبوں نامانوس الفاظ اور غیر ضروری طوالت سے پاک رکھا ہے۔

نہ صرف موضوع بلکہ انداز بیان کے اعتبار سے بھی یہ نظم، اُردو نظموں کے انداز سے مختلف ہے۔ اقتباس از برکھا رت:

دریا بجھ بن سسک رہے تھے	اور بن تری راہ تک رہے تھے
دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان	اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان
جن جھیلوں میں کل تھی خاک اُڑتی	ملتی نہیں آج تھاہ ان کی
جن باغوں میں اڑتے تھے گولے	وہاں سینکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
تھے ریت کے جس زمین پہ انبار	ہے بیر بہوٹیوں سے گلنار
کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں	جھولے ہیں کہ سو لبھو پڑے ہیں
سامان ملے جو دل لگی کے	یاد آتے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اِس گھڑی کا عالم	وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم

اِس پہلے مشاعرے کے متعلق جسے گارسین دتاسی دوسرا مشاعرہ کہتے ہیں مکمل تفصیلات حاصل نہ ہو سکیں، البتہ یہ ضرور لکھا ہے۔:

"بہت سی ممتاز شخصیتوں، ممتاز عہدے داران عدالت، معزز روسا، رؤساء نے اس میں مدد دی۔ عہدیداروں و ملازمین سرکار، کالجوں اور اور مدارس کے اساتذہ اور طلباء پنجاب یونی ورسٹی کے ممبر اور علم دوست حضرات نے اس مشاعرے میں شرکت کی....."
"جب سب لوگ جمع ہو چکے تو لاہور کالج کے پروفیسر الطاف حسین المتخلص بہ حالی نے اپنی نظم پڑھی جس کا نام "برکھا رت" تھا اس کے بعد مولوی الطاف علی نے جو گورنمنٹ گزٹ کے اردو مترجم ہیں اِس موضوع پر ایک نظم آب کرم پڑھی (اخبار پنجابی نے اِس کی بڑی تعریف کی ہے) اس کے علاوہ پانچ اور شعرا کی نظمیں پڑھنے کے لائق ہیں... جب سب شعرا اپنی نظمیں سنا چکے تو ناظم تعلیمات نے اطلاع دی کہ مشہور ہندوستانی ادیبوں کی کمیٹی قائم کی جاتے گی کہ کون سی نظم انعام کی مستحق ہے۔ اِس کے بعد یہ طے کیا گیا کہ آئندہ مشاعرے کا مضمون "سرمایہ زمستان" ہوگا۔"
اِس کے علاوہ اِس مشاعرے میں دوسرے شعرا کی شرکت کا ثبوت بھی

؎ "مقالات گارسین دتاسی"، محولہ بالا، حصہ دوم، ص ۳۰

؎ ایضاً، حصہ دوم، ص ۳۲
" دتاسی کے اِس بیان میں ایک واضح غلطی یہ ہے کہ اِس نے حالی کو پروفیسر لاہور کالج لکھا ہے۔ ڈاکٹر صادق نے بھی اپنے مضمون "آزاد معاصرین کی نظر میں" اِس غلطی کو دہرایا ہے۔ حالاں کہ حالی کا لاہور کالج سے کوئی تعلق نہیں وہ ناظم تعلیمات کے دفتر میں نائب مترجم تھے۔ اور لاہور اچیسن کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں طلبا کے اتالیق تھے (از مکتوبات حالی حصہ اوّل، ص ۱۲۱
" " حصہ دوم، ص ۹۵)

ملا ہے۔ رسالۂ انجمن پنجاب" کا ضمیمہ بابت نومبر، دسمبر، نمبر۶ (چھ) میں ایک مثنوی مولوی عمر جان ولی مدرس مدرسہ فیروز پور جھرکہ کی ہے جو برسات سے متعلق ہے۔ اگرچہ اِس ضمیمہ میں "مروت" کے عنوان کے مشاعرے کی روئداد شائع ہوئی ہے لیکن مولوی محمد جان کی مثنوی "مروت" کے ساتھ ایک اور مثنوی موجود ہے جو "برسات" سے متعلق ہے، حالاں کہ ترتیب کے لحاظ سے اِس مثنوی کو دوسرے مشاعرے میں جس میں مولانا حالی اور آزاد نے برسات کے متعلق نظمیں پڑھی تھیں شائع ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن چوں کہ دوسرے مشاعرے کی تفصیلات حاصل نہیں ہوسکیں یا ضمیمہ شائع نہ ہو سکا ہوگا۔ اِس وجہ سے یہ مثنوی دوسرے ضمیمہ میں منسلک کر دی گئی ہوگی۔

اِس مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے:

باد رحمت کا کہیں جھونکا چلا
شہر دل پر چھائی رحمت کی گھٹا

برسات کے متعلق یہ نظم بڑی خوب صورت ہے۔ اور منظر نگاری اپنے عروج پر ہے۔ پہلے گرمی کا عالم اور اس کی کیفیات، برسات کی آمد کے آثار، گھٹاؤں کا جھوم کر چھا جانا، ٹھنڈی ہوا کا چلنا، بارش کی بہار، برسات کی رات کی حسین منظر کشی، اندھیرے میں جگنوؤں کی چمک، دریا کا جوش پر آنا، دوستوں کا سیر و تفریح کے لیے نکلنا، برساتی پکوان اور دوستوں کا چھین جھپٹ کر کھانا، آموں کی خوشبو کے ساتھ خس کے عطر کی خوشبو، باغوں کے جھولے، غرض برسات کی کیفیات کی بڑی حسین عکاسی کی گئی ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ تشبیہ و استعارات میں توازن، تصور اور تخیل میں حسن، طرز بیان کی صفائی، جوش اور سادگی کے ساتھ عجب لطف دیتا ہے۔ اِس مثنوی میں دھلی کی تہذیب و معاشرت کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ مضامین بالکل نیچرل ہیں اور بیان سادہ، جو جدید شاعری کا انداز مقرر ہوا۔ انتخاب از

برسات، مصنفہ مولوی عمر جان ولی :

جگنوؤں سے وہ چراغاں جابجا — نور انجم ماند جس نے کر دیا
ابر نے جب ہند میں دی یہ خبر — سیر کرنے کو اٹھا یاں ہر بشر
پہنچا سبزہ زار میں کوئی گروہ — کوئی ٹولی چڑھ گئی بالائے کوہ
کوئی دل دادہ زمین کی شان پر — کوئی شیدا ابر کے ہر آن پر
کشتیوں میں بیٹھ دو دو چار چار — دیکھتے پھرتے تھے دریا کی بہار
برق کی آنکھوں میں جو پڑتی چمک — کوئی چلتے چلتے جاتا تھا جھجک
زور سے جب رعد کی ہوئی کڑک — بیٹھ جاتا ہنس کے کوئی یک بیک
باغ تک یوں کھیلتے ھنستے گئے — چہچہے کرتے لگاتے قہقہے
پک رہے تھے پہلے ہی یاں اندھے — اور آموں کے دھرے تھے ٹوکرے
چھین کر ایک ایک منہ میں رکھ گیا — گرم تھا ہونٹوں پر چھالا پڑ گیا

دوسرا مشاعرہ ۳۰ جون، ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا جس کا عنوان "زمستان" تھا۔ پنڈت کیفی نے اپنے مضمون "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ" میں اِس مشاعرے کے شرکا کے نام لکھے ہیں۔[۱]

کیفی کی تحریر کے مطابق اِس مشاعرے میں حسب ذیل نو شعراء شریک تھے:

"شاہ انور حسین ھما، مولوی اشرف بیگ اشرف رئیس دھلی (اسسٹنٹ مترجم محکمہ ڈائریکٹری پنجاب)، منشی الٰہی بخش رفیق، حضرت آزاد، مولوی مقرب علی رئیس جگراؤں، مولوی محمد عمر جان دھلوی شاگرد مرزا غالب، ہیڈ ماسٹر ورناکلر مڈل اسکول فیروزپور جھرکہ، مولوی قادر بخش مدرس انبالہ،

---

۱ آغا باقر مرحوم کے پاس اِس مشاعرے کا طبع شدہ "گلدستہ" اس قدر خستہ و خراب حالت میں تھا کہ اِس کو بوسیدہ ٹکڑوں کا مجموعہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ٹکڑے ایک بڑے لفافے میں محفوظ ہیں لیکن راقم الحروف سے پڑھے نہ جا سکے۔

مولوی عطا اللہ اور مولوی علاؤالدین محمد کاشمیری۔[1]

اِس مشاعرے میں آزاد نے "مثنوی زمستان" پڑھی۔ اِس مثنوی پر ان کے معاصرین نے اور ہندوستان کے اکثر و بیشتر اخبارات نے سخت تنقید کی۔[2] اخبار پنجابی کے پچیس جولائی ۱۸۷۴ء کے شمارے میں آزاد کی مثنوی "زمستان" پر بڑی سخت تنقید کی جسے گارسین دتاسی نے یوں نقل کیا ہے:

"اپنے نام کی مناسبت سے انھوں نے شاعروں کو ہر طرح کی آزادی دے دی ہے۔ انھوں نے دنیا بھر کے شاعرانہ مبالغوں اور ترکیبوں کو یکجا کر دیا ہے۔ اِن کی نظم کا تین چوتھائی حصّہ تو ان کے اساتذہ کا ترجمہ ہے جو ایک جگہ ڈھیر کر دیا ہے۔ انھوں نے اِن چیزوں کا ذکر کیا ہے جنھیں نہ کسی نے کبھی دیکھا اور نہ بیان کرنے کا قصد کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک ایسے خواب کی تصویر کھینچی ہے جس کی تعبیر ممکن نہیں۔ مثلاً کیا کبھی ہمارے ملک میں ایسی سردی ہوئی کہ دریاؤں کا پانی یخ بن گیا ہو۔ اور بلا کشتی کے لوگ دریاؤں کے پار جانے لگے۔؟ ہم تو اپنی سرزمین کے مناظر کی تصویر دیکھنا چاہتے تھے اور آزاد نے اِن گاڑیوں کا ذکر کیا ہے جنھیں سرد ممالک کے بارہ سنگھے کھینچتے ہیں اور اِن ممالک کا نقشہ کھینچا ہے جو ہمیشہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ . . . . ."

ڈاکٹر اسلم فرخی نے اِس مثنوی کو آزاد کی شاعری پر "ایک بدنما داغ" کہا ہے۔ لیکن آزاد کے وسط ایشیا کے سفر، آبِ حیات کی تیاری کے سلسلے میں مواد کی فراہمی، انجمن پنجاب کی سماجی سرگرمیاں اور جدید اُردو شاعری کی بنیاد کے پس منظر کو سامنے رکھ کر اِس مثنوی پر تنقید کرنی ہوگی۔ مندرجہ بالا تمام منصوبے آزاد کے پیش

[1] منشورات

[2] مقالات گارسین دتاسی، محولہ بالا، حصہ دوم، ص ص ۳۲-۳۱

نظر تھے۔ ادر سفر کے دوران موسم سرما سے اِن کا واسطہ وسط ایشیا میں پڑ چکا تھا۔ اِن تمام اثرات نے آزاد میں وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ اِس مثنوی میں یہ تمام اثرات اور تخیلات اُبل پڑے جس کی وجہ سے اِس مثنوی میں آہنگ اور تسلسل باقی نہ رہ سکا۔

یہ مثنوی ایک سو تینتالیس اشعار پر مبنی ہے۔ ابتداء سرما کی کیفیت سے کی ہے:

باغ پر جب ہے تیرے قہر کا جھوکا آتا
ڈر کے ہر برگ ہے پیوند زمین ہو جاتا

تیرے سناٹے سے ہوتی ہے ہوا جان نبات | خوف کے مارے دھل جاتے ہیں طفلاں نبات
تھرتھراتے ہیں کھڑے سارے جوانان چمن | منہ چھپاتے ہیں گل و سنبل و ریحان چمن
ہیں شجر سر پہ کھڑے خاک اڑاتے سارے | گل و گلزار ہیں ویران نظر آتے سارے
نغمہ سنجانِ چمن پر ہیں پھیلاتے بیٹھے | اور پر و بال میں ہیں منہ کو چھپائے بیٹھے

ٹھنڈک کے اثرات:

خلق سے دفع وباؤں کی بلا ہوتی ہے | اور مریضوں کو تیرے دم سے شفا ہوتی ہے
خشک ہوتی ہے مزاجوں کی رطوبت تجھ سے | پاتا ہر میوۂ شیریں ہے عذوبت مجھ سے
اب عمل میں تیرے آرام سے جیتے ہیں | گرم کھاتے ہیں غذا آب خنک پیتے ہیں
یا تو گرمی سے نہ تھا پاس بھی بیٹھا جاتا | اور بغل سے دل وحشت زدہ نکلا جاتا
یا ہیں اب ہاتھ کو بغلوں میں دبائے لیتے | آگ ہاتھ آئے تو دل میں ہیں چھپائے لیتے
مارے سردی کے جگر سینوں میں تھراتے ہیں | بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں

کوئی چھینٹ کا فرغل اوڑھے اِس طرح بیٹھا ہے جیسے بلبل پر پھیلا کر بیٹھتی ہے۔ کوئی لحاف اوڑھے بیٹھا ہے، کسی نے انگیٹھی سنبھال رکھی ہے۔ سانس کی بھاپ دھواں بن کو نکل رہی ہے۔ اڑتیس اشعار میں اِس کیفیت کو بیان کیا ہے۔ پھر چودہ اشعار کا ایک قطعہ ہے۔

اقتباس:

کر دیا تو نے خلقت کو ہر اک حال میں مست
ہے کوئی کھال میں مست اور کوئی شال میں مست

اِس قطعے میں شاہ و گدا، بچے، بڈھے، جواں کس کس طرح سردی کی راتیں مزے لے لے کر گزارتے ہیں نظم کئے ہیں کہ جوان جوانی کے، بچے کہانی کے، بزم احباب کے، گانے بجانے کے پان کی گلوری چبانے کے اور کبھی حقے کے گھونٹ لے کر مطمئن ہوتے ہیں۔ صوفی و رند کا ساقی زمستان ہے۔ اگر شراب نہیں تو خیال ہی میں مست ہیں۔ کچھ لوگ چائے سے دل بہلا رہے ہیں:

شب سرما میں اگر لطف ہے مے نوشی کا / تو اسی شب میں مزا مجلس خاموشی کا
ہیں کبھی عالم ارواح کے مہماں آتے / بزم دربار میں ہیں صاحب فرماں آتے
دل کے ایوان میں ہیں وہ آ کے عدالت کرتے / ہیں کتابوں کے وکیل ان کی وکالت کرتے

اِس کے بعد سترہ اشعار ہیں جن پر ناقدین نے بہت لے دے کی ہے وہ در حقیقت آزاد کے اِن خیالات اور منصوبوں کی طرف اِشارہ ہے جس میں انھوں نے تاریخ ہند کے علاوہ اپنا سفرنامہ تحریر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اِس سرد رات کی کیفیت خود ان پر اس طرح حاوی ہوگئی کہ اِن کا ذہن اصل مضمون سے بھٹک کر اپنے مضمون میں گم ہوگیا۔ اور وہ منصوبے تخئیل ہی میں مجسم ہو کر اِن کے سامنے آ گئے اور خیالات کا بھٹک جانا اِس مثنوی کا شاعرانہ عیب بن گیا۔ عالم جنون کی تصانیف کو اگر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آزاد پر جنون طاری نہ ہوتا تو وہ کیا کچھ نہ تخلیق کرتے۔ اِسی لیے اپنے اِن قلمی مسودوں میں وہ خود کو "ہمہ داں" لکھتے ہیں۔

اِن سترہ اشعار میں فردوسی کے شاہنامے کے کردار ہیں، مثلاً جام جم، جمشید، ضحاک، رستم، سہراب، سکندر، آب حیوان اور فقر۔ ژند و پاژند اور زرتشت کا ذکر ہے اِن اشعار میں ایران کے سفر کی یاد تازہ ہوتی معلوم ہوتی ہے

یہ سخن دان فارسی کا خاکہ ہے اِس کے علاوہ آزاد کے ذہن میں جو تاریخ ہند کا خاکہ تھا اس کے سلسلے میں وہ محمود، جے پال، چنگیز اور ہلاکو کا بھی ذکر کر گئے۔

انجمن پنجاب سے جو ان کو دلی تعلق تھا اور وہ اِس انجمن کو کہاں تک ارتقائی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اِن بکھرے ہوئے خیالات کو آتش و ناسخ تک لے آئے۔ یہ دراصل آب حیات کا خاکہ تھا جس میں رنگ بھرنا باقی تھا۔

وسط ایشیا میں انھیں جس شدید سردی سے واسطہ پڑا تھا اس کا نقشہ اِس طرح کھینچا ہے کہ سامعین حیران تھے کہ ایسی سردی کہاں پڑتی ہے کہ بارہ سنگھے گاڑی کھینچتے ہیں۔

دراصل آزاد ایک جدت طراز طبیعت کے مالک تھے اور جدت طرازی کے ساتھ پُرگو بھی تھے۔ کبھی کبھی اپنی قابلیت پر بھروسہ کرکے وہ شعر کے سرانجام میں زیادہ اہتمام سے کام نہیں لیتے تھے۔ یہی کیفیت اِس مثنوی میں نظر آتی ہے۔ آزاد کا کلام اپنے معاصر شعرا میں جوش کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ آزاد لطافت نگاری کے اِس قدر دل دادہ تھے کہ جب تک شعر میں کوئی نزاکت اور خیالات میں نیا پن نہیں پیدا کر لیتے انھیں اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ جدید حسن پیدا کرنے کی کوشش اور قدیم روایت کا دامن تھامے رکھنے کی وجہ سے اِس مثنوی میں ایک کش مکش کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ انھوں نے غیر متوقع طور پر فارسی الفاظ نسبتاً زیادہ استعمال کئے ہیں کیوں کہ اِن کا ذہن اِس وقت تک سفر کے تاثرات ظاہر کرنے میں ناکام رہا تھا۔ لہٰذا انھوں نے مثنوی زمستان کا سہارا لیا۔ اِن خامیوں کے باوجود اکثر اشعار نشست الفاظ، استعاروں کی خوبی اور لطافت کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔

دوسرے مشاعرے کی نظموں میں آزاد کے علاوہ ایک مثنوی غلام نبی صاحب مدرس کی بہ عنوان زمستان۔ گلدستہ نمبر ۲ میں شائع ہوئی۔ یہ رسالہ انجمن پنجاب کا ضمیمہ ہے۔ جو "گلدستہ نمبر ۲" کے نام سے شائع ہوا۔ ضمیمہ

بوسیدہ ہونے کی وجہ سے نظم کے ابتدائی الفاظ کیڑے چاٹ گئے لیکن اس کے باوجود بعض اشعار مکمل ہیں۔ یہ مثنوی اٹھائیس اشعار کی ہے۔ کئی اشعار وزن میں نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غلام نبی صاحب کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اصغر تخلص کرتے تھے۔

موسم سرما کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ موسم دوسرے موسموں پر سبقت لے گیا ہے۔ بچوں کی سی زبان میں تک بندی کی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر موزوں کرتے وقت نظیر اکبرآبادی کی نظم ان کے سامنے تھی۔ معاملہ بندی کے اعتبار سے جرأت کا رنگ بھی موجود ہے۔ کہیں اچھے شعر بھی نکالے ہیں۔

نمونہ کلام:

دکھاتی ہے بس چاندنی بھی بہار — ستارے بھی ہوتے ہیں گوہر نثار
جدھر دیکھو عالم ہے ایک سیر کا — کہاں لطف یہ موسم غیر کا
کبھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہے چلتی ہوا — کہیں برف پڑتی ہے بس خوشنما
گلے سے لپٹ کر جو سوتے ہیں دو — لواز بسکہ محفوظ ہوتے ہیں وہ
دوشالہ کوئی اوڑھے کوئی لحاف — کوئی پہنے زر بفت صاحب کفاف
کوئی پہنے سنجاف کوئی سمور — کہیں کوئی نادار تاپے تنور
ہے سرما کا اصغر یہی فیض عام — کہ خوش اس میں رہتے ہیں ہر خاص و عام

اس مشاعرے کا حال دتا سی نے پنجابی کے حوالے سے یوں لکھا ہے:

"مختلف فرقے کے لوگ اپنے آپ کو یوں یک جا دیکھ کر متحیر ہوئے۔ مجمع کو دیکھ کر دلی کے اردو ئے معلی کے بازار کا دھوکا ہوتا تھا۔

دس یا بارہ شعرا ایسے بھی تھے جن کو پہلی بار کلام سنانے کا موقع ملا تھا۔ ان کے اشعار کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلی اور پنجاب کے شعراء ناظم صاحب تعلیمات کے مقصد کو اچھی طرح سمجھ گئے

اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اِس قسم کی دو تین مجلسوں کے بعد وہ شراب اور ساقی کا ذکر ترک کر دیں گے۔ اور مناظر قدرت کی تصویر کھینچیں گے۔ ہم اپنے اعلیٰ خیال شعرا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے طرز تحریر کو نہ بدلیں اور حسب سابق ہمارے بزرگوں کے نقش قدم پر چلیں۔ جدت پسندوں کی زیادہ قدر نہیں ہوتی کیوں کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اِس قسم کی نظموں کو پسند کرتے ہیں[1]۔"

.......٭.........

---

[1] "مقالات گارسین دتاسی" محولہ بالا، حصہ دوم، ص ۳۲۔ ۳۱

ضمیمہ[۱]

اخبار انجمن پنجاب" یعنی مشاعرہ

انجمن پنجاب نمبر ۲

تیسرا مشاعرہ ۳؍اگست ۷۴ء۱۸ کو منعقد ہوا اِس مشاعرے کا عنوان "امید" تھا۔ اِس مشاعرے میں مندرجہ ذیل شعراء نے شرکت کی :

"مولوی عمر جان ولی دھلوی مدرس فیروز پور جھرکہ، مولوی الطاف حسین حالی، محمد مرزا بیگ خان نبیرہ موسس الدولہ اساس الملک نواب فاضل بیگ خان بہادر ثبت جنگ رئیس دھلی، مرزا محمد عبداللہ بیگ مضطر عرف سردار مرزا خلف مرزا ایوب بیگ رئیس دھلوی، مرزا محمود بیگ راحت شاعر دھلوی، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی اشرف بیگ خان اشرف رئیس دھلی اسسٹنٹ مترجم محکمہ ڈائرکٹری پنجاب، شاہ انور حسین ہما، مولوی عطا اللہ خان عطا، شیخ الٰہی بخش رفیق۔"

پہلی مثنوی مولوی محمد عمر جان صاحب دھلوی مدرس فیروز پور جھرکہ نے پڑھی۔ چھبیس اشعار امید کی صفات سے متعلق ہیں۔ نمونہ :

ہر شخص کی کچھ نہ کچھ طلب ہے　　　　امید پر اس کا نام کب ہے

۱؎ انجمن پنجاب نمبر ۲، لاہور انجمن پنجاب، جولائی سنہ ۱۹۷۴ء
(یہ گلدستہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی صاحب مرحوم نے عنایت کیا تھا)

گرہ ذات خدا پہ ہے بھروسہ امید ہے اِس کا نام سچا

اِن صفحات کے بیان کرنے کے بعد ایک عنوان ہے "بیان خدمت امید بی بی رحمہ زن ایوب پیغمبر علیہ السلام"۔ یہ کہانی چوّن (۵۴) اشعار پر مبنی ہے اِس میں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری اور لاولدی کا بیان ہے۔ پھر جب لوگ ان کی بیماری سے تنگ آکر انھیں جنگل میں ڈال دیتے ہیں تو بی بی رحمہ کس طرح شہر جاکر کھانا مانگ کر لاتی تھیں اور محض اِس امید پر ان کی خدمت کئے جاتی تھیں کہ ایک دن وہ ضرور تندرست ہو جائیں گے۔ اِس مثنوی کے خاص خاص اشعار یہ ہیں:

امید پہ تھیں وہ کیا ہی شاداں گل زار تھا ان کو وہ بیابان
وہ دھوپ کو جانتی تھیں مہتاب گرمی کی بھبک سے اور شاداب
جاڑے کا خطرہ نہ اِس خوشی میں برسات کا ڈر نہ ان کے جی میں

نا امیدی سے گھبرا کر پھر خدا سے امید باندھتی ہیں:

صدقے کیا تجھ پہ سارا سامان بچے بھی ہوتے ہیں تجھ پہ قربان
دنیا میں رہے ایک جان حضرت اور اس پہ بھی دم بدم مصیبت
صد شکر کہ جیتے ہیں پیغمبر امید بندھی ہوئی ہے تجھ پر

رات کو شہر جاتے ہوئے:

کانٹا جو چبھا کھینچ لینا مژدہ یہی اپنے دل کو دینا
اب شہر میں پہنچے ایک دم میں مقصود ملے گا دو قدم میں
اِس زور سے دوڑ دوڑ چلنا دروازۂ شہر پر سنبھلنا

اگر کسی نے کھانے کو کچھ دے دیا تو ایسی خوش ہوتیں جیسے ہفتم اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ خوش ہوتیں کہ اب یہ کھانا نبی کو جاکر کھلاؤں گی اِس خوشی میں وہ بہت جلد راستہ طے کر کے حضرت ایوب علیہ السلام کے پاس پہنچتیں۔ اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر ان کو کھلاتیں اور اللہ کا نام لیتی جاتیں۔ جو کچھ بچتا خدا کا شکر کر کے کھالیتیں۔

اِسی طرح دن گذرتے رہے ایک دن کسی نے انھیں کچھ نہ دیا یہ نا امید ہوئیں کہ اتنے میں ۔

جب ہی کسی گھر سے نکلی اک زن ۔ بے رحم زمانہ رحم دشمن
بولی تمہیں چاہیئے جو کھانا ۔ اِس شرط پر ہے تم کو ملنا
ہیں بال بڑے تمہارے سر پر ۔ کچھ ان میں سے مجھے دے کتر کر
بی بی نے جو سنا رزق کا نام ۔ خوش ہو کے کیا قبول یہ کام
جھٹ بال دیئے اسے کتر کر ۔ کھانے کو لیا طباق بھر کر
امید کی واہ رے مسرت ۔ گر جان بھی لیوے تو ہے فرحت
آغاز میں جس کی ہو یہ حالت ۔ فرجام میں اِس کی کیسی فرحت
رحمہ کی سنی تو ہوگی روداد ۔ وہ ثروت وہ خسروی وہ اولاد
پہلے سے زیادہ ہو گئی واہ ۔ بر لائے مراد سب کی اللہ

اِس کہانی کے بعد چھیاسٹھ (۶۶) اشعار کی ایک اور مثنوی ہے جس کا عنوان "دنیاداروں کی نشاط آرزو کا بیان" ہے۔ اِس میں مختلف لوگوں کی امیدوں کا ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے ماں کا ذکر کیا ہے کہ وہ کیسی کیسی آرزوؤں اور ارمانوں سے بچے کو پالتی ہے :

ماں بچے کو پالتی ہے کیوں کر ۔ دکھ درد اٹھا کے اپنے دم پر
دل میں بھی رکھتی ہے تمنا ۔ ہو وے گا جوان میرا بیٹا

اِس کا بیاہ کروں گی، سہرے کی بلائیں لوں گی، جب دلہن گھر میں آئے گی تو گھر میں چاندنی کھِل اُٹھے گی، جب پوتے کو گود میں کھلاؤں گی تو خوشی سے پھولی نہیں سماؤں گی، الٰہی میرا بیٹا تقدیر والا ہو کہ میرا بیڑا پار ہو۔ یہ میری ہر طرح خدمت کرے گا، دولت سے گھر بھر دے گا، بزرگوں کا نام روشن ہوگا :

مادر کے یہ ضعف کی دوا ہو ۔ باوا کے بڑھاپے کا عصا ہو
اِس چاؤ میں دکھ تمام آرام ۔ دل شاد گزرتے ہیں ایام

پھر استاد کی تمنا کا ذکر ہے:

استاد بھی لاکھ سہ کے مشکل   شاگرد کی تربیت سے خوش دل
دل میں یہی اِس کے آرزو ہو   شاگرد رشید نیک خو ہو

جاں نثار نوکر کو چاہیئے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اٹھانی پڑے یہی آرزو رہتی ہے کہ آقا خوش رہے۔ مزدور کو خوش حالی کی امید ہے۔ اِسی طرح شاعر جگر کو خون کرتا ہے تب ہی، آب دار شعر کہہ سکتا ہے، اِس کی تمنا یہی ہے کہ جب مشاعرے میں اپنے اشعار سناؤں تو داد پاؤں۔

یہ ایک مربوط نظم ہے اگرچہ شاعرانہ نقطہ نظر سے اسے بڑا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا لیکن اصلاحی نقطۂ نظر سے یہ نظم قابل غور ہے کہیں کہیں شعر چست نہیں ہیں۔ خاص طور پر جہاں شاعر کے متعلق فکر شعر کا تذکرہ ہے وہاں ان کے علم و فضل کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہ نظم محبت کے ساتھ سنی جا سکتی ہے خیالات کی بلند پر وازی کے ساتھ فلسفۂ حیات بھی موجود ہے کہیں اشعار پھیکے لیکن بعض جگہ شگفتگی اور روانی موجود ہے۔ زبان مشاعروں کے نقطۂ نظر سے سلیس ہے۔ کہیں محض قافیہ پیمائی کی ہے۔

آخر میں نو اشعار کی غزل ہے۔ اِس غزل میں حالی کا اثر نمایاں ہے:

دل میں رکھیں آنکھوں میں بسائیں
اے مقصد خندہ رو کہاں ہے

عمر جان کے بعد مولانا حالی نے اپنی مثنوی "نشاط امید" سنائی۔

حالی کی مثنوی "نشاط امید" ۸۹ اشعار پر مشتمل ہے، اس کی ابتدا انھوں نے اِس طرح کی ہے:

اے مری امید میری جاں نواز   اے مری دل سوز میری کارساز
میری سپر اور میرے دل کی پناہ   درد و مصیبت میں میری تکیہ گاہ
عیش میں اور رنج میں میری رفیق   کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

کاٹنے والی غم ایام کی تھامنے والی دل ناکام کی

دل پر جب کوئی دکھ آپڑا تو نے ہی دلاسا دیا۔ عزت اور عشرت میں ساتھ نہ چھوڑا۔ محتاج اور بیمار کو تیری ہی آس بندھی ہے، تو ہی عاشق کا ایمان اور غمگین دل کا آسرا ہے۔ طوفان میں نوح علیہ السلام کی اور کنویں میں تو ھی حضرت یوسفؑ کا سہارا تھی۔ رام چندر اور پانڈوں کی ساتھی تو ھی تھی۔ قیس، فرھاد اور رانجھے کی ڈھارس تجھ ھی سے تھی۔ اگر تو سہارا دے تو سات سمندر بھی پل میں پار ہو جائیں۔ جب تو عزم کو ایڑ لگاتی ہے تو گنبد گردوں بھی پست ہو جاتا ہے، تو ھی بندے کو خدا سے ملاتی ہے۔ تو ھی دین اور دنیا کی بنیاد ہے تو نہ ہو تو حق اور مذہب کو کوئی نہ پوچھے۔ سو تجھ پر بھروسہ کرکے اھل دنیا عبادت کرتے ہیں اور جنت کی امید باندھتے ہیں۔ مکان کی، معاش کی، اولاد کی، اور دلدار کی تلاش میں انسان کی ہمت بندھاتی ہے۔ کسی کو کل کی فکر ہے، کوئی قوم کی بہبود میں سرگرداں، کسی کو قرب حق کی تشنگی ہے۔ غرض لاکھوں دل ھیں اور لاکھوں امیدیں ہیں اور سب یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی مراد ضرور بر آئے گی۔ تو آج اور کل کے وعدے پر انسان کو زندگی کا رخ دکھاتی ہے۔ ہر شخص خیالی پلاؤ پکاتا ہے اور خوش ہے۔ تیرے کرشمے غضب ھیں دل کے ہاتھوں صبر کا دامن نہیں چھوٹتا۔ لیکن ــ

ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمت کمر کی ٹوٹنے حوصلے کا لگتا ہے جی چھوٹنے
ہوتی ہے بے صبری و طاقت میں جنگ عرصۂ عالم نظر آتا ہے تنگ
اور پھر جب تو آتی ہے تو
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی ہو گئی کافور سب افسردگی
تجھ میں چھپا راحت جاں کا ہے بھید چھوڑیو حالی کا نہ ساتھ اے امید

لوگ موعظانہ شاعری کو نظر میں رکھ کر حالی پر رائے زنی کرتے ہیں لیکن حالی

کے پند آمیز کلام کو ماحول میں رکھ کر دیکھیں تو بڑی تسلی ہوتی ہے اِس میں حالی کا تاریخی، معاشرتی اور تہذیبی شعور بیدار ہے مجموعی طور پر نظم بڑی دل کش اور جان دار ہے:

اقتباس از نشاط امید (حالی):

دل پہ آ پڑا ان کے جب کوئی دکھ | تیرے دلاسے سے ملا ھم کو سکھ
تو نے چھوڑا نہ کبھی غربت میں ساتھ | تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ
جی کو ہو کبھی اگر عسرت کا رنج | کھول دیے تو نے قناعت کے گنج
مجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس | تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس
خاطر رنجور کا درمان ہے تو | عاشق مہجور کا ایمان ہے تو
نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو | چاہ میں یوسف کی دل آرا تھی تو
رام کے ہم راہ چڑھی رن میں تو | پانڈووں کے بھی ساتھ پھری بن میں تو
تو نے ہی سرافیس کا بہلایا دل | تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل
تو نے ہی رانجھے کی بندھوائی آس | ھیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس
ہوتی ہے تو پشت پہ ہمت کی جب | مشکلیں آسان نظر آتی ہیں سب
ہاتھ میں جب آگے لیا تو نے ہاتھ | سات سمندر سے گزرنا ہے بات

اِس مشاعرے کے تیسرے شاعر محمد مرزا بیگ نبیرہ مونس الدولہ اساس الملک نواب فاضل بیگ خان بہادر مثبت جنگ رئیس دھلی۔ ان کا تخلص مفطر ہے ۹۳ اشعار کی مثنوی ہے "مثنوی گل زار امید" نام ہے۔ پہلے امید کی صفات بیان کی ہیں:

کیا ہے وہ جس کی انتہا مرغوب | کیا ہے وہ جس کی انتہا مطلوب
ابتدا جس کی ہو نشاط کے ساتھ | انتہا ہو اک انبساط کے ساتھ
اِستواری ہو جس سے ہمت کو | تقویت جس سے ہو طبیعت کو
بے کسوں کی غم خوار، دل کی تسکین، رفیق طریق، مونس و شفیق، باغ زندگانی

کا ثمر۔ درد مندوں کی غم گسار، کوئی دل ایسا نہیں جو اسے محبوب نہ رکھتا ہو بادشاہ ہو یا گدا:

ایک کو فتح شام کی امید — ایک کو قوت شام کی امید

اہلِ فرہنگ کا عجب انداز سے ذکر کیا ہے کہ ملک گیری کی آرزو انھیں یہاں لائی ہے:

عور سے دیکھو حال اہل فرنگ — سعی و کوشش کا اِن کی کیا ہے رنگ
فتح کیوں کر کیا ہے ہندوستان — آس لائی انھیں کہاں سے کہاں
سینکڑوں کوس جو زمین طے کی — صرف امید ان کی رہبر تھی
ملک گیری کی آس انھیں لائی — راہ اسی نے یہاں کی بتلائی
یہ نہ ہوتی نہ ترک کرتے وطن — یہ نہ ہوتی نہ چھوڑتے لندن
اس قدر دور گھر سے آتا کون — اِس قدر فائدے اٹھاتا کون
ہوئیں یہ راحتیں کیسے حاصل — ہوئیں یہ نعمتیں کیسے واصل

اِن کے بعد تاجروں کا ذکر ہے کہ فائدے کی امید میں اپنا مال لیے جگہ جگہ پھرتے ہیں اور طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ کسان کے متعلق کہتے ہیں:

سعی کرتا ہے آس ہی پہ کسان — اِس کی محنت کا سب ہے یہ احسان
کس مشقت سے کھیتی کرتا ہے — اور مصیبت یہ کیسی بھرتا ہے

زمین میں بیج ڈالتا ہے۔ کھیت میں پانی دیتا ہے۔ جب کھیتی پک کر تیار ہوتی ہے تو یہ فصل کاٹتا ہے یہ سب کچھ وہ فائدے کی امید پر کرتا ہے۔ کسی کو گناہ بخشے جانے کی امید ہے کسی کو رزق کی آس بندھی ہے۔ کسی کو امیری کی تمنا ہے رعایا کو حاکم سے انصاف کی امید ہے۔ کسی کو امیری کی تمنا ہے۔ کسی کو فقیری کی توقع ہے چمن میں بلبل کو گل کی آس ہے۔ اِسی لیے شاخ پر بیٹھی ہے۔ ماں بچے کو کیسی کیسی تمناؤں کے ساتھ پالتی ہے۔

یہاں امیر تیمور کی حکایت نظم کی ہے۔ کہ والیٔ توران کا عہدے دار تھا۔ ترقی کرتے کرتے اس کا مشیر اور پھر وزیر بن گیا۔ جب والیٔ توران مر گیا تو یہ بادشاہ بن گیا۔ اُسے اپنی سلطنت بڑھانے کی آرزو تھی۔ لہذا لشکر کو بڑھایا اور تقدیر نے ساتھ دیا۔ بہت سے ملک فتح کئے اور شہنشاہ گیتی ستاں بن گیا۔

مضطر کی یہ مثنوی بڑی فکر انگیز ہے۔ انھوں نے انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط کا ذکر اِس طرح کیا ہے کہ اِن اشعار کو پڑھنے کے بعد ہلکی سی طنز کا احساس ہوتا ہے۔ زبان بڑی رواں ہے اگرچہ کہیں کہیں مضامین کی تکرار ہو گئی ہے جیسے سلطنت کی امید میں کسی بادشاہ کا ذکر اور پھر امیر تیمور کا ذکر، لیکن اس کے باوجود اندازِ بیان طبیعت پر گراں نہیں گذرتا۔ بیمار کے لیے صحت کی امید بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن جب وہ زندگی سے نا امید ہو جاتا ہے تو پھر موت سے قریب ہو جاتا ہے۔ زندگی سے محبت فطرتِ انسانی کا تقاضہ ہے لیکن زندہ رہنا ہی مشکل ہو جائے تو پھر کوئی دوا کام نہیں کرتی اور نا امیدی اس کا کام تمام کر دیتی ہے۔

مضطر کے بعد مرزا محمود بیگ راحت شاعر دہلوی معتمد دربار پٹیالہ نے ایک غزل مسلسل پڑھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

وہ صلہ دیں گے کہ ہو جاوے گی ثروت آجکل
طرح آئی پاس اپنے بلدۂ لاہور سے

غاشیہ بردار ہیں اقبال و دولت آج کل
اپنی امید دلی ہے ہر طرف سے جلوہ گر

آئینہ لادیں حلب سے ہے یہ جودت آجکل
ہند سے جاویں یمن میں اور یمن سے پھر حلب

اِس غزل میں ردیف وقافیہ موجود ہے لیکن یہ ان کی پہلی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ اکثر مصرعہ وزن میں نہیں۔ کہیں سکتہ پڑتا ہے معنی کے اعتبار سے بھی کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتی لیکن ایک جوش ہے جس سے یہ امید ظاہر ہوتی ہے کہ اب عسرت کا زمانہ ختم ہونے والا ہے نئے نظام کے تحت ملک میں دولت کی فراوانی ہو گی۔ دہلوی ہونے کی رعایت سے غالب سے متاثر ہیں اور مرکبات

سے معنی پیدا کیے۔ مثلاً امید دل بستہ، تخت طوفان رسیدہ، غاشیہ بردار، ناز بردار قوم، طارم گردوں، معدن صد عیش و عشرت وغیرہ۔

اِس غزل کی خاص بات یہ ہے کہ اِس سے جدید مشاعروں کی شہرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ راحت پٹیالہ میں تھے اور اردو شاعری کے اِس نئے موڑ سے واقف تھے۔

محمود بیگ راحت کے بعد مولانا محمد حسین آزاد نے "مثنوی موسوم بہ امید" پڑھی۔ یہ مثنوی ڈیڑھ سو اشعار پر مبنی ہے۔ اور ایک طویل استعارے میں اپنا مقصد واضح کیا ہے کہ:

جب صبح میں نے فلک مینائی کو روشن کیا تو میں نے آنکھیں مل کر دیکھا کہ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے قدرت نے ایک چمن کھلا دیا تھا اور پہاڑ ایسا کہ فلک اِس پر ناز کرے۔ اِس باغ کا ایک ایک پتا میرے دل مراد کا آئینہ نما تھا۔ آرزوں کے پھول اور تمناؤں کے ثمر لگے ہوئے تھے۔ اِس پہاڑ کی چوٹی آسمان سے باتیں کر رہی تھی لیکن اِس پر چڑھنے سے دم نہیں اکھڑتا تھا نہ گھبراہٹ ہوئی تھی۔ اگرچہ پاؤں اٹھانے کا یارا نہ تھا۔ لیکن کوئی دل کو سہارا دیتا جاتا تھا۔

چڑھائی جو نظر آرہی تھی دور بہت[1] دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت
جشن کا تو یہاں اہتمام نظر آتا تھا کوئی در پردہ ساز عشرت بجا رہا تھا

میں بھی اِس آواز کی طرف اسی والہانہ انداز سے بڑھا جس طرح چکوری چاند کی

---

[1] "گلدستہ نمبر ۲" میں مصرعہ اول اِس طرح لکھا ہے:

"عقل ہر چند یہ کہتی تھی ہے دور بہت"

معلوم ہوتا ہے کہ یہ گل دستے مولانا کی نگرانی میں شائع ہوتے تھے۔ لہٰذا ان کو مصرعہ بدلنے کا وقت مل گیا۔

طرف جاتی ہے۔ آخر کار منزل مقصود پر پہنچا۔ دیکھا کہ قدرت کی طرف سے ایک باغ لگا ہوا ہے۔ خود رو پھول بہار دکھا رہے تھے۔ سبزے کا مخملین فرش بچھا ہوا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی سے ایک چشمہ جاری ہے۔ اور پانی چٹانوں سے ٹکراتا گر رہا ہے

اُٹھ وہ یوں سر ہے بداماں جبل مار رہا سانپ سیماب کا ہو جیسے کہ بل مار رہا

اِس سل پر ایک نازنین پانی میں پاؤں ٹکائے بیٹھی ہے۔ باد شمال اس پر پھول برسا رہی ہے :

رخ جو ہے آیئنہ روئے تمنا اِس کا شمع سان چاروں طرف ایک ہے اِس کا جلوہ

ایک طرف عقل کھڑی ہے۔ تاثیر سے غفلت کا جام لیے حاضر ہے یہ نازنین ہر دل کو نور سے منور کر دیتی ہے اور کامیابی کی تصویر دکھا رہی ہے اس کی نظر میں ایسا جادو ہے کہ ہر دل پر اس کی نظر ہے۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس کے دربار میں شاہ و گدا سب حاضر ہیں۔ دفعتاً میری نظر جو اس کے چتر شاھین پر پڑی دیکھا کہ ھمائے اقبال مجھے بڑی محبت سے بلا رہا ہے کہ آؤ تمہاری ہی جگہ خالی تھی۔ آؤ یہ شہزادی امید کا دربار ہے۔ یہ سن کر بے اختیار امید کی شان میں اشعار موزوں ہو گئے:

کون سا دل ہے کہ جس دل میں تیری چاہ نہیں کون سا کوچہ ہے جس میں کہ تیری چاہ نہیں

لو اشعار شہزادی امید کی شان میں قصیدے کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ اِس کے بعد پیر دہقان، باغ بان، تجارت پیشہ لوگ، میدان جنگ میں لڑنے والے سپاہی، صاحب علم، اِہل مدرسہ، طالب علم، مسافر وغیرہ جو سختیاں جھیلتے ہیں ان سب کی امیدوں کا تذکرہ آزاد نے نثا نوے اشعار میں کیا ہے۔

لے "گل دستہ نمبر ۲" میں مصرعہ اول اس طرح ہے :

"سر ہے اس طرح بد امان جبل مار رہا"

اِس مثنوی کو پڑھ کر بے اختیار نظیر اکبر آبادی کا خیال آتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ نظیر کے موضوع زیادہ تر غیر رسمی اور عام پسند ہیں لیکن آزاد موضوع کی تلاش کرتے ہیں۔ اِس نظم میں آزاد نے بہتر منظر کشی کی ہے۔ ان کا جوہر پر شکوہ بیانیہ اور ادبیانہ انداز ہے۔ آزاد کے سامنے ایک نصب العین تھا ورنہ آزاد منظر کشی میں میر انیس کے ہم پلہ ہوتے۔ آزاد ایک جدت طراز طبیعت کے مالک تھے اور ساتھ ہی پُرگو بھی۔ ان کے کلام کی شعر کی جزئیت نے ان کے معاصرین میں بلند کر دیا تھا۔ آزاد لطافت نگاری کے اِس قدر دل دادہ تھے کہ جب تک ہر شعر میں کوئی نزاکت پیدا نہ کر لیتے انھیں مزہ نہیں آتا تھا۔ پھر بھی آزاد کا فن شعر بہت ہی سیدھا سادہ ہے۔

اقتباس از مثنوی بہ صبح امید :

سنگ مرمر کی لبِ آب جو اک سل ہے پڑی
اِس پہ اک رشکِ پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی

رنگِ رخ کو گل گلنار سے چمکائے ہوئے
بیٹھی اک پاؤں کو ہے پانی میں لٹکائے ہوئے

اِس پہ ہے چتر کی با سایہ فگن سبز نہال
پھول برساتی ہے پہلو میں کھڑی بادِ شمال

نوجوانانِ چمن بزم سجاتے ہیں کھڑے
فرش گلہائے بہاری کا بچھاتے ہیں کھڑے

سر پہ ہے کے جو دھری ہے کلہ تاجوری
ہے بجائے دُرِ الماس وہ پھولوں سے بھری

اس کے ہر پھول میں لیکن یہ تماشا ہے الگ
کہ ہر اک آنکھ کو رنگ اپنا دکھاتا ہے الگ

اِس سے ہر شخص شمیم اپنی جدا لیتا ہے
ہر دماغ اِس سے نئے ڈھب کا مزہ لیتا ہے

رخ جو ہے آئینہ روئے تمنا اس کا
شمع ساں چاروں طرف ایک ہے جلوہ اس کا

اک طرف عقل ہے اک سمت ہے تدبیر کھڑی
آگے جام مئے غفلت لیے تاثیر کھڑی

رکھتی ہے ایسا اثر نرگسِ جادو اس کی
پڑ رہی دل پہ نظر ہے جو ہر اک سو اس کی

ہے ہر اک شخص سمجھتا کہ اشارہ ہے مجھے
تڑپ اٹھتا ہے ہر اک دل کہ پکارا ہے مجھے

اِس کے دربار میں ہیں شاہ و گدا آئے ہوئے
اپنے دامانِ تمنا کو ہیں پھیلائے ہوئے

آ کہ آباد ترے دم سے دائم دنیا
اور مثل ہے کہ بہ امید ہے قائم دنیا

آگہ ہے تیری ہوا میں دل شیدا گلشن   لہلہاتے ہیں تیری یاد میں کیا کیا گلشن
دل کے گلشن پہ ہے چھایا ہوا نیرنگ ترا   کون سا پھول ہے جس پر کہ نہیں رنگ ترا۔

آزاد کے بعد مولوی مرزا اشرف بیگ رئیس دہلی اسسٹنٹ مترجم محکمہ ڈائرکٹری پنجاب نے ایک مثنوی موسوم "بہ امید بہار" پڑھی۔ یہ مثنوی تین سو تیرہ اشعار پر مبنی ہے۔ اور اس کی ابتدا ان اشعار سے کی ہے :

کیا ہے وہ چیز رہے جس سے ہمیشہ دل شاد
کیا ہے وہ چیز پڑے جس سے خوشی کی بنیاد

کون سی کشت ہے وہ جو رہے شاداب سدا
لہلہاتا رہے ہر فصل میں سبزہ جس کا

چھبیس اشعار میں یہ ظاہر کیا ہے کہ کوئی ایسی جاندار شے نہیں جو امید پر نظر نہ رکھتی ہو۔ آٹھ اشعار میں امید کی تعریف کی ہے۔ اور مثالیں دی ہیں مثلاً مسافر کی امید کہ تن تنہا سفر میں صرف امید ہی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ سپاہی کی امید فتح ہے اہل تقویٰ کی امید معرفت الٰہی ہے۔ حاجیوں کی اُمید کعبہ کی دید ہے۔ مفلس اور کنگال فقر و فاقہ میں بھی امید پر ہی سختیاں جھیلتے ہیں۔ حضرت یعقوب کو دم آخر تک حضرت یوسف کی دید کی امید تھی۔ حضرت موسیٰ امید ہی کے سہارے اپنی اُمت کو نیک عمل کو پار لے آئے تھے۔ حضرت ابراہیم کو گل زار بنانے والی امید ہی تھی۔

چودہ اشعار میں امید کی خوشی نظم کی ہے۔ پھر یہ کہ بادشاہ رعایا کو کس طرح خوش رکھتے ہیں اور جب غنیم سے جنگ ہوتی ہے تو امید ہی کے سہارے فتح نصیب ہوتی ہے۔

اورنگ زیب کی خوب تعریف و توصیف کی ہے حالاں کہ اس زمانے میں انگریز اورنگ زیب کے سخت مخالف تھے۔ محمود غزنوی، فردوسی، طالب علم اور سوداگر بھی امید ہی کی وجہ سے کام کرتے ہیں (اس قطعے کو شاعر نے بڑی

تفصیل سے نظم کیا ہے، جدید علوم کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا بھی ذکر ہے کہ اس نے کسی امید پر ہی حکومت قائم کی۔ اور ریلوں کا جال بچھایا، جہاز کا کپتان، باغ بان یہاں تک کہ مریض بھی آخری وقت تک امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔

موت کے وقت نجات کی امید ہوتی ہے۔ ماں کیسی کیسی امیدوں کے ساتھ بچے کو پالتی ہے۔ آخر میں شاعر کی دلی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ وہ امید ہی کی خوشی میں اشعار کہتا ہے۔

۲۱۳ اشعار کی یہ مثنوی زبان و بیان کے اعتبار سے بڑی دل چسپ ہے۔ شاعر نے انسانی زندگی کو نظم کے احاطے میں لے لیا ہے۔ بڑا سادہ اسلوب ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے دور، سادہ بیانی اِس مثنوی کی قابل قدر خوبی ہے۔ اِس مثنوی میں اِس زمانے کے علوم پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور اس سے امیدیں وابستہ کی ہیں۔ دوسرے معنوں میں یہ مثنوی اپنے وقت کی سب سے بڑی ترجمان ہے۔ اگرچہ تلمیحیں اور استعارے بھی استعمال کئے ہیں۔ لیکن بڑی خوبی کے ساتھ جب کسی خاص شخص کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی مناسبت سے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جنگ ذکر کے ساتھ ہتھیاروں کے نام، حکومت و قت کے لیے بادشاہ کا لفظ استعمال کیا ہے کہ وہ رعایا کو خوش رکھنے کے لیے کیا کیا انتظام کرتا ہے۔

انتظامیہ کے سلسلے میں اسسٹینٹ کمشنر، ڈپٹی کمشنر، چیف جج، فنانشل کمشنر، لیفٹنٹ گورنر جیسے ثقیل الفاظ بھی نظم میں کھپا دیئے ہیں۔ طالب کے لیے علوم قدیمہ اور جدیدہ دونوں کا ذکر کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید علوم اِس دور میں مقبول ہو چکے تھے۔ اور ان کی اہمیت سے لوگ اِسی طرح واقف تھے جس طرح کہ انھیں اپنے قدیم علوم مرغوب تھے۔ مثلاً صیغے، تعلیل، اجوف، تمرین، منشعب، شافیہ، میزان، صرف و نحو، لواقع، بحث حروف، افعال قلوب، اسمائے، ظروف معرب اور مبنی پر بحث، شرح ملا، ریاضی، فقہ، حدیث، تفسیر کے حواشی

قاعدہ صوم و صلوٰۃ، مسئلہ حج و زکات، کنز ھدایہ، بیضاوی، طحطاوی، ترمذی، بخاری، رازی، برھان، ارسطو کے دلائل، علم بدیہی، نظیری، عملی، شرح اسباب، سدیدی، نفیسی، شرح گیلانی، ان علوم کے ساتھ انگریزی پڑھنے کا شوق، ڈکشنری، ریاضی، جیومیٹری، الجبرا، پوئٹری (نظم)، گریمر (قواعد)، کیمسٹری، اسٹرانومی وغیرہ۔

اِن علوم کی تفصیل سے شاعر کا صاحب علم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہ ضروری کہ ایسے ثقیل الفاظ نظم کرنے سے شعر کی روح مردہ ہوگئی، لیکن جدید علوم حاصل کرنے کے شوق اور ضرورت کی طرف واضح اشارہ ہے۔ بعض جگہ منظر کشی دلآویز ہے۔

زبان عام فہم ہے۔ عروض کی غلطیاں بھی ہیں۔ حالی اور آزاد کے مقابلے کی نہ سہی لیکن علم دوستی اور مشاعرے کے مقصد کے اعتبار سے یہ کام یاب نظم ہے۔ کہیں اشعار معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ بعض جگہ تک بندی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن زبان ایسی ہے جیسے کہ بچہ بولتا ہے۔ یہی کم زوری اِس مثنوی کے مقصد کے تحت ایک خوبی بن گئی ہے۔

اقتباس از مثنوی "بہ امید بہار" مصنف مرزا اشرف بیگ :

تجھ سے پاتے ہیں طبیعت میں بہت استقلال
حال آتا ہے نظر تجھ سے ہمیں استقبال

ہم ھر اک امر میں پاتے ہیں ہدایت تجھ سے
بلکہ ہر کام کی ہوتی ہے ہدایت تجھ سے

کوششیں کرتے ہیں ہر کار میں بل پر تیرے
مدعا پاتے ہیں انجام میں بل پر تیرے

ہر جگہ ہے نظر آتی تھی صنعت تیری
اللہ اللہ رے زیبائی طلعت تیری

تیرے میدان کی وسعت کو کہاں پائے خیال
تیرے انداز کی خوبی کو کہاں پہنچے مثال
تو دکھا دیتی ہے مقصد کی ہمیں تصویریں
تو سمجھا دیتی ہے پھر اس کے لیے تدبیریں
گرم کر دیتی ہے ہنگامہ خیالات کا تو
ہمیں، انجام سمجھا دیتی ہے ہر کام کا تو
خوش پڑے پھرتے ہیں تجھ سے ہی فقیر اور گدا
شاد رہ سکتے ہیں تجھ سے ہی سلاطین سدا

شاہ انور حسین ہما کی مثنوی پچاس اشعار کی ہے۔ اس مثنوی میں کوئی خاص بات نہیں۔ سلطنت برطانیہ کی خوب تعریف کی ہے۔ ان کے حسن انتظام سے ہر شخص خوش و خرم ہے۔ راجاؤں اور نوابوں کو بحال کر دیا گیا ہے۔ خاص طور پر پنجاب خونریزی سے بچا ہوا ہے۔ ان کے خلوص کی وجہ سے علم و فن عام ہو گئے ہیں۔ ہر شخص خوش و خرم ہے۔ لیکن میری ابھی تک وہی حالت ہے جیسی کہ پہلی تھی۔ اس نظم کو مثنوی سے زیادہ قصیدے کی بگڑی ہوئی شکل کہنا مناسب ہے۔ ہما نے نظم کے آخر میں دعائیہ اشعار کے ساتھ مدد کی درخواست کی ہے۔

مثنوی کے اکہتر اشعار وزن سے گرے ہوتے ہیں۔ نئے مرکبات بناتے ہیں۔ زبان کہیں نہایت پیچیدہ اور ہم وزن الفاظ کا مرکب ہے۔ اگر کہیں آسان زبان میں شعر کہنے کی کوشش کی ہے تو وہ تک بندی ہو گئی لیکن اس میں شک نہیں کہ زبان آسان استعمال کرنے کی ناکام کوشش ضرور کی گئی ہے۔ نگہت لطف نہفتہ، نرگس شہلا امید، بہ جود شاہ انگشٔ رحمت رب، ہوئی ہیں ہڈیاں مژگان عنقا جیسے عجیب مرکبات وضع کیے ہیں۔ اقتباس:

اگر شوق خوشی ہے تجھ کو منظور　　نقاب شاہد امید کر دور

لکھوں کیا روز و شب مادام انسان | ریاضت عبادت فعل شایان
نماز و روزہ و حج و زیارت | کیا کرتا ہے وہ پیوستہ دن رات
کہ ہے امیدوار حور و غلماں | ہوا خواہ بہشت و مغفرت داں
سدا امید سے سب کو خوشی ہے | کہ نومیدی کمال ناخوشی ہے
صدف کو رہتی ہے امید داری | کہ تا نیسان لطف ذات باری

تمنا کے بعد مولوی علاؤالدین صاحب صافی کی مثنوی ہے جس میں انتالیس اشعار ہیں۔ یہ اشعار مثنوی میر حسن سے متاثر ہو کر کہے گئے ہیں۔ منظر نگاری اِس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لیکن یہ نقل بڑی بھونڈی ہے۔ بعض اشعار بے معنی ہیں۔ جہاں خیال کو آسان زبان میں ظاہر کرنا چاہا ہے وہاں تک ہندی کے سوا کچھ نہیں۔ مرکبات کی بھرمار ہے۔ لیکن فارسی اور ہندی کے الفاظ ایک ہی شعر میں استعمال کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ زبان و بیان آسان تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ تخئیل کے اعتبار سے اشعار معیاری نہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے آدمی نامے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اقتباس مسلسل :

ایک شاہ امید تاج داران | ایک باج رساں وعذر کاران
ایک تخت خوشی پہ جانشین ہے | ایک حسرت و یاس میں حزین ہے
ایک پھینکے شال آگے اینٹھا | ایک اوڑھ کے گودڑی کو بیٹھا
ایک وہ زر و مال پر ہے نازاں | ایک وہ بفاقہ کشی و حیران
مکھ دیکھ تو انقلاب سامان | امید ہے یہ لطف شایان
امید پر تری کر کہیں جائے | پر نا امید پھر نہیں آئے
جس کی تو امید دل بر آئی | شادی امید اس نے پائی

مولوی عطا اللہ صاحب عطا نے پہلے بتیس اشعار کا ایک مستزاد امید کی تعریف میں پڑھا جس کی ابتدا ان اشعار سے

کی ہے:

سرسبز ہوا چاہتا ہے امید کا پودا — فرحت ہوئی پیدا
اثمار خوشی ہونے لگے اس سے ہویدا — ہے شکر خدا کا

اِس کے بعد جدید عنوانی مشاعروں کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

معنی کی تجلی نے دکھایا ید بیضا — جوں حضرت موسیٰ
ہر چند کہ ہیں شعر و سخن لعل و جواہر — از روئے معنی
پر مفت بلا دام ہیں ہوں بیچنے والا — مجھ کو نہیں پروا
مضمون نکلتے ہیں عبارت سے خوشی کے — جوں لفظ سے معنی

اِس کے بعد کہتے ہیں کہ میں اِس امید کے ساتھ یہ شعر کہہ رہا ہوں کہ سلاطین سلف بھی اِس قسم کی شاعری کا ذوق نہیں رکھتے تھے سکندر بھی اِس ذوق سے محروم تھا۔ جو اِس حکومت کو ہے: اور یہ حکومت ہر شئے میں ترقی چاہتی ہے اور عوام کی فلاح و بہبود پر اِس کی نظر ہے۔ نوجوان تو خیر اِس سے فائدہ اٹھا ہی رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ پروا نہیں اگر بڑھاپا آجاتے ہمیں پنشن ملے گی۔ میں بھی گورنمنٹ کا دیرینہ افسر ہوں۔ میرے پاس سندیں موجود ہیں۔ شریف النفس اور ایران کا رہنے والا ہوں۔ لیکن میں بھی نا امید ہوں اگر مجھے بھی پنشن مل جاتے تو دو روٹیوں کا سہارا مل جائے گا۔

اِس درخواست کے بعد نو اشعار میں مشاعرے کی خوشی کا اظہار کیا ہے۔ یہ قطعہ اِس لحاظ سے عجیب ہے کہ انگریزی الفاظ کو بطور تشبیہوں کے استعمال کیا ہے:

ہر سخن میرا جھلک میں ہے اسٹار آف انڈیا
سامعین کے گوش کو ہر شعر در شہوار

دیکھئے کب تک ہو جاری اب میری قسمت کی ریل
ہے لگائے ہم نے بھی تو دل کے اسٹیشن پہ تار
محفل شعرا میں یوں ہیں افسران نامدار
آسمان پر جس طرح قندیل انجم کی قطار

اِن اشعار کے بعد "مطلع" کے عنوان سے دس اشعار ہیں۔ یہ اشعار انجمن کے مشاعروں کی تعریف میں ہیں کہ اِس مشاعرے میں "امید" ایسا موضوع ہے کہ جس سے دل میں اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ اور ناامیدی ختم ہوتی ہے۔ اِس قطعہ میں تذکیر و تالیف کا استعمال غلط کیا گیا ہے۔ پھر چوالیس (۴۴) اشعار کی مثنوی ہے جس میں بادشاہ، ساہوکار، فقیر، صراف، دربار امیدوار، سوداگر، مطرب، کمل پوش، بانکے کج کلاہ طالب علم، واعظ خلوت نشین، عزلت گزین، عاشق، عابد، مجذوب پہلوان، کیمیاگر، نوکر، آقا، افیونچی، طاعت گزار، اهل فرنگ، کِسان، شاعر وغیرہ کا ذکر ہے کہ یہ سب امید پر ہی جیتے ہیں۔

پھر گیارہ اشعار کی غزل ہے جس میں خدا سے امید ظاہر کی ہے کہ تو ہی میری امیدوں کو پورا کرنے والا ہے۔

یہ نظم بہتر نظموں میں سے ایک ہے۔ اِس میں کہیں کہیں شاعرانہ معیار موجود ہے۔ سوائے قطعہ کے۔ اِس نظم میں ایسی منظر کشی کی گئی ہے کہ وہ مضمون کا پس منظر کا کام دیتی ہے اور مشاعرے کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس جدید طرز کے مشاعرے سے جس میں ہر قوم کے لوگ موجود ہیں ان کے انہماک اور ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ نظم جدید اردو شاعری کی طرف ایک واضح اِشارہ ہے۔ سب سے اہم یہ کہ مشکل الفاظ سے پرہیز اور آسان الفاظ میں مطلب ادا کیا ہے۔ اقتباس :

صبح کا تارا خوشی کا ایسا چمکا ایک بار
مطلع مشرق سے سورج جس طرح ہو آشکار

گلشن دل میں کھلی ہے آج گل زار امید
نکہت مژدہ خوشی کا لایا ہے باد بہار
دنیا کے کار و بار ہیں سارے امید پر
کیا بے نوا فقیر ہے کیا شاہ نامور
امید کے ستون پہ دنیا کو ہے قیام
خلق خدا کی زیست ہے امید پر مدام
ہر سینہ میں امید! تو خلوت گزین ہے
دل ہے مکان امید تو اِس میں مکین ہے

اِس مشاعرے کی آخری مثنوی الٰہی بخش رفیق موسوم بہ آئینۂ امید ہے۔ یہ ایک سو ستائیس اشعار پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے وہ اِن مشاعروں کے انعقاد پر اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہیں:

اے دل ہے عجب دیر خرابات کا عالم
ہر بات میں ہے اس کے طلسمات کا عالم
آئینۂ حیرت ہے جو کچھ پیش نظر ہے
اے عقل نہ ششدر ہو کہ جادو کا یہ گھر ہے

رات کا وقت ہے شہزادی شب نے سب کو امید کا ساغر پلا دیا ہے:

جب تک نہ یہاں خسرو خورشید ہے قائم
کہتے ہیں کہ دنیا ہی با امید ہے قائم
شہزادی امید کا دربار کھلا ہے
لو جنس تمنا کا یہ دربار کھلا ہے

اِس تمہید کے بعد وہ امید کی تعریف کرتے ہیں:

ہے باغ جہاں سبز ترے فیض قدم سے
اور ملک تمنا کی ہے رونق ترے دم سے
ہے دل سے نکلتا ترا فرمان عدالت
تن ملک ہے اور دل ترا ایوان عدالت

تیری سفارت کے لیے ادراک رسا اور وزارت کے لیے عقل خداداد موجود ہے۔ تیری سواری آرہی ہے۔ راحت کے رسالے، آرام کی فوجیں تیرے جلو میں ہیں۔ تیرا روئے عمنا آئینۂ مقصود ہے۔ تو ھر آنکھ کے پردے میں موجود ہے اگر تو منہ پھیرے تو زمانہ رنگ بدلے تیرے ہی دم سے زمانہ آباد ہے۔

شہزادی امید کی آمد کے سلسلے میں دنیا گوسجایا گیا ہے۔ صبا گلشن کا راستہ صاف کر رہی ہے۔ ہر تختہ پھولوں سے بھرا ہے۔ "بلبل کو گل تر کی دید مبارک ہو" ہر غنچہ کے دھن سے یہی صدا بلند ہو رہی ہے۔ شبنم نے طفل بنات کا منہ دھلا دیا ہے۔ سبزۂ خوابیدہ جاگ اٹھا۔ بلبل جھک جھک کر پھول سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ اتنے میں شہزادی امید کی سواری آ پہنچی۔ گلشن میں دھوم مچ گئی۔ ہر طرف سے یہی صدا بلند ہو رہی ہے۔ کہ رخ زیبا سے نقاب اٹھا اور اپنی صورت دکھا :

کیا کیا نہیں الفت نے تری رنگ دکھائے | اس عالم نیرنگ میں نیرنگ دکھائے
سادھا ہے محبت میں تری جوگ کسی نے | اور عشق کا ہے مول لیا روگ کسی نے
پھرتا ہے کوئی حسرت دیدار کا مارا | جیتا ہے نہ مرتا ہے ترے پیار کا مارا
ہے سب سے نہاں تو یہ چھپاتی نہیں صورت | ہے دل میں ولیکن نظر آتی نہیں صورت
ہر راز جدا ہے ترا ہر ناز الگ ہے | خوبان جہان سے ترا انداز الگ ہے

شاعر، عزیب الوطن، سوداگر، بحری، مسافر، مان، سپاہی، دانہ جو بڑھ کر درخت بنتا ہے۔ شاہ و گدا، بلبل ناشاد غرض کہ ہر شے تیرے ہی کرم پر زندہ ہے۔

رفیق کی یہ مثنوی بڑی معنی خیز اور فکر انگیز ہے۔ اس کے علاوہ زبان بڑی پاکیزہ اور سہل ہے اشعار معیاری ہیں۔ مناظر فطرت کی نقاشی بڑی حسین ہے۔ یہ مثنوی سوز، تاثیر، اور امید کا ملا جلا تاثر پیدا کرتی ہے۔ ایک دو لفظ انگریزی کے بھی نظم میں لائے ہیں جو کھٹکتے نہیں۔ بھرتی کے اشعار بھی ہیں [1]

---

[1] "گلدستہ نمبر ۱" کا آخری حصہ نہایت بوسیدہ تھا۔ مصرعے کے مصرعے کیڑے چاٹ گئے۔ اسی لیے رفیق کی پوری مثنوی پر تبصرہ نہیں ہو سکا۔

مشاعرہ نمبر۳، بہ عنوان "حبِ وطن"[1]

"حبِ وطن" کے عنوان سے یکم ستمبر، ۱۸۷۴ء کو انجمن ھال میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ اِس مشاعرے میں حسب ذیل شعرا نے حصہ لیا:

" مولوی عمو جان ولی، پنڈت کرشن لال طالب (اکاؤنٹنٹ صیغۂ تعمیرات راولپنڈی) ملا گل محمد عالی (مدرس مدرسہ پھلور، ضلع جالندھر)، مفتی امام بخش (رئیس، دگالہ بزبان فارسی)، انور حسین ہمانزہ، شیخ الٰہی بخش (رئیس) رفیق، مصر رام داس قابل (بزبان فارسی) مولوی عطا اللہ خان عطا، منشی علاؤ الدین رمانی، لالہ گنڈا مل، (مدرس)، سید اصغر علی لکھنوی حقیر، مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی۔ (اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر محکمۂ ڈائریکٹری)"۔

سب سے پہلے عمو جان ولی نے اپنی مثنوی "حبِ وطن" پڑھی۔ اِس مثنوی کے ایک سو انچاس (۱۴۹) اشعار ہیں۔ اس کی ابتدا یوں کی ہے:

ہماری یاد وطن سن کے خلق حیران ہو — زمین و چرخ سے بھی شور وہ عجب نکلے
کمال ولولۂ الفت وطن ہے اب — دہن کے ہنسنے نا ڈھب کوئی میرے رب نکلے

مثنوی کا مقصد یہ ہے کہ انسان تو انسان حیوان بھی وطن ہی میں رہنا چاہتا ہے۔ اِس کے بعد عمو جان نے دلی کے کوچہ و بازار، فصیل، نہر کمپنی باغ،

---

[1] "ضمیمہ اخبار انجمن" لاہور: اگست، ۱۸۷۴ء، مشاعرے انجمن پنجاب نمبر۳، بہ "عنوان حب وطن"
اِس گلدستے کے صفحہ ۲۰ تک ورقوں کے صفحے چوہوں کے کترے ہوئے ہیں لیکن مطلب واضح ہو جاتا ہے کیوں کہ گودائی میں کترے جانے کی وجہ سے ہر صفحے کے چھ اشعار کے مصرعہ اولیٰ کے چند الفاظ غائب ہو گئے۔

گھنٹہ گھر، عجائب گھر، جمنا کا کنارہ، لال قلعہ، جامع مسجد وغیرہ کو بڑے پُرسوز الفاظ میں یاد کیا ہے۔ وطن میں چھٹی کا دن گھر میں کس طرح گزارتے تھے خوب بیان کیا ہے۔ دوستوں کی صحبتیں، سب کا مل کر سیر کو جانا، کسی دوست کے یہاں ٹھہر کر کھانا کھانا، بازار اور چوک کی سیر کو جانا، چاندنی کی سیر، پھول والوں کا میلہ۔ برسات میں قطب صاحب جاکر تفریح کرنا اور پھر مزاروں پر فاتحہ پڑھنا، پنکھے کا میلہ، مسجد اولیاء کا تالاب، جھرنے پر پانی سے کھیلنا، غرض انھوں نے اِس مثنوی میں دھلی کی تصویر نہایت موزوں الفاظ میں پیش کی ہے۔ ہر شعر سے وطن کی محبت ٹپکتی ہے۔ اشعار میں روانی، خیال میں تسلسل، بلند خیالی خوب صورت تشبیہیں اور استعمارے استعمال کئے ہیں۔ زبان پاکیزہ ہے اور آسان ہے۔

اقتباس:

کبھی نہ کم ہو غم و رنج میں وطن کی یاد
فقیر ہو کوئی غربت میں یا کوئی مسرور

جو مفلس ہو تو عیش وطن ہو نظروں میں
تونگری ہو تو شوق وطن ہو زوروں پر

جو دال روٹی بھی کھاتا ہو کوئی غربت میں
تو میری طرح وہ یاد وطن میں ہو مضطر

یہ قول ہم نے سنا بارہا بزرگوں سے
کہ گھر کی چٹنی ہے باہر کے قلیہ سے بہتر

وطن کی روکھی بھی غربت کی روغنی سے خوب
وہاں کی آدھی بھی ساری یہاں کے اول تر

پنڈت کرشن لال طالب نے سینتالیس (۴۷) اشعار کی نظم مسلسل پڑھی اِس نظم میں قافیہ اور ردیف کا التزام کیا گیا ہے۔ اِس نظم میں انھوں نے بتایا ہے کہ انسان ہو یا حیوان، جمادات اور نباتات بھی وطن سے محبت کرتے ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے وہ مشہور ہیں۔

اِس نظم میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کی طرف اشارے اور کنایئے موجود ہیں۔ اور ساتھ ہی حب الوطنی کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ کہیں اِس کو دھوکے کی ٹٹی کہا ہے۔ کبھی تعریف و توصیف بھی کی ہے۔ کہ وطن کی خدمت سب سے

بڑی عبادت۔ خاص بات یہ کہ اصل وطن کی خدمت بھی بڑا مرتبہ رکھتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرشن لال صاحب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے پر اپنی شرمندگی کا اظہار کر رہے ہیں اور بہادر شاہ ظفر پر طنز بھی موجود ہے۔ البتہ مشاعرے کی اہمیت اور مقصد سے باخبر ہیں عام فہم زبان استعمال کی ہے۔

اقتباس :

جب دل میں آسماتا ہے جب وطن کا جوش
کیا کیا مزے دکھاتا ہے جب وطن کا جوش
یہود یٔ وطن کے لیے طرح طرح سے
علم و عمل سکھاتا ہے جب وطن کا جوش
سارے جہان میں اس کا ہی جوش و خروش ہے
غوغا یہی مچاتا ہے جب وطن کا جوش
دیتا ہے دم بدم میں قومی سلطنت پلٹ
جب جوش کچھ دکھاتا ہے حب وطن کا جوش
مفسد نمک حرام بنا کر کبھی کبھی
فوجوں کے سر کٹاتا ہے حب وطن کا جوش
باغی کو بادشاہ بنا اپنے ملک کا
اورنگ پہ بٹھاتا ہے حب وطن کا جوش
دل کو سیاہ کر کے کبھی مثل نانا راؤ
مہنہ کالا بھی کراتا ہے جب وطن کا جوش
غازی و مجتہد کا بہانے سے دین کے
سر مفت میں کٹاتا ہے حب وطن کا جوش

اب ملا گل محمد، مدرس پھلور، ضلع جالندھر نے "مثنوی بہ موسوم اورنگ عالی" پڑھی۔ سب سے پہلے وطن کی محبت کا ذکر کیا ہے کہ ہر شخص کے دل میں وطن کی محبت ہے خواہ وہ امیر ہو یا غریب، یہ اشعار انیس ہیں۔ پھر اکیاون (۵۱) اشعار میں ایک حکایت بیان کی ہے کہ جب سکندر سریر آرائے سلطنت ہوا تو آب حیات کی تلاش میں شہر بہ شہر مارا مارا پھرا۔ بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کیں۔ آخر وطن یاد آیا۔ رُوم اور یونان کے راستے وطن واپس آنے کا ارادہ کیا راستے ہی میں اسے اندازہ ہو گیا کہ اب اس کی زندگی کے صرف چار سال باقی ہیں اور اس عرصے میں وطن نہ پہنچ سکوں گا لہٰذا نہایت رنجیدہ ہوا۔ بلبل کی طرح فریاد کرتا تھا۔ پھول کی طرح چاک گریبان، نرگس کی طرح حیران، یہاں تک کہ موت آگئی۔ جب لوگ اس کی میت کو لے کر چلے تو ایک شخص نے اس کا داھنا

ہاتھ کفن سے باہر نکال کر اس کی مٹھی میں مٹی رکھ دی۔ دریافت کرنے پر اس شخص نے بتایا کہ سکندر نے یہ وصیت کی تھی کہ ہر چیز فانی ہے۔ یہاں تک کہ حب الوطنی بھی کوئی چیز نہیں۔ انسان کو آخر مٹی ہی میں مل جانا ہے۔ وہ کوئی چیز یا جذبہ ساتھ نہیں لے جاتا۔

اس مثنوی میں غیر مانوس عربی و فارسی کے الفاظ بہ کثرت استعمال کیے ہیں۔ مرکبات کی بھرمار ہے۔ لیکن آسان گوئی کی کوشش ضرور کی ہے۔ اس مثنوی کو پڑھنے سے ان کی کمی مشکل پسندی کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ اصل مضمون سے بھی دور جا پڑے ہیں۔

اقتباس:

وہ بستان شادی کا دل کش بہار — وہ کاخ بشاشت کا ہے خوش نگار
بجاں کہہ وہ اس کے مشتاق ہے — شریف و وضیع دل سے مشاق ہے
وہ مقصود ہے بادشاہ و گدا — وہ مطلوب ہے کافر و پارسا
وہ مقبول کے دل کا منظور ہے — وہ مردود کی چشم کا نور ہے
ثناء خواں اس کا ہے مفلس فقیر — غلط ہو گیا بلکہ میر وزیر
وہ مطلوب دانا و مجنوں ہے — وہ مرغوب مسرور و محزون ہے

مفتی امام بخش صاحب طالب نے تیس (۳۰) اشعار کا قصیدہ حب الوطنی پر پیش کیا ہے۔ یہ قصیدہ مولانا روم سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔

سب سے پہلے حمد ہے اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ اہل وطن کے دل میں وطن کی محبت ضرور ہوتی ہے۔ یوسف علیہ السلام اگرچہ مصر کے بادشاہ بن گئے تھے لیکن کنعان کو زندگی بھر نہ بھول سکے:

گفت مولانا جلال الدین اندر مثنوی — چوں کلام اوست شکر ریزہم در عدل
سفر گر روم بینی یا ختن اے نامو — از دل تو کے رود حب وطن اے بے وطن

پھر کہتے ہیں کہ ہندیوں کے دل میں ہند کی سندھیوں کے دل میں سندھ کی

اھل ایران کے دل میں ایران اور اھل توران کے دلوں میں توران کی محبت ہوتی ہے۔ غرض اے اھل قوم، وطن کی محبت ہی کی وجہ سے ہم عزت دار کہلا سکتے ہیں۔ حب وطن کے معنی یہی ہیں کہ قوم میں علم و ہنر پیدا کرنے کے لیے جد و جہد کرو تاکہ معاش کے دروازے ان پر کھل سکیں :

ھر کہ می بیند بقوم خویش از بغض و رشک

ہست نا خوان الشیاطین، بر سرش کفشے بزن

میں بیمار ہوں اور اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ میں سامعین، شائقین اور ناظرین کے حق میں دعا کروں۔ اس کے بعد دولت انگلیشیہ کی عدالت، شجاعت و سخاوت کی تعریف کی ہے۔ (جس شعر سے سن ہجری مرتب ہوتا تھا وہ شعر کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے پڑھا نہ جا سکا البتہ سنہ ۱۲۹۱ھ فٹ نوٹ میں دیا ہوا ہے)

با امان خوشتر قصیدہ بہ بداں از عیسویت

سال ایں خورم قصیدہ بہر یاد انجمن

خط کشیدہ سے سنہ ۱۸۷۴ء نکلتا ہے۔ یہ قصیدہ فارسی زبان میں ہے۔

یہ پہلی نظم ہے جس میں وطن کی محبت کا مطلب وطن کی خدمت بتایا گیا ہے۔ یہ جذبہ قابل قدر رہے۔ گویا شاعر نہ صرف جدید شاعری کے قائل تھے بلکہ اھل وطن کو جدید علوم حاصل کرنے کی رغبت بھی دلانا چاہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی صرف جدید علوم کی اہمیت ہی سے نہیں بلکہ علمی جدید تحریکوں سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کا جذبہ عمل قابل صد ستائش ہے

اب انور حسین ہما کی باری آئی انھوں نے بہتر (۷۲) اشعار کی نظم سنائی اس نظم کی خاص بات یہ ہے کہ ہما کبھی اردو میں شعر کہتے ہیں اور کبھی فارسی میں وطن کی محبت کے معنی دوسری دنیا ہے۔ جہاں سب کو جانا ہے۔ اس نظم کا لب لباب یہ ہے کہ یہاں کی ہر خوشی ہر محبت، ہر چیز اور ہر جذبہ فانی ہے۔ ضرورت اس

بات کی ہے کہ زندگی ہی میں عاقبت کی فکر کی جائے جو ہمارا اصلی وطن ہے۔ خواب میں حب الوطنی کا جذبہ مجسم ہو کر سامنے آیا اور کہا کہ اِس فانی دنیا کو وطن نہ کہہ۔ وطن تیرا دراصل وہی ہے جہاں سے تو آیا ہے۔

یہ نظم پڑھ کر زندگی سے کراہیت پیدا ہوتی ہے اور کارکردگی کی قوت مفلوج ہوتی ہے۔ بڑے درد انگیز اور عبرت ناک انداز میں انھوں نے موت کا تفصیلی بیان کیا ہے۔ صنعت تلمیح اور صنعت ایہام کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ کلام میں کہیں کہیں روانی ہے لیکن فارسی کے اشعار جوش اور زور پیدا کرنے کے لیے کہے ہیں اور یہیں ذہن ٹھوکر کھاتا ہے۔ بعض اشعار پھیکے ہیں۔ رعایت لفظی سے بہت کام لیا ہے مرکبات کی بہتات ہے۔ دور از کار استعارے اور تشبیہیں کثرت سے ہیں۔ یہ نظم پڑھ کر شاعر کی قابلیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

اقتباسات :

تابکے تجھ کو گوارہ ہے ولائے وطنی — چھوڑ دے بہر خدا عجب و سرِ ما منی
بتلاشے کفنے آمدہ عریاں چند — پارہ از دست اجل گشت گریباں چند
زندگی پر نہ ہو نازاں کہ تجھے مرنا ہے — آخرِ اس عالم فانی سے سفر کرنا ہے
کاش اول ہی اگر عزم سفر کرتا تو — دمبدم دم نہ بجز حب وطن بھرتا تو

شیخ الٰہی بخش رفیق نے اپنی مثنوی "کلید محبت" سنائی جو ایک سو اڑسٹھ (۱۶۸) اشعار پر مبنی ہے۔ ان اشعار سے مثنوی کی ابتدا کی ہے :

حب وطن ہے گل چمن روزگار کا — یہ گل سدا دکھاتا ہے موسم بہار کا
حب الوطن وہ باغ ہے جس میں خزاں نہیں — گل چین نہیں ہے جس میں کوئی باغباں نہیں

حب الوطنی کی تعریف میں پہلے انھوں نے سولہ اشعار کہے ہیں۔ اِس کے بعد انسانوں اور جانوروں کی مثالیں دے کر بتایا ہے کہ اگر انھیں وطن سے دور کر دیا جائے تو وہ کس طرح برباد ہو جاتے ہیں۔ رفیق صاحب کہتے ہیں کہ

میرے خیال میں وطن سے محبت کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو اس طرح کہ وطن سے جہالت اور بدامنی دور کی جائے اور ایسے کام کیے جائیں جس سے وطن ترقی کرے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر وطن کو ضرورت پڑے تو جان بھی قربان کر دی جائے۔ یہ عظیم عبادت ہے۔ یک جہتی کی مثال چیونٹیوں سے دی ہے کہ وہ نتیجے پر نظر رکھتی ہیں اپنی جان کی انھیں پروا نہیں ہوتی۔ پھر رستم کی مثال دی ہے۔ انگریزوں کے لیے کہتے ہیں کہ اپنے وطن کو فائدہ پہنچانے کے لیے وہ کتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں آئے ہیں۔ تار اور ریلوں کا جال بچھا دیا ہے۔ دشت و صحرا میں جاتے ہیں جنگل جنگل پھرتے ہیں کہ قیمتی پتھر تلاش کریں۔ یہ تلاش دراصل معاش اور علم و ہنر کی تلاش ہے۔ وہ درختوں کے پتوں سے نئی نئی دوائیں بناتے ہیں۔ اس کے بعد دو کہانیاں نظم کی ہیں۔ یہ دونوں کہانیاں انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں کہ دو فرلیقوں نے کس طرح جان دے کر اپنے ملک کی سرحد کی حفاظت کی۔ دوسری کہانی کا ہیرو کوک لیز ہے کہ اس نے جان دے کر پل تباہ کیا اور غنیم کو ملک میں داخل نہ ہونے دیا۔

اِس مثنوی کی زبان بڑی سادہ اور عام فہم ہے۔ شاعر کو معلوم ہے کہ بچوں کے نصاب کے لیے نظمیں لکھنی ہیں۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن اسے کامیاب کوشش نہیں کہہ سکتے۔ تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیا ہے۔ بہر حال شاعر انگریزی ادب سے متاثر ہیں اور اردو زبان میں اِن خیالات کو ڈھالا ہے اِن شاعروں میں یہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے براہ راست انگریزی ادب و خیالات سے متاثر ہو کر اور جدید علوم کی اہمیت سے واقفیت کے بعد اسے بچوں کے لیے اِن ہی کی آسان زبان میں اِسے نظم کیا۔ یہ نظم اِن شاعروں میں جدید اردو شاعری کے ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ **نمونہ کلام:**

حبِّ وطن وہ پھول ہے اِس دل کے باغ میں
خوشبو سے جس کے آتی ہے قوت دماغ میں

حبِ وطن وہ سایۂ نور الٰہ ہے
جس کی ہر ایک دل کو زمانے سے چاہ ہے
وہ آفتاب حبِ وطن نور پاک ہے
جس سے کہ ذرہ ذرہ جہاں تابناک ہے
دیکھو جدھر کو نور سے سایہ فگن ہے وہ
کھِلتے خوشی سے ہیں جس کو اس کی کرن ہے وہ

مصر رام داس قابل رئیس لاہور نے حبُ الوطنی کے اظہار کے لیے فارسی کو منتخب کیا اور گیارہ بند کا مخمس پڑھا۔

اِبتداء اِس طرح کی ہے کہ اِنسان ہو یا جانور وطن کی محبت میں بے قرار رہتے ہیں۔ تاجر یا نوکر پیشہ کمانے کے لیے غیر ممالک میں جاتے ہیں لیکن وطن واپس آنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ حاجی حج کرنے جاتے ہیں، مناسک حج ادا کرنے کے بعد بے قرار ہو کر وطن واپس آتے ہیں۔ اسی طرح ہندو یاتراؤں کے لیے وطن چھوڑتے ہیں لیکن انھیں بھی وطن پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔ سکندر نے طویل سفر کیا لیکن وطن نے مقناطیس کی طرح اِس کو واپس کھینچ لیا۔

اجنبی علاقوں میں بڑے بڑے عہدوں پر لوگوں کا تقرر ہوتا ہے لیکن وہ بھی بار بار وطن جانے کی چھٹی مانگتے ہیں۔ لیکن حبُ الوطنی کا یہ جذبہ مجازی ہے۔ ہمارا اصل وطن تو وہ ہے جہاں سے ہم آئے ہیں اور ہماری روحیں اِس جسم میں قید ہیں۔ دیکھ لو دنیا میں کوئی خوش نہیں مرنے کے بعد جب وہ اپنے اصلی وطن واپس پہنچ جاتے ہیں تب ہی انھیں قرار آتا ہے۔

مصر رام داس، عربی، فارسی، اُردو، ہندی، سنسکرت اور فارسی زبانوں پر پورا عبور رکھتے تھے (جیسا کہ انھوں نے دعویٰ کیا ہے) لیکن اِس مثنوی کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اُردو سے فارسی میں ترجمہ ہے۔ فارسی کی لطافت اور گھلاوٹ اِس میں نہیں۔ طویل استعارے اور تشبیہیں، انگریزی

عہدوں کے نام عجیب معلوم ہوتے ہیں جب کہ فارسی میں اِن کے مترادفات موجود ہیں۔ بیان کے اعتبار سے اور مضمون کی مناسبت سے یہ مثنوی پڑھنے کے قابل ہے۔

نمونہ کلام :

اگرچہ در اضلاع دور از ملک خویش عہدۂ حکام باشد بیش بیش
می شود ڈپٹی کمشنر مشتہر واز کمشنر تا فنانشل نامور
چیف کورٹ اندر یا د جج خطاب باز لیفٹیننٹ گورنر در خطاب
تا گورنر جنرل ملک سیاہ یافتہ ایں منصب وایں دستگاہ
رخصت از ہر کار خواھد بار بار
می کشد حب وطن بے اختیار

مولوی عطاء اللہ خاں صاحب عطاؔ نے حبُ الوطنی پر ایک مسدس اکیس (۲۱) بندوں پر مشتمل پیش کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا اصلی وطن وہی ہے جہاں سے ہم آتے ہیں۔ ہم دنیا میں آئے اور اسے ہر رنگ میں دیکھا لیکن ہماری زبان پر اپنے اصلی وطن ہی کا نام رہا۔

ہر قوم، ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی زبان پر لفظ "حبُ الوطنی" ہے۔ وہ طرح طرح سے دعوے پیش کرتے ہیں۔ اور ہر زبان میں کرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ "حب الوطنی" کا مطلب کیا ہے۔ حالاں کہ علم کچھ اور شے ہے اور آدمیت کچھ اور۔ لیکن عالم یہ ہے کہ کتابیں بغل میں دبی ہوئی ہیں اور زبان پر یہی لفظ ہے۔ یعنی اِس کا مطلب نہیں سمجھتے۔

علم حاکمیت کی نشانی ہے۔ اور ان ہی پر علم سجتا بھی ہے لیکن اب اجلاف کمینے اور پیشہ ور لوگوں کا دور دورہ ہے۔ اِن کی زبان پر بھی یہی لفظ ہے۔ شرفا نے وطن چھوڑ دیا کیوں کہ اب یہ شریفوں کے رہنے کی جگہ نہیں رہی۔

خدا کی حکمت نے آدم و حوا کو جنت سے نکالا اور ہم دنیا میں آکر در بدر ہو گئے۔ لوگوں کو بڑے بڑے مرتبے حاصل ہیں لیکن جب تقدیر کے "کورٹ" سے موت کا "سمن" جاری ہوگا تو یہ تمام لوازمات دھرے رہ جائیں گے۔

ہر جان دار اپنے وطن سے محبت کرتا ہے۔ بلبل، قمری، زاغ و زغن سب وطن کی محبت میں سرشار ہیں۔ وطن کی محبت ایمان ہے۔ جب تک جسم میں جان باقی ہے ہم وطن کی شان میں قصیدے پڑھتے رہیں گے۔ غربت سب سے بڑی بیماری ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں عافیت ہو وہی وطن ہے۔ آج کل ذلیل اور کمینے دنیا کی دولت اور شہرت حاصل کرنے کے لیے وطن وطن پکارتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح ناموری حاصل ہو۔ آغاز و انجام سے بے خبر صبح سے شام تک محنت کرتے ہیں اور حب الوطنی پر نظمیں لکھ کر لاتے ہیں تاکہ انجمن میں نام روشن ہو۔

اس نظم پر بھی نظیر اکبر آبادی کا اثر ہے۔ شاعر کے ذہن سے انجمن پنجاب کے مشاعروں کا مقصد غائب ہو گیا پوری نظم میں شعراء کو جلی کٹی سنائی گئیں چھٹے مصرعے کی تکرار سے طنز اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ رعایت لفظی، صنعت تلمیع، ایہام، استعارے، تشبیہیں لیکن بے مزہ۔ اس مسدس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شاعرانہ چشمک شروع ہو گئی تھی۔ کرشن لال نے مذہبی تعصب کی ابتدا کر دی تھی۔ **نمونہ کلام:**

گو ہیچ از اسلاف ہے او باش یا اجلاس ہے
حجام یا نداف ہے جاری زبان پر لاف ہے
ہے اشرفی اشراف ہے جو عیب ہے سو معاف ہے
اکسیر ہے دنیا میں دھن کی چیز ہے حب وطن
ورد زباں ہے یہ سخن جب تک زبان ہے در دہن
حب الوطن، حب الوطن، حب الوطن، حب الوطن

غافل تو کسی غفلت میں ہے آج اس جگہ فرصت میں ہے
آخر تو کل حیرت میں ہے کر لے جو کچھ طاقت میں ہے
جب روشن ہو گیا معلوم ہو ظلمت میں ہے
چلنا ہے اصلی دیس میں کر لے یہاں تو کچھ جتن
ورد زبان ہے یہ سخن جب تک زباں ہے در دھن
حب الوطن، حب الوطن، حب الوطن، حب الوطن

اِس نظم میں جہاں شاعرانہ چشمک یا کم مرتبہ لوگوں کا علم حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اِس سے عوام کی علم دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ "انجمن پنجاب لوگوں میں بے حد مقبول تحریک تھی۔ اِس نظم کے اشعار کی بندش کہیں چست اور کہیں ڈھیلی ہے کئی مصرعے وزن پر نہیں۔

منشی علاؤالدین صاحب کی مثنوی تراسی (۸۳) اشعار کی ہے۔ دس اشعار کی غزل بھی ہے۔ وطن کی محبت سے متعلق یہ مثنوی یا طویل نظم کچھ ایسی ہے کہ اِس پر نہ نثر کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ نظم کا۔ نہ کوئی خاص بحر ہے اور نہ وزن۔ مثنوی میر حسن کو سامنے رکھ کر بادشاہ کے دربار لباس اور جشن کے لیے الفاظ چن کر انھیں بے موقع و محل استعمال کیا ہے۔ غزل کا بھی یہی حال ہے۔ خیالات منتشر۔

نمونہ کلام:

حکم منادی کا کرو کوُ بکوُ	عیش مناویں سب ہی کو بکو
پہنے ہوئے خاصہ و ململ بہ تن	رنگ برنگے تھے وہ مزہ لے عیاں
تھے وہ کھڑے شہ کی سرا میں بدر	واسطے خدمات بھی لائے سیر
لے لیے ہاتھوں میں سب ہی عطردان	اور بھی مرصع عجب پاندان
دستہ رابیل سمن اور ہزار	تھے وہ مزین کئے نقش و نگار
بھول جو متقار موسیقار تھا	ارغنوں خوب صدا کرتا تھا

لالہ کھڈا مل مدرس نے تیس اشعار پر مبنی ایک نظم سُنائی جس کا مقصد یہ ہے کہ حب وطن دریائے اعظم میں در شہوار ہے۔ انسان باغ ہے تو حُب وطن گل لالہ۔ یہ عصائے موسیٰ کی طرح یاور ہے۔ بازو کا تعویذ ہے وغیرہ۔

اِس نظم میں اصلاحی خیالات بھی ہیں کہ وطن وطن پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہمت ہے تو وطن کی حفاظت کے لیے تیغ وسناں سے خود کو تیار کرو۔ صرف جوان ہی نہیں بوڑھے بھی وطن کی خدمت کر سکتے ہیں۔ نکوکاری سے وطن کی جڑوں کو سینچو۔ طوفان غم میں پیراک بن جاؤ۔ خدا اس کی مرادیں پوری کرتا ہے جس کے دل میں وطن کی محبت ہوتی ہے۔

پوری نظم استعاروں اور تشبیہوں میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اِس نظم کی کوئی خاص بحر نہیں۔ اکثر و بیشتر اشعار وزن سے گرے ہوئے ہیں۔ خیالات اگرچہ اصلاحی اور قابل قدر ہیں لیکن نظم کا کوئی معیار نہیں۔ زبان البتہ صاف ہے۔ نہایت سہل۔ یہ نظم اِس لحاظ سے قابل ستائش ہے کہ اردو میں آسان گوئی کی کوشش کی گئی ہے۔

نمونہ کلام :

جوانو! جواں مردی کا وقت ہے — سجاؤ بر تن تیغ حُب وطن
کریں پیر بھی اِس کو اختیار — سنوارے انھیں آخر حب وطن
نکوکاری کی جڑ کو محکم کرے — سمجھاوے رہ نیک حُب وطن
قبائے محبت کی بخش اِسے — کمربند زریں حب وطن

سید اصغر علی لکھنوی حیقر نے ستاسی (۸۷) اشعار کی نظم سنائی۔ اس نظم کی ابتدا سوالیہ انداز میں تشبیہوں اور استعاروں سے کی ہے کہ کس چیز کا نقشہ آنکھوں میں رہتا ہے۔ نخل مراد کیا ہے۔ سرو آزاد کس کی آرزو میں ہے اِس قسم کے اڑتالیس اشعار ہیں بڑی محنت سے الفاظ چن چن کر نظم کئے ہیں پھر کہتے ہیں کہ اگرچہ انگریزوں کو یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی لیکن اِن کے دل بھی

وطن کی یاد میں بے چین رہتے ہیں۔ پھر سامعین سے یہی سوال کرتے ہیں۔
اِس کے بعد وطن کا نوحہ کرتے ہوتے کہتے ہیں کہ وہ اھل وطن جو استادانِ سخن تھے اور زبان سنج تھے ان کے مرقد کا نشان بھی باقی نہیں صاف کہتا ہوں کہ اب صرف اُردو قاعدہ پڑھنے والے باقی رہ گئے۔ شاعری کے اعتبار سے یہ نظم الفاظ کی بازی گری معلوم ہوتی ہے۔ صنعت نقاد صنعت تلمیح اور الفاظ کی تکرار سے نئے معنی نکالنے کی سعی ناکام ہے۔ ہندی ادر فارسی کے مرکبات البتہ قابل غور ہیں۔ لف ونشر و مرتب اور غیر مرتب دونوں ہیں لیکن اس سے انجمن کے مشاعروں کا مقصد پورا نہیں ہوتا
نمونہ کلام:

کون سا سنگ ہے وہ شیشۂ دل ہے جس کے سنگ
کیا وہ میزان کہ ہے آرزو جس کا پاسنگ
کیا وہ آئینہ ہے دل جس سے کہ ہوتا ہے صفا
کیا ہے وہ سنگ کہ ہو شیشۂ دل جس سے جلا
یا خدا کیا ہوئے استاد سخن سنج زمان
شاعروں کو جو کیا کرتے تھے ہر دم شادان
شاہ معنی جو تھے مرقد کا نہیں ان کے نشان
ہاں مگر وہ گئے اردو کے اب قاعدہ دان

محمد حسین آزاد نے "حب وطن" پر مثنوی سنائی جو ایک سو چھیانوے (۱۹۶) اشعار پر مشتمل تھی۔ یہ مرصع مثنوی وطن کے لیے سرفروشی کے جذبات سے پُر ہے۔
آزاد نے استعاروں اور تشبیہوں سے حبُ الوطنی کے جذبات کی تفسیر بیان کی ہے:

حبُ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے　　نکلے جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے

حُب وطن نہ یہ ہے کہ پانی میں گر نہ ہو — ماہی کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو
حُب وطن اِسے بھی نہیں کہتے اہلِ ہوش — یاد وطن میں ہو وہ وے جیسے جوش کہ خروش

پھر ایک ستار نواز کا حال لکھا ہے کہ دکن سے اِس کے لیے خلعت اور دولت بھیجی گئی اور بادشاہِ دکن نے زادِ راہ کے طور پر روپیہ بھی بھیجا اور اسے دکن بلایا۔ ستار نواز کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ دلی چھوڑ کر چلا جائے لیکن وہ دکن کے لیے روانہ ہوا۔ جب وہ دلی شہر سے باہر نکلا تو اس نے دکنی نمائندے سے پوچھا کہ "تمھارے یہاں جمنا ندی ہے"؟ اِس نے جواب دیا "نہیں" پھر اس نے جامع مسجد کے لیے دریافت کیا تو جواب ملا کہ ایسی جامع مسجد وہاں نہیں ہے۔ ستار نواز نے کہا:

ہم اپنی دلی چھوڑ کر دکن نہ جائیں گے — گریاں بہت نہ کھائیں گے تھوڑا ہی کھائینگے
ایسے ہی ننگ حبِ وطن بد نصیب ہیں — گھر میں مسافروں سے جو بدتر غریب ہیں
اب میں تمہیں بتاؤں گا حُبِ وطن ہے کیا — وہ کیا چمن ہے اور وہ ہوائے چمن ہے کیا
وہ رحمتِ خدا ہے کہ بندوں پہ عام ہے — وہ لطفِ عام جس سے جہاں شادکام ہے
وہ نورِ مہر جس سے زمانے میں نور ہے — وہ نور ذرہ ذرہ پہ جس کا ظہور ہے
حُب وطن ہے جلوہ اِسی نورِ پاک کا — اور روشن اِس کے نور سے عالم ہے خاک کا

یہاں آزاد کا مقصد وطن سے ملکِ عدم ہے۔ تصوف کے طویل استعارے کے بعد کہتے ہیں:

آزاد خیر ہے کہ جو آیا خیال ہے — تم دیتے کیا جواب ہو اور کیا سوال ہے
جاتا تھا کس طرف کو قدم جا پڑا کہاں — تھا ذہن کس خیال میں اور جا لڑا کہاں
دنیا زبسکہ مزرعِ عقبیٰ تمام ہے — سرسبز کرنا اِس کا بھی لازم کلام ہے

مولانا آزاد اِس زمانے میں مشاعروں اور انجمن پنجاب کی روحِ رواں تھے۔ لہٰذا جو نظمیں مشاعروں میں پڑھنے کے لیے بھیجی جاتی تھیں اُن کے معیار کو جانچنے میں آزاد بھی شامل تھے۔ شیخ الٰہی بخش رفیق کی مثنوی "کلیدِ محبت" میں جو کہانیاں

نظم کی گئی ہیں آزاد نے انھیں کہانیوں کو فصیح تر اور موثر زبان میں نظم کیا۔ پہلا قصّہ دو ملکوں کی سرحد کے تعین سے متعلق ہے۔ دوسرا کو کلینر کا اور تیسرا رستم کا۔ بلکہ مولانا نے اپنے اشعار میں رفیق کی مثنوی کا حوالہ بھی دیا ہے۔

اِن کہانیوں کے بعد۔ عالم فاضل، تاجر، ماہر نباتات کا ذکر کیا ہے کہ وطن کے لیے کیسی مصیبتیں اٹھاتے ہیں۔ اس کے بعد حب الوطنی سے سرشار اس ڈاکٹر کا ذکر کیا ہے جس نے فرخ سیر کا علاج کیا تھا اور انعام میں انگریز تجاروں کے مال کا محصول معاف کرایا تھا۔ اِس قصے کے بعد اہل ملک، اہل پنجاب اور انجمن پنجاب کے لیے دعا ہے :

لبریز جوں حبِ وطن سب کے جام ہوں سرشار ذوق و شوق دل خاص و عام ہوں

قصے وہی، روایات وہی، استعارے وہی، تشبیہات وہی ہیں۔ لیکن سادگی ادا اِس مثنوی کی جان ہے۔ اِس مثنوی کا مقصد بھی جدید اُردو شاعری کی بنیاد تھا۔ اِس میں حبُ الوطنی کے بڑھتے ہوتے جذبات کی ارتقائی منزل کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ قوتِ عمل کو مہمیز لگائی ہے اور قدیم شاعری کی رگوں میں نئی زندگی دوڑتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ نظم اُردو شاعری کے خوش گوار مستقبل اور رجائیت کی نشاندھی کرتی ہے اور اِسی انداز کی وجہ سے جدید اُردو شاعری میں زیادہ پائداری اور زیادہ واقعیت کی جھلک پیدا ہوئی۔

آزاد کے بعد حالی نے اپنی مثنوی ۔ب وطن سنائی۔ ان اشعار سے اِس مثنوی کی ابتدا کی ہے :

اے سپہر بریں کے سیارو! اے فضائے بریں کے گل زارو
اے پہاڑوں کی دل فریب فضا اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

تم وہی آسمان، وہی زمین ہو، یہاں ویسے ہی باغ ویسی ہی نسم سحر ہے جیسی کہ وطن میں تھی۔ لیکن جب ہم اپنے وطن میں تھے تو تمہارا رنگ کچھ اور ہی

تھا میرے درد کا درمان تھے۔ تم سے دل شکیبائی حاصل کرتا تھا۔ اب جو جا کر بیٹھنے سے دل کے رنج وغم دور ہو جاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ انجمن پنجاب کے اِن عنوانی مشاعروں میں جان ڈالنے والے آزاد کے ساتھ حالی بھی تھے۔ آزاد ایک رنگین بیان نثار تھے اور خاص رنگ کے موجد تھے۔ لیکن شاعری آزاد کی ذھانت اور طباعی کا ایک حصّہ تھی وہ جدت طراز تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اگر ابتداء ہی سے حالی جیسے مستقل مزاج، سنجیدہ طبیعت اور درد مند شخص اِن کا ہاتھ نہ بٹاتے تو آزاد کی کوششوں میں خامی رہ جاتی۔ حالی پہلے شاعر تھے اور پھر نثر نگار۔ قدیم اصناف خیالی کی شکست و ریخت اور نئے تصور شعری کی تعمیر میں حالی نے جو حصّہ لیا وہ حیرت انگیز ہے۔ ان کی شاعرانہ بصیرت نے ان جدید مشاعروں میں جان ڈال دی۔

..........+..........

"امن" - پانچواں مشاعرہ[1]

اگست میں منعقدہ چوتھے مشاعرے میں پانچویں مشاعرے کے لیے "امن" عنوان دیا گیا تھا۔ جو ۹ر اکتوبر، ۱۸۷۴ء کی شام کو منعقد ہوا۔ اور اِسی مجلس میں آئندہ منعقد ہونے والے چھٹے مشاعرے کے لیے "انصاف" عنوان دیا گیا متذکرہ پانچویں مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں:

"منشی لچھمی داس برہم، مولوی گل محمد عالی، مولوی شاہ محمد صادق الحسین شریف (مہتمم رسالہ "طلسم حیرت" مدراس)، مفتی امام بخش رئیس بٹالہ، مصر رام داس قابل (بزبان فارسی)، مولوی محمد حسین آزاد، سید اصغر علی حقیر، مولوی سلطان علاؤ الدین محمد قریشی حنفی قادری صافی، مولوی عطا اللہ خان عطا، مولوی امو جان ولی۔"

سب سے پہلے منشی لچھمن داس برہم نے انیس اشعار کی نظم پڑھی۔ اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں "امن" ہوتا ہے وہاں آسودگی ہوتی ہے۔ تباہی و بربادی کا خوف نہیں ہوتا۔ اہل پیشہ سکون سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں

---

[1] "ضمیمہ اخبار پنجاب" یعنی مشاعرہ پنجاب، لاہور: مطبع انجمن پنجاب، ستمبر ۱۸۷۴ء، رجسٹر نمبر ۱۵ چوتھا گلدستہ نمبر ۴۔

سیر اور سفر بھی "امن" کے زمانے میں ہوتا ہے۔ میرا منہ اس قابل نہیں کہ اس کی پوری طرح تعریف کرسکوں۔ اگر "امن" نہ ہو تو باپ بیٹے کا دشمن بن جاتا ہے قتل و غارت گری عام ہو جاتی ہے۔ "امن" خدا کی رحمت ہے۔ امن ہی کے زمانے میں علم و ہنر کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جس ملک میں "امن" و امان ہوتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں اس کی عزت ہوتی ہے۔

اِس نظم میں خیالات قابل قدر ہیں لیکن معیار کے اعتبار سے کم تر۔ بحر کا تعین نہیں۔ اکثر اشعار بے وزن ہیں۔ الفاظ کی بے تکی تکرار، تذکیر و تانیث کا اندازہ نہیں۔ لیکن زبان سہل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبان سہل اختیار کرنے کی وجہ سے الفاظ کا صحیح انتخاب نہیں کرسکے:

رہتے آسودہ ہیں جس جا یہ "امن" ہوتا ہے
"امن" ہونے سے نہیں رنج و محن ہوتا ہے

ایسے اوقات میں ہوتا ہی نہیں خوف تباہ
گھر آرام سے بیٹھے ہیں جشن ہوتا ہے

اس کے اوصاف کو ہرگز نہیں کرسکتا رقم
میرا کب قابل اظہار دھن ہوتا ہے

"امن" ہونے سے ذرا نہیں کھٹکا ہوتا
یہ نہ ہوتا تو عجب جان پہ صدمہ ہوتا

بے "امن" عزر کر و قہر خدا کا ہوتا
باپ بیٹے و برادر میں تفرقہ ہوتا

مولوی گل محمد عالیؔ، مدرس مدرسہ پھلوار نے پہلے تیس (۳۰) اشعار کی ایک مسلسل نظم پڑھی اس نظم میں ایک فرضی کہانی بیان کی ہے کہ خلیفہ مامون رشید کے دربار میں یہ ذکر ہو رہا تھا کہ جو بادشاہ اپنے ملک میں امن و آمان برقرار رکھتا ہے وہ مرنے کے بعد مٹی نہیں بنتا ہے عذاب قبر سے بچا رہتا ہے۔ مامون رشید کے دل کو یہ بات لگی اس نے شاہ نوشیروان کی قبر کھدوائی تو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں بڑے آرام سے اسی طرح لیٹا ہے۔ جیسے ابھی اس کی آنکھ لگی ہو۔ اِس کے بعد کہتے ہیں کہ اے شاعر اب ایسے شیریں اشعار شیریں (حلوائے قند) پڑھ کر دوستوں کا دل اِس پر فرہاد کی طرح عاشق ہو جائے۔

اِس نظم کی ابتداء "دبستان لکھنؤ" کا نمونہ ہے۔ رنگین الفاظ، تشبیہیں،

استعارے اور صنعتیں استعمال کر کے اپنے کلام کی غلو کی حد تک تعریف کی ہے۔ فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ سے کلام میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اِس نظم کے بعد سولہ بندوں کا ایک مسدس ہے جس کا پانچواں اور چھٹا مصرعہ یہ ہے :

شہا خلق خالق سے باداد ہو تجھے مقبرہ امن آباد ہو

تین بندوں میں نصیحت ہے کہ بادشاہت ایسی شے ہے جس پر فخر کیا جائے۔ فریدوں، ضحاک، قارون، لقمان سب خاک میں مل گئے لیکن حکومت فریادی کے ساتھ انصاف کرنے سے قائم رہتی ہے۔ اگر حاکم ستم گر ہے تو بلا شبہ وہ فرعون اور شداد سے کم نہیں۔ دولت آنی جانی شے ہے۔ یہاں کسی کو ثبات نہیں۔ اگر خوشی میسر ہے تو اِس میں بھی غم پنہاں ہیں۔ دن کے بعد رات آتی ہے۔ چرخ کج رفتار کسی کو نہیں بخشتا۔ رستم، اسفندیار، فرامرز، نیل، بہمن، گودرز، گیو گرگیس سب ختم ہو گئے۔ شاہ ہو یا گدا سب کو ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ یہ نظم شاعر کی وسیع معلومات پر دلالت تو کرتی ہے لیکن جدید شاعروں کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ البتہ اشعار رنگ و آہنگ سے آراستہ ہیں۔

نمونہ کلام :

تو ہو شاد اے بلبل بوستان کہ ہے گل سے بہتر یہ رنگین بیان
میرے ہاتھ میں کلک رنگین ہے نگارندۂ نظم رنگین ہے
کیا نظم وہ ناسخ باغ ہے دل و جان لالہ پہ داغ ہے
اسے دیکھ ریحان پیچان ہے بنفشہ بخجلت پریشان ہے

جہاں میں سدا زندگانی نہیں جہاں میں سدا شادمانی نہیں
جہاں میں سدا حکمرانی نہیں جہاں میں سدا کامرانی نہیں
شہا خلق خالق سے باداد ہو تجھے مقبرۂ "امن" آباد ہو

مدراس سے رسالہ "طلسم حیرت" کے مدیر مولوی شاہ محمد صادق الحسنین شریف تھے۔ انھوں نے مدراس سے اپنی نظم مشاعرے کے لیے بھیجی۔ جو مشاعرے پڑھی گئی۔ اس نظم سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انجمن پنجاب کے مشاعرے ہندوستان کے طول و عرض میں شہرت حاصل کر رہے تھے اور ان مشاعروں سے لوگوں کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ جدید اردو شاعری کو مقبولیت عوام حاصل ہو رہی تھی۔

اِس نظم کے ابتدائی ستائیس (۲۷) اشعار حمد و نعت کے علاوہ قوت گویائی اور پھر اردو زبان کی تعریف میں ہیں۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اِس نے قوت گویائی عطا کی کہ میں حکام وقت کی تعریف و توصیف کر سکوں کیوں کہ یہ اردو زبان کے قدر دان ہیں۔ اور اِس کی ترقی میں کوشاں ہیں۔ پھر اُردو زبان کو دائم و قائم رکھنے کی دعا ہے۔

سترہ (۱۷) اشعار کی غزل اردو زبان کی تعریف میں ہے۔ اِس کے بعد انہتر (۶۹) اشعار میں "وجہ تالیف" بیان کی ہے۔ پہلے دعا کی کہ میری زبان میں اتنی استطاعت عطا کر کہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں کیوں کہ یہ اشعار انجمن پنجاب کے مشاعرے میں پڑھے جائیں گے۔ میرا وطن مدراس ہے۔ اُردو میری مادری زبان نہیں لیکن مجھے اُردو زبان کے اِس نئے موڑ کی اہمیت کا اندازہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ حکام وقت اُردو کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ جو ملکہ وکٹوریہ کے نمائندے ہیں۔ آخر میں ملکہ اور ان کی اولاد کے لیے دعائیں ہیں۔

مدراس کا حال پچاس اشعار میں بیان کیا ہے کہ یہ جگہ کبھی علم و فن کا مرکز تھی، منشیوں، عالموں، شریفوں، اور شاعروں کی قدر ہوتی تھی لیکن زمانے کی ناقدر شناسی اور خوشامد خوروں نے متاع علم کو برباد کر دیا۔ لیکن اب یہاں امن و امان ہے۔ اب جب کہ حکام منصف اور اہل علم ہیں تو اردو زبان کو ضرور ترقی نصیب ہو گی۔

مدراسی اور مادری زبان گجراتی ہونے کی وجہ سے ان کی زبان میں خامیاں ضرور موجود ہیں لیکن اردو زبان سے محبت کی جو تڑپ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے وہ قابل قدر ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ قدیم و جدید ادب پر ان کی نظر گہری ہے اِسی وجہ سے وہ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے مقصد سے باخبر نظر آتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

پر شکر کیوں نہ زبان پر آتے — قسمت نے یہ دن اسے دکھائے
حکام ہیں گرم قدردانی — ذرّوں کو ہے شوق مہربانی
اتنا نہیں فہم خستہ جان میں — ہے منہ میں زباں کو منہ زبان میں
بات اپنی بنا کر دکن میں — ہیں جاؤں محفل سخن میں
لیکن جو ہے شوق مجھ کو بالذات — تقلید زبان کی منہ میں ہے بات
ہیں حاکم وقت اس کے بانی — اب ہوگی زبان کی قدردانی
انصاف کا پھل مگر یہی ہے — سچ ہے یہی "امن" کا اثر ہے
یارب یہ چمن سدا ہو آباد — اِس باغ کے باغباں رہیں شاد

ان کے بعد مولانا محمد حسین آزاد نے "مثنوی خواب امن" پڑھی۔ یہ مثنوی ایک سو انہتر (۱۶۹) اشعار پر مبنی ہے۔ ابتداء اِس شعر سے کی ہے:

تھک کے خورشید نے دم کل جو سرِ شام لیا
دل نے بھی کرسیٔ آرام پہ آرام لیا

شام ہوئی، رات آئی اور ایسا "امن و سکون" ساتھ لائی کہ سب لوگ گہری نیند کے مزے لینے لگے۔ مجھے بھی نیند آ گئی۔ خواب میں میں نے ایک ایسا باغ دیکھا کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ یہاں امن و امان تھا۔ پانی کی نہریں تھیں پھول کھلے ہوئے تھے۔ لیکن ایسی خاموشی طاری تھی کہ صبا بھی دبے پاؤں

گزرتی تھی۔ یہ باغ ایک پہاڑ کے دامن میں واقع تھا پہاڑ پر سے پانی کا ایک چشمہ جاری تھا جو اس باغ کو سیراب کر رہا تھا۔ اس چشمہ سے شیر اور بکری ایک ہی جگہ پانی پی رہے تھے۔ میدان کے بیچ میں ایک قلعہ بنا ہوا تھا جس پر "امن" کا گنبد جگمگا رہا تھا۔

یہ ستم دیدہ دنیا کا ستایا ہوا اس قلعے کے اندر پہنچا تو دیکھا کہ یہاں خسرو امن کا دربار لگا ہوا ہے۔ سامنے مرادوں کے چمن کھلے ہوئے ہیں اور وہ پھولوں کے جھونے میں جھول رہا ہے ہر طرف خوشی و شادمانی ہے۔ دن، شام، اور رات مسکرا رہے تھے۔ شبنم کے بجائے نور برس رہا تھا اور ہر شخص بڑے سکون اور اطمینان سے اپنے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔

دفعتاً "علم" ایک بزرگ کی شکل وصورت میں نمودار ہوا جو جبہ و دستار میں ملبوس تھا اس کے ساتھ کچھ لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں۔ بزرگ "علم" نے خسرو "امن" کا شکریہ ادا کیا کہ اس کے دور میں اہل علم اپنا کام بڑے سکون سے سرانجام دے رہے ہیں۔

ان بزرگ کے جاتے ہی ایک بڑی جماعت آئی، یہ اہل زراعت کے سفیر تھے۔ ان کے ساتھ گھوڑے، بیل اور بچھڑے وغیرہ تھے۔ نذر دینے کے لیے ٹوکروں میں اناج اور فصل کے میوے تھے۔ پگڑیوں میں گیہوں کی بالیں بطور طرہ لگی ہوئی تھیں۔ انھوں نے نذر پیش کر کے شاہ "امن" کی سلامتی کی دعائیں مانگیں۔

ابھی یہ لوگ رخصت ہو ہی رہے تھے کہ کچھ لوگ ریل اور جہاز سے اتر آئے ان کے کندھوں پر اور بغلوں میں سفری تھیلے تھے۔ چہرے دھوپ اور محنت سے سنولائے ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی شاہ امن کا شکریہ ادا کیا کہ ملک میں امن وامان کے باعث "تجارت" ترقی پر ہے۔

ان کے جاتے ہی بہت سے لوگ اندر آئے جو صنعت و دستکاری

کے نمائندے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تازہ ایجادات کے گلدستے تھے انھوں نے ملک کی دستکاری اور صنعت کی ترقی کے پھول بادشاہ کو پیش کیے اور اطلاع دی کہ اہلِ ہنر نئی نئی ایجادات میں مصروف ہیں۔

دفعتاً دربار پر چاندنی چھا گئی۔ در و دیوار طلائی ہو گئے یہ دولت کی پری تھی۔ جو دربار میں حاضر ہوئی تھی۔ دربار کا ہر شخص خوشی سے سرشار ہو گیا اس نے گا کر شاہ امن کا شکریہ ادا کیا۔

سب لوگ مگن تھے کہ ناگہاں صحرا سے ایک ہیبت ناک آواز آئی۔ دربار میں افراتفری پڑ گئی لوگ باہر کی طرف دوڑ پڑے۔ دیکھا تو ایک نہایت کریہہ شکل کا لیکن نہایت قوی شخص سرخ سرخ آنکھوں سے اِس مجمع کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ان لوگوں کو اپنے پاس بلایا اور بتایا کہ وہ شاہ امن سے جنگ کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ میں تمہیں راہ راست پر لگانا چاہتا ہوں۔ آؤ! آگے بڑھو اور غیر ممالک فتح کرو۔ امن اور سکون نے تمہیں بزدل بنا دیا ہے۔ لوگ اِس کی باتوں میں آ گئے اور اس کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ اِس خوف ناک شخص نے ایک ہیبت ناک قہقہے کے ساتھ ملک امن پر دھاوا بول دیا اور اپنے ساتھیوں کو للکارا کہ وہ آگے بڑھیں۔ شور قیامت برپا ہو گیا اور میری آنکھ کھل گئی۔

یہ نظم ایک طویل استعارے میں کہی گئی ہے۔ آزاد کی یہ نظم پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہم قدیم شاعری کے مصنوعی چمن زاروں سے نکل کر ایک ایسے خودرو خطے میں پہنچ گئے ہیں جہاں ہر چیز اپنی دل کشی اور رعنائی کے لیے دست قدرت کی مرہون منت ہے۔ صبح و شام کے وقت پرندوں کی چہکار، پھولوں کی مہک، آبشاروں کا شور، سبزہ زاروں کی دل کشی اور کہساروں کی بے ترتیبی، غرض حسن فطرت کا رنگین مرقع آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ منظر کشی انتہائی دل فریب، مرقع نگاری بے مثال، تشبیہیں اور استعارے

گویا ان ہی کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ آزاد کا اصلی جوہر پرشکوہ بیان اور ادیبانہ انداز ہے۔

نمونہ کلام

دفعتاً سامنے لیلائے شب تار آئی — کرتی اک اک کو مئے شوق سے سرشار آئی
گرچہ لائی تھی نہ سامان مے نوشی کا — ہاتھ میں شیشہ تھا پر دارو ئے بے ہوشی کا
خواب گو کار جہاں میں خلل انداز ہوا — پر خیالات دلی کو پر پرواز ہوا
ذوق گلگشت کا اک دے کے سہارا مجھ کو — ایسے گلزاروں میں لے جاکے اتارا مجھ کو
کہ نہ تھا فصل بہاری پہ سہارا ان کا — تھا چمن بند طبیعت چمن آرا اِن کا
اِس قلمرو میں رواں تھا قلم امن وامان — پتے پتے کے ورق پر رقم امن وامان
پانی نہروں میں پڑا بہتا تھا اور شور نہ تھا — موجیں بھی دستِ وگریباں تھیں مگر زور نہ تھا

زلف سنبل کی سیہ تھی پہ سیاہ کار نہ تھی
خم تو تھے اِس میں جگر پیچ سے خم دار نہ تھی

لوریاں دیتے تھے نغموں میں پرندے سارے — سوتے آرام سے تھے عیش کے بندے سارے
دامنِ کوہ سے چشمہ جو ہوا تھا جاری — آپ شیریں سے پڑا کرتا تھا شیریں کاری
اِس پہ جھرمٹ میں درختوں کے لب جو کی بہار — اور جو پہ وہیں سبزۂ خود رو کی بہار

شیخ الٰہی بخش صاحب رفیق نے ایک سو ستائیس (۱۲۷) اشعار کی مثنوی پڑھی۔ انھوں نے بھی آزاد کے انداز میں طویل استعارے کے ذریعہ "امن" کی آرزو کا اظہار کیا ہے، کہتے ہیں کہ رات کو میں غافل سو رہا تھا کہ خواب میں ایک شخص آیا اور مجھے ایک ایسے باغ میں پہنچا دیا جہاں ہر طرح کے عیش وعشرت کا سامان موجود تھا۔ باغ ہر طرح سجا ہوا تھا۔ درمیان میں ایک خوب صورت حوض تھا جس میں پاک وصاف پانی بھرا ہوا تھا۔ پتا پتا قدرت خدا کا ترجمان تھا۔ سبزا مخمل کی طرح نرم، لالے کے پھولوں کے تختے کھلے ہوئے، درختوں پر عیش وراحت کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور مرادوں کے پھل لگے ہوئے تھے۔"

میں نے اپنے راہبر سے درخواست کی مجھے "امن" کے متعلق کچھ بتاؤ۔ میرے رہبر نے بتایا کہ "امن" کے گلشن میں علم کے شعر پھلتے پھولتے ہیں۔ ان میں نظم ونثر کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اسی کے فیض سے دولت اور اقبال میں ترقی ہوتی ہے۔ ساری دنیا "امن" کی خواہاں ہے۔ جس ملک میں "امن" ہوتا ہے وہاں ہر طرح کی صنعت وحرفت، علم وہنر ترقی کرتے ہیں۔ اور جہاں "امن" مقصود ہوتا ہے وہاں تباہی اور بربادی ہوتی ہے اور خونریزی غارت گری عام ہو جاتی ہے۔

یہ مثنوی اپنے عنوان کے مطابق واقعی "امن" کی ترجمان ہے۔ زبان بڑی رواں ہے۔ سادگی اور پرکاری کی عمدہ مثال ہے۔ نئے خیالات، نئی تشبیہیں، جدید استعارے استعمال کئے ہیں۔ لیکن شاعری کے اعتبار سے اشعار کی بندش کہیں کہیں ڈھیلی ہے۔ اور کہیں سکتہ پڑتا ہے۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود یہ ایک کام یاب کوشش ہے۔ خاص طور پر منظر کشی پڑھنے کے قابل ہے۔

نمونہ کلام :

کسی پہلے ہی زمانے میں طباشیر سحر — صفحۂ چرخ پہ وہ کھینچ گئی تصویر سحر
رنگ سرخ حور سحر دیکھ وہ چمکاتی ہے — آئینہ مہر ودرخشاں کو لئے آتی ہے
دونوں ہاتھوں سے وہ کافور اڑاتی آئی — امان کا رنگ ہی عالم میں جماتی آئی
گل وگل زار پہ عالم وہ دل افروزی کا — رنگ بگڑا ہوا وہ گنبد فیروزی کا
چار سو پھر کے گلستان میں صبا جاتی تھی — کان تک پاؤں کی آہٹ نہ گرآتی تھی
جھومتی ناز سے باد سحر آتی تھی — ایسا کچھ کان میں ہر گل کے سنا جاتی تھی

لوٹ جاتے تھے وہ سب پھول خوشی کے مارے
سارا جاتے تھے خطر بھول ہنسی کے مارے

قہقہے کی مگر آتی نہ تھی آواز وہاں — اِن کے ہنسنے کا بھی دیکھا عجب انداز وطن

سید اصغر علی حقیر نے چونسٹھ (۶۴) اشعار کی ایک مثنوی پیش کی۔ غدر کے ہنگامے میں لکھنؤ پر جو مصیبت پڑی اس کو بڑے درد انگیز پیرائے میں بیان

کیا ہے کہ میں آنکھوں دیکھی کہتا ہوں کہ جب بادشاہت چھینی گئی تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ فوجوں کا مقابلہ کریں یا نہ کریں۔ اگر مقابلے سے منہ موڑتے ہیں تو بزدل کہلاتے ہیں اور لڑتے ہیں تو باغی ہونے کا الزام لگا کر قتل کر دیا جاتا ہے۔
اِس مثنوی میں انھوں نے رزم کے تمام مضمون باندھے ہیں۔ جن میں توپ، گولے بندوق، تلوار، تیر کمان، طمنچے، غرض ہر ہتھیار اور اس کے استعمال کا ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ کس طرح قتل عام ہوا۔ لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے، گھر لٹے اور جب اعلانِ امن ہوا تو لوگوں نے اپنے عزیزوں کی بے گور و کفن لاشوں کو دفنا دیا۔ بچھڑے ہوئے ملے اور شہر نئے سرے سے آباد ہوا۔
یہ مثنوی بڑی جرأت کے ساتھ ایسے مشاعرے میں پڑھی جس کو انگریزوں کی سر پرستی حاصل تھی۔ حقیر نے اِن کو "عدو" کہہ کر جنگ کا جو نقشہ پیش کیا۔ وہ ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔ جنگ کا نقشہ پڑھ کر میر انیس کے مرثیوں کے رزمیہ اشعار یاد آجاتے ہیں اگرچہ بیان میں خامیاں موجود ہیں۔ بہت سے اشعار وزن میں نہیں لیکن سادگی اور روانی قابل داد ہے۔ شاعر کے ذہن میں مشاعروں کا مقصد موجود ہے لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا بیان ان کی شاعرانہ جرات پر دلالت کرتا ہے۔

نمونۂ کلام :

لگاتا ہے تن پر کوئی برچھیاں — کوئی کہتا ہے مارلو اس کو ھاں
یہ جانے نہ پائے کہیں بھاگ کر — اتارو سر اِس کے چھپے یہ اگر
تمنچہ کوئی بھر کے ہے مارتا — کوئی حاموں پر ہے سر وارتا
لگاتا ہے تلوار کا کوئی ھاتھ — اڑاتا ہے اسوار کا کوئی ھاتھ
کہیں لوٹ ہے اور کہیں مار دھاڑ — کوئی گھر ہے آباد کوئی اجاڑ
کوئی "امن" کی جستجو میں ہے غرق — اڑاتا کوئی ہاتھ ہے کوئی فرق
بجاتا کوئی جنگ کا طبل ہے — کوئی لوٹتا جا کے اصطبل ہے
کوئی "امن" کی کر رہا ہے دعا — کمر باندھے کرتا ہے کوئی دغا

مولوی علاؤالدین محمد قریشی حنفی قادری صافی نے ایک خمسہ پڑھا جس کے پچیس بند ہیں۔ یہ خمسہ عجیب وغریب ہے۔ ابتداء اِس طرح کی ہے کہ خدا نے کائنات بنائی اور امن وامان بخشا لیکن انسان اِس کا احسان نہیں مانتا۔ آسمان بنایا جس سے تقدیر کا حال معلوم ہوتا ہے۔ زمین کا فرش بخشا ہے سورج چاند، ستارے امن وامان کی وجہ سے قائم ہیں۔ ازل سے اللہ نے روحوں سے وعدہ لیا کہ وہ زمین پر امن قائم کریں گی۔ امن کا نام ابد تک قائم رہے گا۔ موت قریب ہے اِس سے بچنا محال ہے۔ دیکھئے تقدیر کیا دکھاتی ہے۔

امن کی تعریف یہ کہ اصل سے امن ہے۔ ظالم محبُوب کو دعا دیتے ہیں کہ تو نے مجھے بسمل کیا خدا تجھے امان دے۔ اب میں مرنے کے قریب ہوں لیکن مجھے امان دینے والا کوئی نہیں گورنمنٹ نے ملک میں اپنے احکام کے ذریعہ امن وامان قائم کیا ہے علم وادب کی خدمت کے لیے مدرسے جاری کئے ہیں۔ آخر میں دعائیں مانگی ہیں۔

اِس مخمس میں دور از کار محاوروں اور تشبیہوں کو بے محل استعمال کیا گیا ہے نہ خیالات میں تسلسل ہے، نہ زبان پر قابو ہے پانچویں مصرعے میں مشکل سے مشکل الفاظ چن چن کر باندھے ہیں جو بے معنی بھی ہیں۔ تذکیر وتانیث پر غور نہیں کیا بے معنی الفاظ ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنا مرثیہ پڑھ رہے ہیں یا امن کے طالب ہیں۔ انجمن کی تعریف آخر میں ہے۔

نمونۂ کلام :

انسان کی نظر ہے تیرے اخلاق کے اوپر — یہ مہر عنایت ہے تو مخلوق کے سر پر
اشفاق کا اظہار تیرا اطہر و انور — اِس خلق کرامات کے سراسر ہے منور

بے مزہ ہے الطاف تیر تقدیر کا نقشہ

بیدائش اِس جان کی جو دیکھی تھی نمودار — تازیست رہے اِس کا ہمیشہ میں گرفتار
کیا رہے ابد تک کھوں اِس کے میں سراسر — جب نکلا گیا پھر نہ آوے گا تو بے کار

اللہ نے کیا یہ سلسلہ زنجیر کا نقشہ

مولوی عطا اللہ عطا کی نظم اٹھارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ کوئی بند دس اشعار کا کوئی چھ اور اکثر آٹھ اشعار کے بند ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے ان خیالات کو قلم بند کیا ہے کہ کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ امن و امان ہے لیکن اس دنیا میں ہمیشہ بدامنی اور افراتفری رہی ہے۔ درۂ خیبر کو دیکھو اب تک وہاں سے گزرنے والے قافلے روتے ہیں۔ مال لوٹنے کے بعد قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہر ملک کا دستور رہا ہے۔ اے امن! اجی یہاں آؤ۔ تم اپنے ممالک کے گورنر ہو۔ تمہارے ماتحت غیر ممالک کے مالک بنے ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر اسی طرح توپ بھر کر غدر کے لشکر کو تباہ کر دو۔ تم نے عوام کو فتح کیا ہے۔ ہر چھوٹا بڑا دعائیں دے رہا ہے۔

کل میں نے غدر سے پوچھا کہ تو کہاں ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں ہر جگہ موجود تھا اور موجود ہوں، لیکن میں اتنا عیار ہوں کہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں چھپا پھرتا ہوں۔ میں ہر دل میں موجود ہوں لیکن ظاہر نہیں ہوتا۔ اے امن! تو ملک میں مقبول ہے۔ سیاح، شاہ و گدا، ہر شخص تجھے ڈھونڈ رہا ہے لیکن اگر کہیں تیرا وجود ہے تو جنت میں ہے۔

نمونۂ کلام :

مشہور جہاں ہے کہ جہاں امن و اماں ہے — پوچھو تو جہاں گرد سے وہ امن کہاں ہے
اے امن! اجی آؤ ممالک کے گورنر — ماتحت تمہارے ہر ایک ملک کے داور
آ توپ سیاست کو اسی آن سے بھر کر — کیوں کر اڑا ڈالو یہ ہیں غدر کے لشکر
آرام خلائق ہو اور ایمن میں ہو کشور — مصروف دعا تم کو ہر اک فرد دکلاں ہے

مشہور جہاں ہے کہ جہاں امن و اماں ہے
پوچھو تو جہاں گرد سے وہ امن کہاں ہے

کیا سفر طلسمات ہے قانون گورنر — روبہ تو کیا شیر کو چیتے کو دے پر
قانون سے مظلوم ہے ظالم ہے دلاور — قانون سے ہے شاہ وگدا دونوں برابر

قانون سے لاہور میں ہر گھر ہے کلکتہ   بکری کو امان میں ہے جہاں گرگ شبان ہے
مشہور جہاں ہے کہ جہاں امن و امان ہے
پوچھو تو جہاں گرد سے وہ امن کہاں ہے

اب ان مشاعروں میں سیاست بھی زیر بحث آگئی تھی۔ یہ ان مشاعروں ہی کی برکت تھی کہ اب رمز و کنایہ اور اشاروں کے بدلے کھلے بندوں سیاست پر نہ صرف بحث و مباحثے ہوتے تھے۔ جن کا اشارہ شاعر نے اپنی نظم میں کیا ہے بلکہ جدید اردو شاعری میں زبان و بیان کی سادگی مناظرہ قدرت وغیرہ کے علاوہ سیاست بھی ایک موضوع کے اعتبار سے اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ شاعر کا مقصد صورت حال کی وضاحت اور عام حالات پر تبصرہ کر کے امن پر طنز کرنا تھا۔ لیکن انجمن پنجاب کے مشاعروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اب نظم میں سیاسی خیالات کا اظہار بھی ہونے لگا تھا۔ اس کے علاوہ انگریز حکام کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہتے ہیں:

"اے زیاں کار غدر تیرا منہہ کالا ہو تو نے جس طرح اندھیر کیا اسی طرح تیرا منہہ کالا ہو۔ تو نے فتنے پھیلائے، امن و امان کو غارت کیا۔ غدر کی وجہ سے ہمیشہ خرابیاں ہی پیدا ہوتی رہی ہیں۔ بدمعاش بنئے، اوباش بدکار اور شرابی ان کے ساتھی ہیں۔ ملک کے آئین کو توڑ کر

نوابی کا یہ حال اٹھارہ سو ستاون کے بعد پیدا ہوا ہے۔ اب تک چوریاں اور ڈاکے پڑتے ہیں۔ غدر کی بنیاد کیا تھی یہ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ یا تو چپ چاپ ظلم سہے جاؤ۔ ورنہ پھر عدالت میں کھینچے پھروگے۔ مکان پر ڈگری آجائے گی اور سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ قسمت کو لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ کوئی ایسا نہیں جو ظلم کی اس آگ کو بجھا سکے۔ لیکن جہاں امن ہے وہاں ریل اور تار کے جال بچھا دیئے گئے ہیں جس سے مشرق و مغرب مل گئے ہیں۔ دنیا میں کوئی نہ کوئی چیز ایسی ضرور زندگی میں داخل ہوتی ہے۔ جو دو

دن آرام سے گزر جاتے ہیں اور پھر موت آتی ہے جس نے دارا اور سکندر کے جاہ و حشم کو برباد کر دیا۔ یہ مثنوی زبان و بیان کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔ مشکل الفاظ سے پرہیز کیا ہے۔ اگرچہ جوشِ بیان میں کہیں کہیں اشعار وزن سے گرے ہوتے ہیں۔ لیکن آسان گوئی اِس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

عمر جان ولی مدرس بدرسہ فیروز پور جھرکہ نے ایک سو باسٹھ اشعار کی مثنوی پڑھی۔

روزِ اول سے اِس مثنوی کی ابتدا کی ہے۔ نورِ یزداں نے نورِ دانش عیاں کیا۔ زمین و آسمان بنائے۔ جمادات و نباتات سے دنیا سجائی تاکہ اشرف المخلوقات کے کام آئے۔ انسان کو عقل و علم عطا کیا تاکہ دنیا میں امن و امان قائم ہو۔ عقل اگرچہ نظر نہیں آتی لیکن اِس کا نتیجہ یعنی امن ضرور نظر آتا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں جو اپنے وقت میں علم و حکمت کا خزینہ تھیں وہ امن ہی کا نتیجہ تھیں۔ جب علم کی مشیر عقل ہو تو بڑے عمدہ نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

غدر کا ہنگامہ فرو ہوا اب امن و امان ہے۔ انگریز اپنی عقل مندی اور سیاست سے ہندوستان کو ترقی دے رہے ہیں۔ علم و ہنر کی دولت عام ہے۔ لوگ اِس سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ تار برقی ریل وغیرہ ایسی کارآمد ایجادات ہیں کہ جس سے ہر خاص و عام بہرہ مند ہو رہا ہے۔ گھر بیٹھے لندن کا حال سن لو۔ دو پیسے میں جہاں چاہو خط بھیجو، خاص حفاظت کے لیے رجسٹریاں کی جاتی ہیں۔ علم و ہنر امن ہی کے زمانے میں ترقی کرتے ہیں۔ تجارت، زراعت، تعمیرات وغیرہ ترقی پر ہیں۔ سیاست دان امن و امان قائم رکھنے کے لیے نئی دفعات نافذ کر رہے ہیں۔ عدالتوں میں انصاف ہو رہا ہے۔ قصبوں کو اتنی ترقی دی گئی ہے کہ شہر کا دھوکا ہوتا ہے۔

اور اب السنہ شرقیہ کو نئی زندگی بخشی جا رہی ہے۔ گورمکھی، بھاشا، مرہٹی، اُردو، سنسکرت، فارسی، عربی، اور انگریزی کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ نئے مدرسے قائم ہو رہے ہیں جہاں طالب علم اسناد حاصل کر رہے ہیں۔ زمانہ بدل رہا ہے۔

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب قدیم شاعری ترک کی جا رہی ہے۔ عشق و عاشقی کے مبالغہ آمیز مضامین ختم کر کے اب شاعری نئی راہ پر گامزن ہے۔ جس میں ولی، آزاد اور حالی پیش پیش ہیں۔ آخر میں دعا مانگتے ہیں کہ جدید اُردو شاعری میں میرا نام بھی زندہ رہے۔

یہ مثنوی قابل تعریف ہے۔ مضامین کے لحاظ سے الفاظ منتخب کئے ہیں۔ خیالات اس قدر مربوط ہیں کہ نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ چوں کہ غالب کے شاگرد ہیں لہذا کہیں کہیں مشکل پسندی غالب آگئی ہے لیکن ذہن کو روکتی نہیں۔ مشاعرے کے مقصد کی پوری طرح پیروی کی ہے۔ امن کی برکات پر یہ مثنوی بڑی معنویت رکھتی ہے۔ انگریزی اسما بڑی خوبی سے نظم کئے ہیں۔

نمونہ کلام :

نہ سوز فراق اب نہ شور جنون
کہ شاعر کا دل مفت ہوتا تھا خون

نہ ذکر خط و خال و چشم سیاہ
کہ سامع کی ہوتی تھی حالت تباہ

نہ توصیف زلف و نہ گیسوؔ و مو
کہ کرتا تھا دل کو پراگندہ خو

نہ وصف رخ و عارض و قد و لب
کہ جوش ہوس کہ تھا سامان سب

سخن آج کل کب ہوش خیز ہے
رواں بخش ہے معنی خیز ہے

حقیقی ہر ایک چیز کا ہے بیاں
اِسی میں معانی کی خوبی عیاں

وہ شہر سخن میں نیا راستہ
دکاں جس میں اک ایک آراستہ

ولیؔ اور آزادؔ و حالیؔ یہاں
دکان دار بڑھ کے بھی اب ہیں وہاں

خدا یا مجھے بھی تو وہ نام دے
دکان جس سے شہر سخن میں چلے

مفتی امام بخش، رئیس بٹالہ نے فارسی میں انہتر اشعار کی ایک نظم فارسی میں پڑھی، اس کی ابتدا اس طرح کی ہے کہ خدا شکر ہے کہ میں امن کا زمانہ دیکھ رہا ہوں اور امن پر ہی نظم پڑھ رہا ہوں۔ ملکہ کے اس عہد میں

ایسا امن و امان قائم ہوا ہے کہ اِس سے پہلے نہ تھا۔ اِس مثنوی میں بھی، سفر، تجارت، ذریعہ معاش وغیرہ کا ذکر کیا ہے کہ امن کی وجہ سے ہر کام بخیر و خوبی ہو رہا ہے۔ ہر چیز بہ افراط موجود ہے۔ اگر امن ہو تو دشمن بھی دوست بن جاتے جس طرح شہنشاہ اکبر نے ملک میں امن و امان قائم کیا تھا اِسی طرح ملکہ انگلستان نے ہندوستان میں امن قائم کر دیا ہے۔ بادشاہ اگر امن کا خواہاں ہو تو عوام خوش رہتے ہیں۔ اب مدرسوں میں طالب علم تحصیل علم کر رہے ہیں۔ عدالتوں میں انصاف کیا جا رہا ہے۔ مزدور اپنی کمائی سے خوش ہیں۔ گھر میں رشتہ دار ایک دوسرے سے خوش ہیں۔ روشن ضمیر مطمئن ہیں اور دوسرے کے دل امن و امان سے منور کر رہے ہیں۔ انجمن کے مشاعروں میں لوگ اِس پر قطعہ و رباعی اور قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ یہ انجمن نہیں بلکہ عطار کی دوکان ہے۔ جس میں ایسے شاعر موجود ہیں کہ جس کا کلام خوشبو کی طرح عالم کو معطر کر دے گا۔ اِس انجمن کے سیکرٹری مولوی برکت علی خاں ہیں اور دوسرے سکریٹری بابو مترچندر ناتھ ہیں۔ اخبار انجمن پنجاب کے ایڈیٹر محمد لطیف ہیں اور منشی نظام الدین منشی ہیں۔ آخری اشعار میں سن تصنیف نظم کیا ہے:

سالش رہے قصیدہ باداں بہ پیش امن ۔۔۔ ہاتف بگفت ہجری اقدس ازاں بہ من

خط کشیدہ سے سن ہجری نکلتا ہے۔ ۱۲۹۱ھ

درگوش من ز سال مسیحی ندا سروش ۔۔۔ زو بابہا قصیدہ خوشتر بدان بہ

ھاتف بکف سال مسیحی. دگر بدل ۔۔۔ در انجمن قصیدہ مفتی بخواں بہ امن

۱۸۷۴ء

نمونہ کلام:

منت خدائے را کہ بینم زماں بہ امن ۔۔۔ بینم زماں بہ امن و بنا ئم بیاں بہ امن

بنگر بدشمناں کہ بدھر اند بے امان ۔۔۔ باشند در جہاں چو ہمہ دوستاں بامن

در مدرسہ گر امن بعلم ست و ہم معاش ۔۔۔ شاگرد درس یاب و مدرس دران بامن

بشنو تو المغرض کہ بجز امن بہ چہ است　　　　از جملہ نسانست مقدم نشان با امن

مصر رام داس رئیس لاہور نے اپنی مثنوی ترلیسٹھ (۶۳) اشعار پر مبنی فارسی میں پیش کی جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا مجھے ہمت دے کہ میں دنیا کا بیش بہا راز "امن" پر قصیدہ پیش کر سکوں۔ وہ کون سی چیز ہے جو فلاکت میں نعمت پیش کرتی ہے اس میں نہ تو بادشاہوں کا خوف ہوتا ہے نہ گناہوں پر شرمندگی۔ کون سی دوا ہے جو شہریاروں کے لیے راحت اور بیماروں کے لیے دوا ہے۔ بے شک حق پرستی کی توفیق، فراق دستی اور خوش حالی کا ضامن امن ہے۔ زندگی کا عیش، حسن و جوانی کا لطف، محبوب کا دیدار امن کے زمانے ہی میں لطف دیتا ہے۔ چاہے وہ کنج تنہائی ہو یا گوشۂ فقیری یا مسند امیری اگر امن نہیں ہے تو ہمیں یہ سب منظور نہیں۔ امن شہنشاہی کی ضمانت ہے۔ اگر امن نہ ہو تو ملک میں فتنہ و فساد برپا ہو جاتے۔ خدا کا شکر ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں امن و امان قائم کیا ہر شعبۂ زندگی امن کا ضامن ہے:

امن دوام خواہی باید بقول حافظ
با دوستاں مروت با دشمنان مدارا

اس کے بعد نوشیروان عادل کی ایک کہانی درج ہے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ اسی طرح انگریزی سرکار کے امن کا آفتاب بلند ہے اور وہ اس زمانے کے نوشیرواں عادل ہیں۔

نمونہ کلام:

خواہم رم نگاہے اے ہمدم خدارا　　　　از راز تازہ گویم تا شمہ شمارا
نے فکر قرض خواہے نے بیم بادشاہے　　　　نے خجلت از گناہ ہے اندیشہ نے جزارا
ہم حسن وہم جوانی باعیش زندگانی　　　　دیدار یار جانی دارد اگر وفارا
یا گوشۂ فقیری یا مسند امیری　　　　بے امن اگرچہ گیری منصور نیست مارا

انصاف چھٹا مشاعرہ[1]

چھٹا مشاعرہ ۱۴ر نومبر ۱۸۷۴ء کو انجمن ہال میں منعقد ہوا۔ اِس کا عنوان "انصاف" تھا آئندہ کے مشاعرے کے لیے عنوان "مروت" دیا گیا۔ اِس مشاعرے میں جو شعرا شریک تھے اُن کے اِسمائے گرامی یہ ہیں:

"مولوی فصیح الدین رنجؔ، مولوی محمد شریف (مہتمم اخبار "طلسم حیرت" مدراس)، مصر رام داس قابلؔ، منشی لچھمن داس برہمؔ میر انور حسین ھماؔ، منشی اصغر علی فقیرؔ، ملا گل محمد عالیؔ، منشی شیخ الٰہی بخش رفیقؔ، مفتی امام بخش (رئیس بٹالہ) مولوی محمد عطا اللہ خان عطاؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولوی محمد حسین آزادؔ اور پنڈت کرشن لال۔"

سب سے پہلے مولوی فصیح الدین صاحب رنجؔ نے انجمن پنجاب کے انعقاد کے سلسلے میں لیفٹیننٹ گورنر کے ایماء پر روائتی قصیدہ پیش کیا کہ آج مجھے گورنمنٹ کو فن شاعری کی نزاکتوں سے قائل کرنا ہے۔ بہت مدت کے بعد نظم کو عروج حاصل ہوا ہے۔ قدیم رنگ سخن بدل گیا اب اِس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اگر چند عرصے اور حکام کے جلسے اسی طرح منعقد ہوتے رہے تو لندن

---

[1] "ضمیمہ اخبار پنجاب" یعنی مشاعرہ انجمن پنجاب، لاہور: مطبع انجمن پنجاب، اکتوبر ۱۸۷۴ء، نمبرہ (رجسٹر نمبر ۱۵)

بھی لاہور کی اس انجمن پر رشک کرے گا۔ میرا فن اور تخیل اوج پر ہے۔ میں نئے انداز سے قصیدہ پیش کر رہا ہوں۔ صدر بو صاحب ڈپٹی کمشنر، میک لیگن مسٹر رینگ اور کرنل ھالرائیڈ سب ہی سخن شناس ہیں۔ میرے کلام کی نزاکتوں کو سمجھتے ہیں۔ لیکن فکر دین و دنیا مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ زندہ رہنے کی جد وجہد جاری ہے۔ اے رنج دنیا کے یہی لیل ونہار ہیں کبھی غم ہے اور کبھی خوشی۔

یہ قصیدہ پنتالیس (۴۵) اشعار پر مبنی ہے ذوق کے قصیدے کا ردیف قافیہ استعمال کیا ہے۔ ابتدائی انیس (۱۹) اشعار موسم بہار پر ہیں۔ منظر کشی پر بڑی محنت کی ہے۔ کلام میں روانی نہیں ہے۔ عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ قصیدے کی مناسبت سے نظم کئے ہیں۔ لیکن انجمن کے مشاعروں اور اس میں شرکت کرنے والے انگریز حکام کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ شاعری کے اِس نئے موڑ کی ضرورت کو سمجھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

نمونہ کلام:

دیا ہے رحمتِ باری نے ابر کو یہ فیض ۔۔۔ کہ بن گیا ہے گل تازہ شعلہ گل خن
چلا ہے ابر ہر ایک سمت سے لیے باگیں ۔۔۔ جہاں میں سرد ہواؤں کے گرم ہیں توسن
گھرا ہوا ہے جو ابر بہار صورت شام ۔۔۔ ہر ایک شاخ ہے گل کی فتیلہ روشن
گھٹا جو اودی سی با آب و تاب چھائی ہے
نگاہ کہتی ہے پھولی ہے چرخ پر سوسن

مشاعرے کا ہوا انعقاد با تہذیب ۔۔۔ خوشی سے پھول گئے اہل فن نحیف بدن
پرانی نظم کی صورت بدل گئی بالکل ۔۔۔ نئے جو رنگ کا پہنا ہے اِس نے پیراہن
نہیں ہے رنگ قدیمی کی شاعری محتاج ۔۔۔ خیال کو تو نہیں جستجوئے رنگ کہن

مولوی محمد شریف صاحب (مہتمم "طلسم حیرت"، مدراس) نے اسی (۸۰) اشعار پر مبنی ایک قصیدہ اور ایک نظم مشاعرے کے لیے بھیجی جو پڑھ کر سنائی گئی۔

ستائیس (۲۷) اشعار کا قصیدہ طرز جدید کے مشاعروں کی شان میں ہے کہ ہندوستان میں پھر بہار آئی ہے اور نسیم لاہور سے یہ خبر لائی ہے کہ وہاں امن و امان ہے پھول کھلے ہیں۔ ہند گلشن بنا ہوا ہے۔ خزاں رخصت ہوئی ہے، حاکماں وقت انصاف پسند ہیں۔ اور ہندوستان کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ انجمن پنجاب مشاعرے منعقد کر رہی ہے۔ میں ایسے موقع پر کس طرح خاموش رہ سکتا ہوں۔ انجمن پنجاب میں انصاف کا دور دورہ ہے۔ وہاں میرے دوست آزاد موجود ہیں میرے اشعار کی داد ضرور دی جاتے گی۔ افسوس کہ مدراس میں اِس قسم کے چرچے نہیں۔ دل بے اختیار چاہتا ہے کہ کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں۔

اِس کے بعد "انصاف" کو محبوب قرار دے کر مثنوی کہی ہے لیکن اِس میں انصاف کی اِس طرح تعریف کی ہے جس طرح گوشت پوست کے محبوب کی تعریف کی جاتی ہے۔ اِس کے چہرے، لب و رخسار، ناک، کان وغیرہ کی تعریف بڑے انوکھے اور عریاں الفاظ میں کی ہے۔ اور یہ کہ سلاطین اِس سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ درجہ اول کی دوا ہے۔ دشمن کا دشمن باطل کو ختم کرنے والا، عزت و اقبال اور حق پرستی کا جویا ہے۔ یہ رحمت بھی ہے قہر بھی۔ شاہ و گدا سب اسے محبوب رکھتے ہیں۔

محمد شریف صاحب اردو زبان سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ ان کے کلام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مشکل پسندی سے نالاں اور جدید خیالات کے حامی تھے لیکن جہاں تک اُن کی شاعری کے معیار کا تعلق ہے۔ وہ آسان گوئی کی کوشش میں تک بندی کر گئے ہیں۔ لیکن یہ اس زمانے کے لیے عیب نہیں بلکہ کوشش ہے اکثر اشعار وزن سے گرے ہوتے ہیں۔ عجیب و غریب استعارے اور تشبیہیں تراشی ہیں۔

نمونہ کلام :

پھولا ہوا ہے اب چمن ہند بے شمار ۔۔۔ کہتے ہیں سب کہ آئی ہے انصاف کی بہار
امن و امان کے چار طرف ہیں شگفتہ گل ۔۔۔ پنجاب کی نسیم سناتی ہے یہ بہار

ہر ایک کی بنی ہوئی باتیں ہیں صاف صاف — سنبل کو پیچ تک نہیں مل سکتے مستعار
ہے تو شاہد یہ دن ہے اِس میں — ہے پس اِک شاہد زیبا "انصاف"
ناک کیا بنع عزو شان ہے — عکس میں اس کے فروغ شان ہے
کان اِس کے ہیں یا کان گوھر — دل دریا و صدف جان گوہر
ہیں عجب روئے طرب ناک میں کان — کان میں ناک ہے اور ناک میں کان

بصر رام داس قابل نے فارسی میں پہلے چوبیس اشعار میں "انصاف" کے اوصاف بیان کئے ہیں کہ اگر ملک میں "انصاف" نہیں ہوگا تو حکومت قائم نہیں رہ سکتی جتنے بھی بڑے بڑے بادشاہ گزرے ہیں۔ جب انھوں نے عدالت میں انصاف سے کام نہیں لیا تو ان کی حکومتیں ختم ہوگئیں۔ اِس زمانے بھی ضرورت اِس بات کی ہے کہ حکام انصاف پرور ہوں اور ان لوگوں پر نظر رکھیں جو انصاف کے نام پر لوگوں پر ظلم روا رکھتے ہیں۔ انصاف ہے تو چوری ڈاکہ زنی، بدامنی وغیرہ ختم ہو جاتی ہے۔

پھر اٹھتر (۷۸) اشعار میں ایک مثنوی ہے۔ اِس مثنوی میں ایک ایسی کہانی نظم کی ہے جو نہایت عریاں اور فحاشی کے قریب ہے۔ یہ سکندر کے عہد کا ایک قصہ ہے۔ جس میں ایک بوڑھے مرد اور اس کی نوجوان بیوی کی داستان ہے۔ آخر میں دعائیہ اشعار ہیں۔

نمونہ کلام:

اول بہ احسان و کرم شکر الہٰی دم بدم — انصاف الطاف و نعم اوصاف عالم پروری
ابر و ہوا ماہ و ذکا در کار ہست ارض و سما — نان بدست آری تو تا دن رانہ بغفلت خوری
این ہا ہمہ گشتگاں از بہر تو فرماں بران — کے شرط انصاف ست آن گر تو نہ فرمائش بری
درگفتگوئے روبرو ہنگام باعث دو بدو — انصاف باید ہو بہو اصرار باشد خود سری

منشی لچھمن داس جوہر نے ستائیس (۲۷) اشعار کی ایک نظم پڑھی۔ سب سے پہلے انگریزی حکام کی تعریف کی ہے کہ ان کے عہد میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے

ہیں۔ پھر انصاف کی تعریف ہے کہ انصاف ہی کی وجہ سے رعایا حکمراں سے محبت کرتی ہے محنت کرنے والوں کو مزدوری دو، خلقت پر رحم کھاؤ۔ بچے، بڈھے، ہر جاندار یہاں تک کہ شاعر بھی انصاف کے طالب ہیں اسی لیے مشاعرے میں انصاف پر نظمیں پڑھ رہے ہیں۔ یہ نظم تین حصوں پر منقسم ہے پہلے انگریزوں کی تعریف مبالغہ کے ساتھ کی ہے دوسرے حصے میں انصاف سے متعلق قدیم کہانیاں نظم کی ہیں۔ تیسرے حصے میں نصیحت ہے۔ برہمؔ نے بھی شاعروں کے مقصد سے واقف ہو کر نئے خیالات، آسان زبان میں نظم کئے ہیں۔ فن شاعری کے لحاظ سے بہت سی خامیاں موجود ہیں۔ کیوں کہ سہل گوئی آسان نہیں۔ لیکن کہیں کہیں اچھے اشعار نکالے ہیں۔ اِن کی نظموں میں شاعرانہ چشمک موجود ہے۔

نمونۂ کلام:

نیکی سے کام لیں گے سب شاہ منصفوں کا ۔۔۔ پھر کون ذکر لاوے ہے نام ظالموں کو
انصاف سے تو غافل اے بے خبر نہ ہونا ۔۔۔ ہے سلطنت کو رونق اور امن اور امان کو
اِس سے ہی ملک گیری اور الفت رعیت ۔۔۔ مقدور اس قدر کب بے تیغ اور سنان کو

محنت کرے جو کوئی مزدوری اُس کو دیجئے
تا خود بھی کھاوے مفلس اور پالے خاندان کو

خلقت پہ رحم کر تو ان کو ستانہ ہرگز ۔۔۔ انصاف کا حکم ہے یوں شاہ اور خان کو

انور حسین ہماؔ نے اکیس (۲۱) بندوں کا خمسہ پڑھا۔ کوئی بند فارسی میں ہے اور کوئی اُردو میں پورے خمسہ کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہوں کی یہی تعریف ہے کہ وہ انصاف کرتے ہیں۔ اے قلم انصاف کی تعریف کر۔ خدا منصف ہے اور انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ انصاف سے دنیا میں امن وامان قائم ہوتا ہے۔ رعایا خوش ہوتی ہے۔ بادشاہ کتنا ہی ذی عقل کیوں نہ ہو اگر انصاف پسند نہیں بہت جلد اِس کی حکومت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اب سے پہلے پنجاب ظلم کا گھر بنا ہوا تھا۔ لیکن جب سے ملکہ وکٹوریہ کی حکومت قائم ہوئی پنجاب انصاف کا گھر بن گیا ہے اور انجمن میں

انصاف کے موضوع پر مشاعرہ ہو رہا ہے خدا ملکہ وکٹوریہ کو سلامت رکھے اور عدم تک اِن کی سلطنت برقرار رہے۔

اِس نظم میں استعاروں اور تشبیہوں سے انصاف کی وضاحت کی ہے اردو کے بند نہایت آسان زبان میں ہیں لیکن یہ آسان گوئی کہیں کہیں تک بندی ہو گئی ہے۔ لیکن بعض آسان اور رواں ہیں۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے ذریعہ جدید اردو شاعری کی تعریف کی گئی ہے۔

نمونہ کلام:

گرچہ ہے بادشاہ صاحب جاہ — بیشتہ خلق میں ہے ظل اللہ
راہ انصاف سے ہیں گم راہ — پھر بھی میں اِس کو کرتا ہوں آگاہ

در خور خسروان بود انصاف

مہر انصاف کش شدہ بسحاب — گشت ظلمت کدہ ہمہ پنجاب
بود از دست اھل ظلم خراب — افرو شد لال بیاد دریاب

در خور خسروان بود انصاف

سید اصغر علی لکھنوی حقیر نے ترانوے (۹۳) اشعار کی ایک مثنوی پڑھی قدیم روایت کے مطابق اِس کی ابتدا کی ہے:

کدھر ہے تو اے ساقی نیک خو
پلا دے مجھے ساغر مشک بو

انھوں نے طویل استعارے میں ایک خواب کا حال لکھا ہے کہ میں ایک ایسے شہر میں پہنچ گیا ہوں جو بہت خوب صورت ہے۔ آبادی بڑی گنجان ہے۔ ہوا اِس شہر کی معتدل ہے۔ شہر کی سڑکیں خوب صورت، دکانوں سے سجی ہوئی ہیں۔ دکان دار نہایت ایمان دار ہیں۔ پورا تولتے ہیں خریداری پر کوئی مول تول نہیں ہوتا۔ اِس شہر کے کنارے ایک باغ لگا ہوا ہے۔ جو پھولوں اور پھلوں سے لدا ہوا ہے یہاں شاعر پھولوں اور پھلوں کے نام بتاتے ہیں۔ جب وہاں کا بادشاہ اِس باغ کی سیر کو گیا تو سرو نے جھک کر اسے سلام کیا۔ بادشاہ کی سواری جس تزک و احتشام سے آتی ہے شاعر نے اِس کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ غرض بادشاہ بارہ دری تک

پہنچے اور وہاں جو تخت ان کے لیے بچھایا گیا تھا اس پر بیٹھ جاتے ہیں چوب دار نے آواز لگائی کہ فریادی آگے بڑھیں اور فریادیں پیش کریں ان سے پورا انصاف کیا جائے گا۔ یہاں شاعر نے بادشاہ کی زبان سے انصاف کرنے کا وعدہ بڑی تفصیل سے نظم کیا ہے۔ غرض فریادی بڑھے، فریادیں پیش کیں، ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا۔ اِس مثنوی میں محاوروں کا استعمال برمحل ہے۔ زبان نہایت رواں اور آسان ہے۔ اِس مثنوی سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمانے میں بے روزگاری بڑھی ہوئی تھی۔

نمونۂ کلام

ہوا خفتت جب بستر علم پر
تو کیا دیکھتا ہوں اٹھا کر نظر

عجب شہر اک جا پہ ہے پر بہار
کہ رہتی ہے خلقت جہاں بے شمار

بیاں کیا سواری کا ہو دھوم دھام
عجایئت سواری کا ہے اہتمام

لگا ہونے انصاف اِن سب کا واں
جو تھے دردمندوں میں پیر و جوان

غرض نوکری سے وہ سب شاد ہو
لگے کہنے شہ سے یہ باصد مراد

بڑھاتے خدا تیرے اقبال کو
ترقی سدا ہو تیرے حال کو

ملا گل محمد عالی نے ایک مسدس جو تیرہ بندوں پر مشتمل ہے۔ سنایا کہتے ہیں کہ ایسی طرز ایجاد ہوئی ہے جس میں غم دیا س کا روائتی انداز موجود نہیں میں نے بھی اِس نئی طرز میں مثنوی کہی ہے جس پر مجھے فخر ہے۔ پھر کہتے ہیں۔ کہ اے شاہ فرخ خصال! جہاں انصاف ہوتا ہے وہاں مظالم نہیں ہوتے عدل کے لیے امیر و غریب اور عوام سب برابر ہیں۔ حکام کو محکموں پر، ظالم کو مظلوموں پر، غم نصیبوں پر خوش نصیبوں کو فوقیت مت دے۔ تو انصاف سے کام لے گا تو عقبیٰ میں تیرا بھلا ہوگا۔ اور دنیا میں رعایا تجھ سے خوش رہے گی۔ ابر بہار کی طرح سب پر عنایت کر تا کہ تیرا نام بھی کسرای کی طرح مشہور ہو۔

یہ مسدس بڑی سہل اور رواں زبان میں نظم کیا گیا ہے۔ تشبیہوں اور

استعاروں سے حتی الامکان احتراز کیا ہے۔ اگرچہ مضامین کی تکرار بھلی نہیں معلوم ہوتی لیکن قدیم طرز سے ہٹ کر اس میں زبان اور ایسا بیان اختیار کیا ہے جو ان مشاعروں کا مقصد تھا۔

اِس مسدس کے بعد حالؔی نے ایک مثنوی سنائی جس کی کہانی کچھ اِس طرح ہے کہ ایک پاک باز لڑکی کو ایک سپاہی نے بے آبرو کیا۔ وہ شخص بادشاہ کے پاس فریاد لے کر پہنچا۔ بادشاہ نے خود اِس شخص کے گھر جاکر اندھیرے میں مجرم کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد سپاہی سے کہا کہ مجھے جلدی سے کچھ کھانے کو دے۔۔۔ اِس کے پاس سوکھی روٹی کا ٹکڑا تھا۔ جس کو بادشاہ نے اندھیرے ہی میں بڑی رغبت سے کھایا۔ پھر کہا کہ شمع لاؤ۔ جب روشنی ہوئی تو دیکھا کہ وہ سپاہی کے بھیس میں شہزادہ تھا۔ کھانا کھانے کا یہ سبب تھا کہ بادشاہ نے عہد کیا تھا۔ کہ جب تک انصاف نہیں کروں گا کھانا نہیں کھاؤں گا۔

یہ مثنوی بھی بڑی سادہ زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسا موثر انداز اختیار کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مشاعروں کے مقصد کے مطابق یہ مثنوی نہایت کامیاب ہے۔ اگرچہ بعض اشعار وزن سے گر گئے ہیں لیکن سادگی اور روانی اور تاثر جو بہت کم ان مثنویوں میں تھا جو مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں، اس مثنوی کی رُوح ہے۔

نمونۂ کلام:

طرح ہے نئی خوب مرغوب ہے ۔۔۔ دلوں کو وہ جان جیسی محبوب ہے
سخن اِس میں کرتا ہے سحرالبیان ۔۔۔ پکڑ ہاتھ میں خانۂ دو زبان
یہ لالہ ہے میرے گلستان کا ۔۔۔ یہ ہے پھول میرے خیابان کا
کیا فرزند و دل بند کو ۔۔۔ تیرے واسطے اپنے فرزند کو
کیا عہد تھا میں نے یہ استوار ۔۔۔ کہ ہرگز نہ کھاؤں گا لیل و نہار
نہ ہو داد درویش کا جب تلک ۔۔۔ نہ کھاؤں نہ سوؤں گا جب تلک

شیخ الٰہی بخش رفیق نے ایک طویل نظم پڑھی۔ ساٹھ (۶۰) اشعار کا ایک قطعہ انصاف کے متعلق ہے۔ اِس کے بعد بانوے (۹۲) اشعار میں چار کہانیاں نظم کی ہیں۔

حمد سے مثنوی کی ابتدا کی ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ آب و آتش باد و خاک سے اِس نے انسان کو تخلیق کیا۔ اگرچہ انسان فانی ہے لیکن اسے علم و دانش عطا کی دل بادشاہ ہے۔ اور یہ دونوں صفات اس کی وزیر ہیں۔ کتابِ عقل نے نئے قانون نئے مطالب اور نئے مضامین وضع کئے ہیں۔ لیکن انسان کی فلاح و بہبود کے لیے جو بھی آسمانی صحیفہ نازل ہوا اِس میں انصاف کی تلقین کی گئی ہے۔ اگر شاہان سلف کے کارنامے قدیم کتابوں سے پڑھے جائیں تو ان میں بھی یہی تحریر ہے کہ جن لوگوں نے انصاف کیا ان کے نام غیر فانی ہیں۔ انصاف پر ہی حکومت کا دار و مدار ہے۔

اِس کے بعد بانوے (۹۲) اشعار میں چار بادشاہوں کی کہانیاں درج ہیں کہ انصاف کے سامنے انھوں نے اپنے رشتہ داروں، عزیزوں اور حکام کو بھی نہیں بخشا۔ وہ خدا سے ڈرتے تھے اور انصاف کرتے تھے لیکن اب ملک سخن میں فتور آگیا ہے۔ نکتہ چین مغرور ہوگئے ہیں۔ یہ شعر کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے۔ فن کا شعور نہیں لیکن باتیں بہت بناتے ہیں۔ اب حکام محفل میں رونق افروز ہیں۔ اگر ہمت ہے تو سخنوری کا دعویٰ کریں یہاں انصاف ہوگا۔

رفیق صاف کی مثنوی قدیم داستانوں کا پشتارہ ہے۔ ہم عصروں پر چشمک ہے۔ انصاف کی تعریف ہے۔ اور انصاف کرنے کی التجا ہے۔ شاعری کے اعتبار تگ بندی ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ پچھلے مشاعروں میں جو مشکل پسندی عام تھی۔ اب وہ ختم ہوتی جارہی ہے۔ شاعری تگ بندی ہی سہی لیکن آسان اور عام فہم انداز اختیار کیا جارہا ہے۔ اور یہ جدید انداز کے قائل ہوتے جارہے

ہیں مشکل پسندوں پر پھبتیاں کستے ہیں۔ یہی جذبہ اور فہم جدید اردو شاعری کی بنیاد بنا۔

نمونۂ کلام :

ہر لحظہ اس میں ہو رہا دربار عام ہے
سلطان دل کا خوب مگر انتظام ہے

جاری کتاب عقل کے قانون ہیں یہاں
مطلب نئے ہیں اور نئے مضمون ہیں یہاں

دانش دوات فکر کی یہاں روشنائی ہے
اور ہیں قلم خیال کے کاغذ صفائی ہے

اقتباس از حکایت :

اک پیر زال واں کی نہایت کریم تھی
اس جھونپڑے میں وہ مع دختر مقیم تھی

رحمت پڑی نظر خوش اس کا جی ہوا
اور جا کے پیر زال سے یوں ملتجی ہوا

تو حکم دے تو رات بسر کر لوں لیٹ کے
چل دوں گا اپنا صبح کو بستر لپیٹ کے

اس پیر زن نے عین عنایت کی راہ سے
شفقت سے دیکھا اور کہا بادشاہ سے

گھوڑے کی باگ رہ نہ سکا تھام کر یہاں
بیٹا یہ تیرا گھر ہے تو آرام کر یہاں

مفتی امام بخش (رئیس بٹالہ) نے فارسی میں ایک سو پچیس (۱۲۵) اشعار کی مثنوی سنائی۔ ابتداء حمد سے کی ہے۔ پھر انصاف کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد گلستان سے نوشیرواں کا قصہ نظم کیا ہے۔ قصے کے بعد نظامی گنجوی کی نظم پر تضمین لکھی ہے۔ اس کے بعد حکومت برطانیہ گورنروں اور حکام اور خاص طور پر گورنر پنجاب کی توصیف کی ہے۔ اس طویل نظم کے آخر میں عدل جہانگیر سے متعلق ایک واقعہ نظم کیا ہے۔ آخر میں انجمن پنجاب کی تعریف کی ہے۔

نمونۂ کلام :

بگو حمد خلاق انصاف را
بگو بعد زان وصف انصاف را

بہر جا کہ انصاف باشد عیاں
بملک و ملک در جہاں خوش بدال

مولوی عطاء اللہ عطاؔ نے ۱۵ بندوں پر مشتمل ایک مثنوی پڑھی حسب دستور ابتدا حمد سے کی ہے۔ اس کے بعد تثلیث پر اعتراضات نظم کئے ہیں کہ مخلوق کو خدا کا بیٹا (نعوذ باللہ) بتانا باطل ہے۔ اب مسلمان عقلی قوانین پر مائل ہیں۔ لیکن عالم یہ

ہے کہ مسلمان اسلام سے اور عیسائی انجیل سے منحرف ہو گئے ہیں۔ کہنے کو تو یہاں انصاف قائم کیا جارہا ہے لیکن مدعی کا گھر تو چوری لوٹ کرے ہی جلتے ہیں لیکن عدالت اور کچہریوں کے چکروں میں مدعی خود بھی تھک کر ختم ہو جاتا ہے۔ وکیلوں نے دلالی کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔

شاعروں کا یہ حال ہے کہ اخبار والے ان کا خاکہ اڑاتے ہیں۔ گورنمنٹ نے پنشن دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن جب نوکری ہی نہیں ملتی تو پنشن کیا ملے گی۔ پھر اہل حکومت سے انصاف کی درخواست کی ہے اور انصاف کے فوائد نظم کئے ہیں۔

یہ مثنوی انجمن کے مشاعروں کی عام مثنویوں میں سے ایک ہے لیکن اس کی خصوصیت سیاسی بصیرت ہے۔ عطاؔ نے بڑی صفائی سے حکومت وقت پر نکتہ چینی کی ہے۔ زبان و بیان نہایت سہل اور دل نشین، استعارے برمحل استعمال کئے ہیں۔ کلام میں روانی ہے۔ تکنیک کے لحاظ سے یہ مثنوی یا مسمط کام یاب کوشش ہے۔ اِس سے ہمت افزائی کا احساس پیدا ہوتا ہے اِس مشاعرے میں پہلی مرتبہ کسی شاعر نے مسلمانوں کو انجیل پڑھانے کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

نمونۂ کلام :

خدا ہے خالق یکتا وہ ہے معبود لی ہمتا ۔۔۔ بنایا بے پدر مادر اسی نے آدم و حوا
بنایا سارا ہی عالم وہ عالم سے ہے بے پروا ۔۔۔ نہیں شایان بنا دے اپنی مخلوقات کو بیٹا

معاذ اللہ در حق سے یہ سب باتیں ہیں لا طائل
ہم ہیں انصاف کے قائل ہم ہیں انصاف کے مائل
ہم ہیں انصاف کے طالب ہم ہیں انصاف کے سائل

حالی کی مثنوی مناظرہ رحم و انصاف ایک سو انیس اشعار کی ہے۔ اِس کی ابتدا یوں کی ہے :

ایک دن رحم نے انصاف سے جاکر پوچھا کیا سبب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا
نیک نامی سے ترے سخت تحیر ہے ہمیں ہاں سنیں ہم بھی کہ ہے کون سی خوبی تجھ میں

اس کے بعد کہتے ہیں کہ اپنے بے گانے سب تیری نظروں میں ایک ہیں۔ سینکڑوں تیری وجہ سے سولی پر چڑھ گئے۔ فرعون اور راون تیری وجہ سے غارت ہو گئے۔ قید خانوں میں تیری وجہ سے قیدی پڑے ہیں۔ تیرے فتووں سے سرتن سے جدا ہو گئے نہ تجھے چھوٹوں سے شفقت ہے۔ نہ بڑوں کا ادب۔ تیری محفل میں شاہ و گدا سب کانپتے ہیں نہ تو غلام اور آزاد کا خیال کرتا ہے اور نہ دوست دشمن کا قوم و ملت تیرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تو نے باپ کے ہاتھوں بیٹے کا گلا کٹوا دیا۔ اس پر تجھے دعویٰ ہے کہ تیری وجہ سے دنیا میں امن قائم ہے لیکن ایک میں ہوں کہ :

رحم ہے نام مرا لطف ہے کام مرا فیض ویرانہ و آباد میں ہے عام مرا
میری سرکار میں ہو جاتے ہیں سب عذر قبول میرے دربار سے جاتے نہیں مجرم بھی ملول

میرے دل میں ہر ایک کا درد موجود ہے۔ چاہے وہ کسی مذہب و ملت کا ہو۔ پندرہ اشعار میں رحم اپنی خصوصیات بیان کرتا ہے۔ انصاف نے جب یہ ولولہ انگیز تقریر سنی تو کہا کہ تمہاری نیکیاں کہیں تمہیں برباد نہ کر دیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مروت بڑی چیز ہے۔ لیکن مروت کو جس نے عام کیا ہے اس نے اس کو رسوا کر دیا۔ چور اُچکے قزاق ڈاکو سب تیری پناہ میں آجائیں تو ملک برباد ہو جائے۔ ایک رہزن کو رہا کروا کے تو ڈاکے ڈلواتا ہے۔ باپ سے کو بیٹے کو بے ادب کروا دیتا ہے اُستاد شاگردوں کو سرزنش نہیں کر سکتے۔ دراصل اے رحم جس میرے جوہر کو تو عیب بتاتا ہے وہی میری خوبی ہے۔ راست بازی میری عادت ہے۔ میں نے ویرانوں کو آباد کیا۔ اخباروں کو آزاد کیا۔ میری وجہ سے جمہوری سلطنتیں اور کونسلیں بنیں۔ میں نے غلامی اور شخصی حکومت کو ختم کر دیا۔ میں سزاوار کو سزا دلواتا ہوں اور گناہ کی کشش کو ڈبو دیتا ہوں۔ مشرق سے مغرب تک میرا ہی حکم چلتا ہے وہاں تعصب

اور عداوت کا گذر نہیں میری وجہ سے آزادی کا حکم جاری ہے۔ نہ میں رعیت و بادشاہ کا خیال کرتا ہوں نہ عدالت اور فریادی سے میرے حکم کے سامنے استاد اور شاگرد، جاہل اور عالم، نوکر و آقا تمام برابر ہیں اور ان میں ایمان پیدا ہوتا ہے۔

ابھی یہ بحث جاری تھی کہ عقل آ پہنچی اُس نے دونوں کی باتیں سنیں اور سنجیدگی سے جواب دیا تم دونوں میں ایک سے ایک بہتر ہے۔ اے رحم اگر انصاف نہ ہو تو تو بے روح ہے اور اے عدل اگر رحم نہ ہو تو تو بے نور ہے۔ رحم کا کام یہ ہے کہ فریادی کی فریاد سنے اور عدل کا کام ہے کہ بے رحم کو سزا دے:

نہ رہی باقی فریقین کو جائے انکار — چار و ناچار کیا یک جہتی کا قرار
بڑھ کے پھر دونوں ملے ایسے کہ گویا تھے ایک — مل کے ہو جائیں کہیں جیسے کہ دو دریا ایک

مناظرہ رحم و انصاف میں حالی نے مکالمے کی تکنیک سے کام لیا ہے۔ اِس میں رحم نے اپنی برتری ثابت کی ہے اور انصاف نے اپنی بڑائی جتائی ہے۔ اِس جھگڑے میں عقل نے صحیح راستہ دکھایا ہے اور ان دونوں پر یہ حقیقت، واضح کی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔ شاعری کے لیے یہ موضوع بظاہر کوئی اچھا موضوع نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ حالی کی اس نظم میں اِس دور کی دوسری نظموں کے مقابلے میں خشکی زیادہ ہے لیکن اِس میں جو اصلاحی رنگ و آہنگ اور جمالیاتی اظہار کی جو نئی تکنیک ہے وہ قابل قدر ہے۔ سنجیدہ طبعی کی وجہ سے حالی کی شاعری ان اسقام سے پاک ہو گئی ہے جو عام طور پر اردو شاعری کا لازمی جز بن گئے تھے۔

مولانا حالی کے بعد پنڈت کرشن لال صاحب طالب نے ایک مثنوی ۴۴ (چوالیس) اشعار پر مبنی" موسوم بہ محک انصاف" پڑھی۔ یہ مثنوی اگرچہ مختصر ہے لیکن بڑی بامعنی شاعر نے انصاف سے متعلق بڑے عمدہ نکات نکالے ہیں یہ مثنوی شاعرانہ اسقام سے پاک ہے پاکیزہ استعارے اور تشبیہیں دی ہیں۔ کلام

میں روانی ہے۔ انداز دل نشین قدیم روایت اِس میں بھی موجود ہے لیکن خیالات نئے ہیں۔ یہ مثنوی جدید اُردو شاعری میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ بعض اشعار غیر معیاری ہیں۔

اقتباس :

نیک کردار جو رکھتے ہیں شعارِ انصاف — نام پاتا ہے وطن ان کا دیارِ انصاف
آنکھ پہ عارضی ہوتے ہیں تصاویر کے نقش — دل پہ جمتے ہیں مگر نقش و نگارِ انصاف

فیضِ انصاف سے ہر دل میں ہے پھولا گلزار
ہاں مگر ظلم ہے اک سینہ فگارِ انصاف

رہزنی کا ہے نہ اندیشہ نہ کچھ چور کا ڈر — ہے یہ بے خوف و خطر راہ گذرِ انصاف
جن کے روشن ہیں ضمیر ان کی کدورت بھی بھلی — کم نہیں کحل جواہر سے غبارِ انصاف

حملہ کر کر کے غنیموں کے بھی دل ٹوٹتے ہیں
استوار ایسا ہے عالم میں حصارِ انصاف

فرقِ نیت میں جو آوے تو ہے ایمان میں فرق — نیت خوش بین سے [illegible]
نورِ انصاف اگر عام کرے اپنا فروغ — روزِ روشن سے ہو روشن شبِ تارِ انصاف

نکتہ چیں بھی چمن دھر میں بے وجہ نہیں
گل انصاف کے ہیں ساتھ یہ خارِ انصاف

...............+...........

"مروت" ساتواں مشاعرہ[1]

"مروت" کے عنوان سے ۱۹ دسمبر ۱۸۷۴ء کو انجمن ہال میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ آئندہ جلسے کے لیے "قناعت" عنوان مقرر ہوا۔

اس مشاعرے میں مندرجہ ذیل شعرا نے شرکت کی:

۱۔ مولوی گل محمد عالیؔ مدرس پھلور، ضلع جالندھر،
۲۔ مولوی سلطان علاء الدین محمد،
۳۔ مولوی محمد شریف (مہتمم اخبار طلسم حیرت، مدراس)
۴۔ منشی لچھمن داس برہمؔ،
۵۔ مصر رام داس قابلؔ،
۶۔ محمد حیات صاحب فیضؔ
۷۔ مولوی عطاء اللہ صاحب، عطاؔ،
۸۔ شیخ الٰہی بخش رفیقؔ،
۹۔ میر منور حسین ہماؔ،
۱۰۔ مفتی امام بخش رئیسؔ،
۱۱۔ سید اصغر علی صاحب حقیرؔ،
۱۲۔ مولوی عمر جان ولی (مدرس مدرسہ فیروز پور جھرکہ)،
۱۳۔ پنڈت کرشن لال طالبؔ،

---

[1] "ضمیمہ اخبار پنجاب، یعنی مشاعرہ انجمن پنجاب"، لاہور: مطبع انجمن پریس، ماہان نومبر، دسمبر، ۱۸۷۴ء، نمبر ۷،

۱۴ مولوی محمد حسین آزادؔ، اور

۱۵ مولوی محمد سعید صاحب (مدرس مدرسہ عربی)

سب سے پہلے گل محمد صاحب عالیؔ نے ایک مثنوی سنائی جس کی ابتدا ایک قطعہ سے کی ہے۔ نو اشعار کا یہ قطعہ "مروت" کی تعریف میں ہے۔ اس کے بعد اکیاون (۵۱) اور اکتالیس (۴۱) اشعار میں شاہنامہ فردوسی سے دو کہانیاں نظم کی ہیں ایک حاتم طائی اور دوسری بہرام گور کی جو "مروت" اور سخاوت میں مشہور ہیں۔

کہانیاں قدیم اور روایتی ہیں۔ بحر قدیم ہے لیکن زبان نہایت آسان اور عام فہم ہے۔ تشبیہیں اور استعارے عام فہم ہیں۔ اب شعرا میں آسان سے آسان زبان میں ادائے مطلب کی ضرورت کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ آسان گوئی کی کوشش میں اکثر اشعار وزن میں نہیں۔

نمونۂ کلام :

"مروت" دل و جان سے کر اختیار	جہاں میں "مروت" سے ہو نامدار
"مروت" کا خواہاں ہو باخاص و عام	"مروت" کرے مرد کو نیک نام
"مروت" جہاں میں گرامی کرے	دلوں میں چو حال بجھ کو شاہی کرے

ہرن کے شکار سے متعلق کہانی سے اقتباس :

وہ آہو لگا بھاگنے سو بسو	تعاقب کا مائل تھا وہ نام جو
پیاسا وہ آہو جو بے تاب تھا	قبیعہ کے خیمہ میں داخل ہوا
قبیعہ کے خیمہ میں بہرام گور	تعاقب میں آکر لگا کرنے شور
قبیعہ نے اس کو دیا یہ جواب	کہ اے مالک زین و اسپ سوار
"مروت" نہیں ہے کہ یہ جانور	پناہ جو کہ لایا ہے اس خیمہ پر
مرے رو برو ہو وہ تیرا شکار	نہیں ایسا ہوئے گا جا اے سوار

مولوی علاالدین محمد صاحب قریشی لاہوری نے "مروت" سے متعلق بائیس (۲۲) اشعار کا قطعہ پڑھا۔ پورا قطعہ تشبیہوں اور استعاروں سے مرصع ہے جن کے

ذریعہ اہل "مروت" کے مرتبوں کو واضح کیا ہے۔ اور "مروت" کی تعریف کی ہے۔ اس نظم میں شاعرانہ حسن تو موجود ہے۔ لیکن شاعر نے آسان گوئی سے زیادہ اپنی قابلیت کا اظہار کیا ہے۔ عربی و فارسی الفاظ کی بہتات ہے۔ کہیں مبالغہ غلو کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ اکثر اشعار وزن سے گرے ہوتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

واہ واہ کیا تازہ تر باغ "مروت" کی ہوا گلشن و گل زار ہے اور بھی ہے صبا
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا باد بہار کر دیا انتظار عالم کو فزا فرحت فزا
کیلہے وہ "مروت" اور فتوت باثمر جس سے نخل زندگی قائم رہے ہے دادما

نام کو تعریف میں اشیائے تلخی مٹ گئی
یہ تو شیریں میوۂ گل زار عالم بن گیا

چاہیئے واقف نہ ہو دوران اس کے بھید سے ہے نتیجہ اس کا خلق ارض سما
اور زباں خامہ ہی لکھتاہے اس کے وصف کو ہوتاہے وہ درج کتاب اور یہی تصویر کا

اس کو سورج میں کہوں یا خود ہی خورشید زماں
جس سے عالم کا گلستان نور ہے اس نور کا

مولوی محمد شریف (مہتمم اخبار "طلسم حیرت"، مدراس) کی مثنوی پڑھ کر سنائی گئی۔ یہ روایتی مثنوی کے ڈھانچے پر منظوم کی گئی ہے۔ پہلے حمد، نعت، پھر پنجتن پاک کی تعریف ہے اس کے بعد فلک کج رفتار کی شکایت کہ مدراس جیسی جگہ میں رہنے پہ مجبور ہوں لیکن میں بے مہری فلک کو برباد کر کے چین لوں گا۔ اور اردو زبان کی خدمت کرتا رہوں گا۔ یہ مضمون بتیس اشعار میں نظم کیا ہے۔ اس کے بعد چار اشعار کی غزل ہے۔ پھر پچاس اشعار کا ایک قطعہ ہے جس میں "مروت" کو محبوب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اردو زبان کے ان شعرا میں محمد شریف صاحب کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے (ALLEGARY) سے اردو نظم کو روشناس کرایا اور "مروت" کو محبوب کی شکل دے کر اس کے اعضا سے ہر انسانی

صفت کو منسوب کیا ہے۔ اگرچہ اس کوشش میں بعض اشعار مضحکہ خیز ہو گئے ہیں اور کہیں عریانیت کے قریب پہنچ گئے ہیں لیکن یہ ان کی ابتدائی کوشش ہے۔ یہ تخئیل انھوں نے انگریزی سے لیا ہے۔ گویا قدیم پیمانے میں جدید خیالات کو پیش کیا ہے۔ ان کی یہ کوشش قابل قدر ہے۔

کہتے ہیں کہ حکام، ملازم پیر و جوان، زاہد درند، عاشق و معشوق، عالم باعمل اور جاہل سب کے سر "مروت" کے سامنے جھکے ہوتے ہیں۔ افسوس کہ مدراس میں شریفوں کی قدر دانی نہیں لیکن یہی "مروت" پنجاب کے حاکموں کی ہم زاد ہے۔ انجمن میں ہر صاحب بزم ذی سخن موجود ہے۔ میرے کلام کی قدر ہو گی۔

یہ طویل نظم مرصع ہے۔ نازک خیالی اور خیال آفرینی کے اعتبار سے سے قدیم رنگ جھلکتا ہے۔ جدید خیالات کو بڑے سلیقے اور ذہانت سے قدیم رنگ میں سمویا ہے۔ سراپا بیان کرتے ہوئے عریانیت کی طرف بہک گئے لیکن فوراً اپنی اس لغزش کا اعتراف کیا ہے گارسان دتاسی نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔

نمونۂ کلام:

خامہ بڑھاتے کیوں نہ پایا | منہہ میں "مروت" کا نام آیا
حقا کہ یہ شان بے نشان ہے | بندوں پہ خدا بھی مہربان ہے
دریا میں صدف، صدف میں در ہے | گوہر میں برنگ آب پر ہے
سب کا عمل ہے دو جہاں میں | لیکن یہ نہیں آسمان میں
ہے وجہ بھی کہ وہ زبوں ہے | پایہ ہے بلند سرنگوں ہے
بولوں کہ "مروت" اور کہاں ہے | بیگم یہ شہ جہاں بجا ہے
یہ حاکمہ جہاں ہے محکم | بہو بہال کی جاننا نہ بیگم
جو دو فضل و عطا ہے اس میں | مہر و لطف و حیا ہے اس میں

منشی لچھمی داس برہم نے پہلے "مروت" کی شان میں دس اشعار پڑھے اِس کے بعد مشہور و معروف کہانی جو شیر اور چوہے کی دوستی سے متعلق ہے نظم کی ہے یہ اٹھارہ اشعار میں ہے۔

برہم نے "مروت" کی تعریف میں استعاروں سے کام لیا ہے لیکن اِس سے اِن کا ابتدائی کلام مغلق ہوگیا ہے۔ البتہ شیر اور چوہے کی کہانی بڑے دل چسپ پیرائے میں نظم کی ہے۔ اِس کی زبان بھی سلیس اور رواں ہے۔ لیکن بعض اشعار بے وزن ہیں۔

جب شیر کے پنجے کے نیچے چوہا دب گیا تو اس نے کہا۔

نمونہ کلام:

موش گھبرا کے پکارا شاہا عاجز ہوں میں — پاؤں جلدی سے اٹھاؤ کہ ہیچ یہ احقر
ہوں اگرچہ کتنا ہی ناچیز بہت بے ساماں — لیک پہنچے گا شہا تجھ کو "مروت" کا ثمر
شیر خنداں ہوا بولا کہ کیا بکتا ہے — مجھ سے ناچیز سے امید ہی کیا سود و ضرر

لیکن اِس جا سے قدم شیر اٹھا چل نکلا
موش پھر شکر بجالایا رہائی پاکر

مصر رام داس قابل جو فارسی اور عربی کے عالم تھے "انھوں" نے پہلے "مروت" کی شان میں فارسی میں قصیدہ پیش کیا۔ اس کے بعد دو کہانیاں کرمان کے بادشاہ اور حاتم طائی کی فارسی ہی میں سنائی آخر میں انگریز حکام سے درخواست کی ہے کہ وہ بھی اِسی طرح "مروت" سے کام لیں تاکہ ان کا نام بھی شاہانِ سلف کی طرح لافانی ہو جائے۔ یہ دونوں کہانیاں ۷۰، ستر اشعار پر مبنی ہیں۔

نمونہ کلام:

اگر آرامِ جاں خواہی نکو نام از جہاں خواہی — بہشتِ جاوداں خواہی "مروت" کن دریں دنیا
چو ہستی در خفا بودی "مروت" در کجا بودی — بذات انبیاء بودے کہ بخشید ند ہر جا نہا
عدو یار جان سازد شمارا مہربان سازد — عزیز دو جہان سازد مدارات "و مروت" را

چو باشد مردم مردم بہ نور مردی بینا — نکونامی نگردد گم بگردد تا مہ و انجم

محمد حیات صاحب فیضؔ نے ۱۹ اشعار کا ایک قصیدہ "مروت" کی شان میں پڑھا۔ "مروت" کی ضرورت اور اس کے عمدہ نتائج نظم کئے ہیں۔ تشبیہیں، استعارے اور صنعتیں قدیم ہیں۔ لیکن آسان گوئی پر مائل ہیں۔ زبان رواں سلیس ہے۔

نمونہ کلام:

ہے زشک رہ سرو یہ رفتار "مروت" — رکھتا ہے سدا دل میں خلش خار "مروت"
بلبل نے کہا کھول کے منقار "مروت" — سرسبز سدا رکھتا ہے گل زار "مروت"
مخمور مے بخل سے رہتے ہیں بخیلاں — بدمست نہیں ہوتے ہیں سرشار "مروت"
کیوں کر نہ ہوں میں فخر سلاطین زمانہ — بخشی ہے ہما نے مجھے دستار "مروت"

مولوی عطا اللہ عطاؔ نے بیالیس اشعار کا ایک مستزاد پیش کیا۔ اس مستزاد کا مقصد یہ ہے کہ اس مشاعرے میں جو آج مروت کا ذکر ہو رہا ہے تو یہ نیک فال ہے۔ اس نئی روش اور جدید انداز کی بدولت ہندوستان میں انقلاب برپا ہوگا۔ پنجاب کی اس انجمن اور انتظام کی تعریف کی ہے اور بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں۔ انگریز حکام نے ہندوستان میں جو اصلاحات نافذ کی ہیں ان سے علم اور عمل کی ترقی کو منسوب کیا ہے۔

عطاؔ نے اس مستزاد میں انگریزی کے الفاظ بڑی بے تکلفی سے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً ڈگری، ریل، کار، گورنمنٹ وغیرہ۔ زبان سلیس اور رواں ہے لیکن کہیں کہیں عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ کھٹکتے ہیں۔

نمونہ کلام:

ہے آج مشاعرے میں تو نذر کار "مروت" — اور ذکر "مروت"
ہونے کو نمودار ہیں آثار "مروت" — ہے خوب بشارت
ہے ہاتھ میں یہ کس کے سخاوت کا ترازو — احسان کا میزان
موزوں نکلتے ہیں اب اشعار "مروت" — از جوش "مروت"

اب شیخ الٰہی بخش صاحب رفیق کی باری آئی۔ انھوں نے ایک سو سات (۱۰۷) اشعار کی مثنوی پیش کی۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ دوستوں کی بے مہری اور فلک کی کج رفتاری کی وجہ سے میں گوشہ نشین ہو گیا تھا کہ ناامیدی کے عالم میں ایک آواز آئی کہ اِس مصیبت کے زمانے میں تمہاری مدد کرنے کے لیے پیر خود آگیا۔ میں نے اس سے زمانے کی ناقدر شناسی کی شکایت کی اس نے کہا کہ میرے ساتھ چل میں تجھے "مروت" کا عالم پاک دکھاتا ہوں۔ ہم آگے بڑھے اور امید نے سہارا دیا اور ایک ایسی جگہ پہنچادیا جہاں نہایت حسین باغ لگا ہوا تھا۔ وہاں ایک بڑی اور عالی شان عمارت دیکھی اِس میں ایک مزار بنا ہوا تھا۔ میں نے بڑی عقیدت سے فاتحہ پڑھی تو دیکھا کہ قبر کے سرھانے الفت کھڑی رو رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ حاتم کی تربت ہے۔ پھر شاہ "مروت" آئے اور انھوں نے بتایا کہ یہ روضہ اِن ہی نے تعمیر کیا اور خود بھی یہیں دفن ہوئے کیوں کہ رہزنوں کے ایک گروہ نے انھیں مار ڈالا تھا۔ اب میں یہاں کا مجاور ہوں۔

اِس کے بعد شاعر نے عدم "مروت" کی خرابیاں بیان کی ہیں کہ کوئی کسی کا ہمدرد نہیں البتہ پنجاب میں جو حکومت قائم ہوئی ہے وہاں "مروت" کی شان باقی ہے۔ انجمن پنجاب قائم کی گئی ہے اور بہت سی اصلاحات جاری کی گئی ہیں مدرسے کھولے گئے ہیں زراعت کو ترقی دی گئی ہے اب سرزمین پنجاب جنت کا نمونہ بن گئی ہے۔

اِس مثنوی کی بندش چست نہیں ہے مرکبات قدیم ہیں۔ قدیم و جدید خیالات کا تصادم نظر آتا ہے۔ شاعر قدما کی ستائش کرتے ہیں۔ اور نئے خیالات اور نئے رجحانات کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ زبان و بیان قدیم اور روایتی ہے۔ انداز بیان سہل ہے مشکل الفاظ کم ہیں۔ آخر میں نصیحت ہے بہت سے اشعار وزن میں نہیں۔

نمونۂ کلام:

تھی طبیعت کو ہوا دھر کی ناساز آئی — کہ یکایک یہ میرے کان میں آواز آئی
یار و غم خوار ترا پیر خرد آپہنچا — اور کرنے کو مصیبت میں مدد آپہنچا

دیکھا جب پیر خرد نے مجھے رنجور بہت — بے وفائی کے کئے دھر کے مذکور بہت
آج کل کوئی بجز بغض و حسد کام نہیں — اور "مروت" کا زمانے میں رہا نام نہیں
قوم شوق کو جوں جوں تھے بڑھاتے جاتے — اک طلسمات تھے ہم کو نظر آتے جاتے

تھیں ہر اک سمت کو نہریں کئی جاری اس کا
جن سے قدرت کی — اک سبز تھی کیاری اس جا

سبزۂ خلد بریں یا اتر آیا تھا وہاں — مخمل سبز کا اک فرش بچھایا تھا وہاں
سرد جھونکا ہوا کا کبھی آجاتا تھا — خود بخود دیکھ کے دل سبزے کو لہراتا تھا

میر انور حسین ہمآ نے بیس بند کا ایک مسدس پڑھا جس کے نو بند فارسی میں ہیں۔ یہ مسدس دراصل "مروت" کے پردے میں ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ ہے جس میں ان کی حکومت کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ کہ ان کے انتظام حکومت ہی کی وجہ سے ہندوستان میں امن و امان ہے اور لوگ ان کی "مروت" کی وجہ سے باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس مثنوی میں شاعر اصل مقصد سے دور جا پڑے ہیں۔ عرب و عجم کے بادشاہوں کی مثالیں قدیم انداز میں ہیں۔ دور از کار استعارے مہمل تشبیہیں، عربی و فارسی الفاظ۔ بے محل استعمال کئے ہیں۔

نمونۂ کلام :

حاتم تو فقط اپنی ہی تھا قوم کا سردار — نہ صاحب اقلیم و خزائن تھا نہ زردار
وکٹوریہ ہے فخر سلاطین و خوش اطوار — یہ بحر وہ قطرہ نہیں کچھ اس میں ہے تکرار

حاتم کو "مروت" سے سدا کام رہا ہے
اس واسطے گردوں کے تلے نام رہا ہے

لاریب ہے وہ ملک "مروت" میں شہنشاہ — حامی ہے یسوع اس کا مددگار ہے اللہ
اور مامن مخلوق سدا اس کے ہے درگاہ — لکھتا ہوں اگر خود ہے وہ بات سے آگاہ
حاتم کو "مروت" سے سدا کام رہا ہے — اس واسطے گردوں کے تلے نام رہا ہے

مفتی امام بخش (رئیس بٹالہ) نے ۱۰۹ (ایک سو نو) اشعار کی نظم فارسی میں سنائی۔

سب سے پہلے مروت کی تعریف کی ہے کہ دشمن بھی اس کی وجہ سے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ مفتی صاحب نے اس نظم میں تین کہانیاں بیان کی ہیں۔ دو گلستان سعدی سے اور ایک ہمایوں اور نظام الدین سقے کی۔ اس کے بعد ڈائریکٹر تعلیمات کرنل ہالرائیڈ، فنانشل کمشنر لیفٹیننٹ گورنر، گورنر، چیف کورٹ کے حکام، کلکتہ کی کونسل کے ممبر، وزیر اعظم، ولی عہد اور ملکہ وکٹوریہ کی تعریف و توصیف کی ہے۔ کہ ہماری سرکار عقل میں افلاطون کی طرح دانشور ہے۔ اسی کی وجہ سے ملک میں مدرسے قائم ہوئے اور لاہور میں انجمن پنجاب قائم ہوئی۔ یہاں مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ سب لوگ مشاعروں کا کلام سنتے ہیں اور شاعر بہتر سے بہتر کلام پیش کرتا ہے۔ آخر میں سنِ تصنیف نظم کیا ہے۔

یہ فارسی کی نظم بھی قصیدے سے مماثلت رکھتی ہے۔ "مروت" سے زیادہ انگریز حکام کی تعریف کی ہے۔ کلام میں روانی نہیں کیوں کہ یہ ابتدائی کوششیں تھیں پرانے استعارے اور تشبیہیں ہیں البتہ حکومت برطانیہ کی تعریف میں نئے مرکبات بنانے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اکثر اشعار بے وزن ہیں۔

نمونۂ کلام:

معنی اکنوں مختصر کن ماجرا	بہر دین صاحب بہا در کن دعا
تاکہ باشد انجمن ہا در جہاں	افسران انجمن خوش بہ آواز آں
چوں بہ تربیت از "مروت" مثنوی ست	وصف این اہل "مروت" را نوشت
بازی آیم برنگ اختتام	ایں زماں من میکنم تم السلام
بہ بو زیبا "مروت" مثنوی	گفت ہاتف سن ایں نظم نوی
بس ہمایوں کو خجستہ مثنوی ۱۲۹۱ھ	زوند زد حشم بسال عیسوی

سید علی اصغر حقیر نے بیس (۲۰) بندوں پر مشتمل ایک مخمس پڑھا۔ ابتدا

مروت" کی تعریف سے کی ہے لکھتے ہیں" مروت" کا بیان کر رہا ہوں۔ خدا نے مجھے ایسی لیاقت بخشی ہے کہ میرے ساتھ شاعر بھی" مروت" سے کام لیتے ہیں۔ جو پارسا ہیں وہی "مروت" کی قدر کر سکتے ہیں۔ مروت سے بڑھ کر اور کوئی شے اتنی کار آمد نہیں کہ آدمی کو انسان بنا سکے۔ اِس کی شیرینی کی کوئی انتہا نہیں جس قوم نے مروت کو اپنایا وہ قوم سر بلند ہوئی۔ اب جب کہ اِس سلطنت میں" مروت" عام ہوئی ہے تو ہم بامراد ہوئے۔

شاعر نے تشبیہوں، الفاظ کی تراکیب، محاوروں اور استعاروں سے "مروت" کی ہر ہر طرح تعریف کی ہے۔ زبان آسان ہے۔ چوں کہ ابتدائی کوششیں ہیں۔ لہٰذا کوئی معیار قائم نہیں کیا جا سکتا البتہ ردیف و قافیہ میں عربی، فارسی کے مشکل اور غیر مانوس الفاظ باندھے ہیں۔

نمونۂ کلام:

ہمیشہ رہا مدح خوان" مروت" — سدا ڈھونڈتا تھا نشان" مروت"
ملا جس گھڑی کاروان" مروت" — نظر آ گئی مجھ کو شانِ" مروت"
تصدق ہو آئین بجان" مروت"

مروت کے ہیں کل بہم چار حرف — جو دو ہیں یہیں یہ پھر تو دو ہیں لیسا ہ
نہیں صرف ہے بیچ میں زینہار — عیاں اِس سے ہوتا ہے یہ حال زار
نہیں جان باقی بیان" مروت"

عمر جان ولی (مدرس فیروز پور جھرکہ) کی مثنوی ۱۰۴ (ایک سو چار) اشعار پر مشتمل ہے۔

اِس مثنوی کا مطلب کچھ یوں ہے کہ" مروت" عفت کے گھرانے کی زینت ہے۔ یہ گھرانہ دنیا میں بہت مشہور ہے۔" مروت" کی ماں سخاوت، خالہ حیا، ماموں رفیق اور کرم اور ایثار اس کے دو بھائی ہیں۔ عفو اِس کا جسر دواں بھائی ہے۔ بہادری اس کی سگی بہن ہے۔ یہ لڑکی یونہی پورے گھرانے کی لاڈلی ہے۔ شجاعت

کی لخت جگر ہے۔ عدالت جسے لوگ خدا ترسی یعنی شفقت کے نام سے پکارتے ہیں۔ "مروت" کی بائے بن کی سہیلی ہے ایسے پاک باز گھرانے کی لڑکی میں جو صفات ہیں وہ انسان کا دل موہ لیتے ہیں:

مروت کا دل انسان گھر ہے ہر ایک اک عفو اس کا رہ گزر ہے
دل صافی میں یہ کیا رہ ہوئے مستور چھپے فانوس میں کب شعلہ طور
خلیل اللہ کی گاہے ہم زباں یہ خضر کی ہم قدم ہے یاد دان یہ
کبھی ہمدست موسےٰ کی ہے یہ کبھی ہم نغمۂ داؤد بھی یہ
کبھی حیشم کنہیا میں رہی یہ رہے بکرم کے سینے کبھی یہ
مسیحا کی کبھی یہ ہم نفس تھی علیلوں کی بڑی فریاد رس تھی
فقیروں کی اسی سے دل نوازی
سقیموں کی اِسی سے چارہ سازی

اِس کے بعد رام اور لچھمن کی کہانی نظم کی ہے کہ ہنومان نے لشکر جرار کے ساتھ اِن دونوں بھائیوں کی مدد کے لیے تیار کیا:

فریدون رام تھے راون تھا ضحاک ہنوتا کیوں وہ ان کے سامنے خاک
جتایا اِن کو راون کو ہرایا بنایا تھا جو کام اچھا بنایا

پھر سکندر اور پورس کی جنگ اور ان کے مکالمے نظم کئے ہیں:

بتا اے پور کیا خواہش ہے تجھ کو کہا جو شہ کو شہ سے آرزو ہو
"مروت" کو یہ سن کر رحم آیا وہ سارا ملک اس کو اس کا بخشا

حاتم کو گرفتار کرنے پر جو انعام مقرر کیا گیا تھا اور ایک بوڑھے اور بڑھیا نے بڑی حسرت سے کہا تھا کہ کاش" حاتم ہمیں مل جاتا تو ہم انعام پاتے یہ کہانی بھی نظم کی ہے۔ اسی طرح حاتم کے زمانے میں جب قحط پڑا تو حاتم نے اپنا عزیز ترین گھوڑا ذبح کر کے بھوکوں کو کھانا کھلایا۔ ڈاکٹر ہملٹن اور فرخ سیر کا قصہ بھی درج ہے کہ ڈاکٹر ہملٹن نے بجائے اپنے ذاتی مفاد کے پوری قوم

کے تاجروں کا محصول معاف کروایا۔

عمر جان کی اِس مثنوی میں بڑی روانی ہے۔ بہت آسان زبان استعمال کی ہے۔ اِس مثنوی کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اِن مشاعروں کے مقصد کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ فارسی تلمیحات کے ساتھ ہندی دیو مالائی کہانیاں پہلی مرتبہ ان مشاعروں میں سنائی گئیں۔ رام کو فریدوں اور راون کو ضحاک سے تشبیہہ بالکل نئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ فارسی کی نقلید یعنی شیریں و فرہاد اور رستم و سہراب کے ساتھ ساتھ ہندی مشاہیر کے ذکر کر کے شاعری کے اِس جدید موڑ سے پوری واقفیت رکھتے تھے اور سمجھ چکے تھے کہ شاعری میں انقلاب عظیم برپا ہونے والا ہے۔

پنڈت کرشن لال صاحب نے مثنوی "کمل مروت" سنائی۔ اِس کے پچاس اشعار ہیں۔ اِس نظم میں "مروت" کی روائتی تعریف ہے کہ یہ غم گسار ہے دشمنوں سے بچاتی ہے۔ خوشبو کی طرح دل میں بس جاتی ہے۔ پھر تمام اخلاقی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے جو انسان کو خوار کرتی ہیں۔ شاعر کہتے ہیں کہ اِن سب کا علاج "مروت" ہے۔

اِس نظم میں روانی نہیں ہے۔ الفاظ غیر مرتب، اشعار کی بندش ڈھیلی لیکن فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ سے پرہیز کیا ہے۔ زبان آسان ہے اور "مروت" کی ضرورت کا پورا احساس موجود ہے۔

اِس نظم میں شاعرانہ چشمک کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور خوشامدیوں کے لیے "چمچے" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ محاورہ اس زمانے میں بھی عام تھا۔

نمونۂ کلام:

نہ کیوں کر ہر ایک بشر جہاں میں اسے عزیز و قریب سمجھے
دکھائی ہے صبح رخ پہ گویا بہار رنگ شفق "مروت"

اگرچہ ہیں ڈھنگ اشارتوں کے ارادے لیکن ہیں شرارتوں کے
کریں وہ جب دل شگاف باتیں تو کیوں نہ ہو سینہ شق "مروت"
جو ہیں گے چمچہ قلی اکابر کبھی وہ ہوتے نہیں ہیں شاکر
مجھے خطر ہے کہ ہو کے برہم الٹ نہ دے دے طبق "مروت"

اب مولانا آزاد نے اپنی مثنوی "وداع انصاف" سنائی۔ اِس مثنوی کے ۱۱۹ اشعار ہیں۔ اس مثنوی کی کہانی یہ ہے کہ :

جب تارے ڈوبنے لگے شبنم نے موتی برسائے۔ شاخیں انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھیں۔ اذان کی آواز سن کر میں ہوا خوری کے لیے باہر نکلا۔ میں اپنے تصور میں اِس قدر گم ہو گیا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ اسی عالم تصور میں میں ایک میدان میں جا نکلا سامنے شہر تھا اور قریب ہی دریائے رواں بہہ رہی تھی۔ اِس میدان میں ایک درخت کے نیچے میں نے ایک بادشاہ کو بیٹھے دیکھا جو غیظ و غضب کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اِس کے سامنے کچھ لوگ کھڑے رو رہے تھے اور کچھ اس کے قدموں پر جھکے ہوتے تھے۔ بادشاہ نے تاج سر سے اُتار ڈالا تھا اور کمر سے تلوار بھی کھول کر ڈال دی تھی۔ میں نے جب صورت حال دریافت کی تو ایک بزرگ میرے قریب آتے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ شاہ "مروت" ہیں۔ دنیا کی بے مروتی دیکھ کر اپنا ملک چھوڑ دیا ہے تاکہ رعیت ان کے بغیر خود ہی اپنے کیے کی سزا بھگتے۔ اور یہ گوشہ عزلت میں زندگی گزار دیں۔ اِس صورتِ حال سے ہر شخص پریشان تھا۔ جو لوگ وہاں تھے ان میں نیک و بد سب شریک تھے۔ میں چپ چاپ کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ کہ بادشاہ "مروت" نے شاہی نشان ہاتھ میں لیا اور انتہائی غصے میں لوگوں سے مخاطب ہوا کہ مجھے خدا نے اس دنیا میں اس لیے بھیجا کہ "مروت" کے قانون کے تحت دنیا کا نظم و نسق درست ہو۔ سب میں اتحاد ہو اور خدا ان کی مدد کرے۔

لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں کے لوگ جو صاحب اقتدار ہیں وہ خود آرا

اور مطلبی ہو گئے ہیں اہلِ دنیا کو تکلیف دینا نیکی گردانتے ہیں۔ کسی کو کامیاب نہیں دیکھ سکتے۔ افسوس اِس بات کا ہے کہ لوگوں نے میری قدر نہ کی اور اب یہ خود اپنے اعمال کے سزا بھگتیں گے۔

دفعتاً دو آدمی نہایت شرمندہ سر جھکائے ہوئے آئے۔ ان میں ایک بوڑھا شخص تھا جو سب کا غم خوار تھا۔ برف کی طرح سفید لوگوں کے غم دیکھ کر پگھلا جاتا تھا۔ یہ رحم تھا۔ دوسرا شخص سخاوت تھا جس کے ہاتھ میں روپیوں کے توڑے تھے لیکن ان میں سے اکثر خالی تھے۔ اِن دونوں نے بھی بادشاہ کے ساتھ ہی ملک چھوڑ دیا تھا۔

اِن دونوں بزرگوں نے بادشاہ سے بصد ادب کہا کہ بے شک بہت سے لوگوں میں وفا کا نام تک نہیں۔ یہ انسانوں پر یقین رکھتے ہیں اور بغاوت کے لیے تیار ہیں۔ مصلحت وقت یہی ہے جو آپ نے کہا ہے لیکن اب بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آپ کی قدر کرتے ہیں۔ آپ اپنی احکام جاری کریں تاکہ ہم تعمیل حکم کریں اور آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔

یہ بات سن کر بادشاہ آبدیدہ ہوا اور کچھ تامل کے بعد کہا کہ اگرچہ میرا دل نہیں چاہتا لیکن مجھے ان لوگوں کی خوشی منظور ہے۔ بامروت لوگوں کو حاضر کیا جائے۔ شہرت نے فوراً منادی کر دی اور ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگ جوق در جوق جماعتیں بنا بنا کر آنے لگے۔ ان میں سب سے پہلے حاتم طائی آیا اور اِس دھوم دھام سے کہ دولت سیم و زر اڑاتی تھی۔ شہرت دوامی اِس کے ساتھ تھی پوری خلقت کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد جو لوگ آئے دولت و حشمت ان کے ساتھ تھی۔ سر پر ہما کا سایہ اور چتر شاہی تھا۔ اعزاز دوامی کے نشان اور علم ان کے جلو میں تھے۔ ان کے نام تا حشر زندہ رہیں گے۔ ان کے چہروں سے نور ٹپک رہا تھا۔ نہایت وضع دار لیکن لباس سب کے مختلف تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ اقلیم عدالت کے سلاطین ہیں۔

آزاد کی یہ مثنوی بڑی معنی خیز ہے۔ اگرچہ شاعری کے اعتبار سے اِس مثنوی میں وہ معیار باقی نہیں جو معیار مثنوی موسوم بہ "شب قدر" اور "صبح امید" کا ہے۔ استعارے انتہائی طویل ہیں۔ اشعار میں وہ روانی نہیں جو ابتدا میں تھی۔ زبان حسب توقع سہل ہے۔ لیکن اِس مثنوی کو معنی خیز بنانے کی کوشش میں آزاد نے نہایت ذو معنی آسان الفاظ میں اِس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی وجہ سے یہ عنوانی مشاعرے ختم ہونے والے تھے۔

نمونۂ کلام :

جب طور دم صبح شب تار نے بدلا — اور رنگ چمن میں گل و گل زار کا بدلا
شبنم نے گر فرش کئے خاک کے اوپر — اور تارے لگے ڈوبنے افلاک کے اوپر
چلنے کو بہم آنکھ لگے مارنے سارے — اور چاند پہ جانوں کو لگے وارنے سارے
جب شہر کے میدان سے ہم دور تر آئے — اور سامنے راوی کے کنارے نظر آئے
بیدار ہوا سن کے موذن کی اذان کو — آزاد جو تھا صرف سخن کر رہا جان کو
پر دل کا خلش[1] تھا سو مٹایا نہ کسی نے — اِس پردۂ حیرت کو اٹھایا نہ کسی نے

شاہ مروت کا بیان :

اب اس نے جو دیکھا کہ ہے رنگ اور یہاں کا
ایمان ٹھکانے نہ رہا اھل جہاں کا
دنیا میں ہے بگڑی ہوئی اک ایک کی نیت
اور خوار ہوئی بلا سے فزون نیک کی نیت
اِس واسطے سب جاہ و حشم چھوڑ کے اپنا
اور سلطنت خلق سے منہ موڑ کے اپنا

---

[1] آزاد نے "خلش" کو اپنے شعر میں مذکر باندھا ہے، حالاں کہ اسی زمانے میں "خلش" کو مونث بھی کہا اور لکھا جانے لگا تھا

ہے چھوڑتا سب مملکت و مال کو اِن کے
تا آن کہ سزا سونپ کے اعمال کو ان کے

خود گوشۂ عزلت میں گزارا کرے اپنا
سر خاک پہ اک اک یہاں مارا کرے اپنا

پریاں تو ہیں سب بادۂ نخوت پئے بیٹھے
دعوے ہیں خدائی کے بغل میں لیے بیٹھے

گزری ہوئی گردوں سے ہے گردن کشی ان کی
اور اِس پہ وہ خود رائی و خود مطلبی ان کی

نیکی یہ سمجھتے ہیں خلائق کی بدی کو
اور دیکھ نہیں سکتے زمانے میں کسی کو

افسوس کہ مرتبہ مرا جانا نہ کسی نے
اور میں نے جو سمجھایا وہ مانا نہ کسی نے

لیکن جو زمانے میں یہی کام ہیں ان کے
خود دیکھیں گے اک دن جو کچھ انجام ہیں ان کے

........×........

قناعت آٹھواں مشاعرہ[1]

سب سے پہلے ڈاکٹر لچھمن داس برہم نے ۲۶ (چھبیس) اشعار کی نظم پڑھی اِس نظم کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں (چودہ) ۱۴ اشعار ہیں اور دوسرے حصے میں بارہ۔ اِس نظم کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص چاہے وہ عالم ہو یا جاھل یہ جانتا ہے کہ "قناعت" کے بے شمار فائدے ہیں۔ اِس دنیا میں جس نے قناعت کی وہ آسودہ حال رہا۔ اگر قناعت ہے تو عزت و آبرو بھی ہے جو قانع ہوتا ہے۔ وہ دل کا غنی ہوتا ہے۔ اگر تیرا مقصد پورا نہ ہو تو قناعت اختیار کر دنیا کے دانشوروں کا یہی دستور رہا ہے۔ تو حتی المقدور کوشش کرتا رہ اور اِس کا نتیجہ خدا پر چھوڑ۔ تو یقیناً کام یاب ہوگا۔

خدا نے تجھے جو مرتبہ اور جتنی عزت و دولت دی ہے اِس پر قناعت کر جو شخص قناعت کرتا ہے تو اس کے دل میں حرص پیدا نہیں ہوتی۔ اگر تو دولت مند ہے اور قانع نہیں ہے تو پھر تجھ میں اور مفلس میں کوئی فرق نہیں۔

شاعر نے قناعت کی اہمیت، اس کی ضرورت اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ اکثر و بیشتر اشعار وزن میں نہیں۔ بہر حال آسان الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔

---

[1] "ضمیمہ اخبار پنجاب، یعنی انجمن پنجاب کے مشاعرے"۔ لاہور: انجمن پنجاب پریس، بابت ماہ جنوری، ۱۸۷۵ء، نمبر ۷،

نمونۂ کلام

قانع ہو دل اگر تو تیری آبرو رہے ... ورنہ ہو بے قدر تو یہاں خوار در بدر
محتاج وہ نہیں جو قناعت شعار ہے ... پر دل کا وہ غنی ہے نہوے جو سیم و زر
مساعی ہو کوششوں سے یہاں رات دن کوئی ... اور نخل آرزو کا رہے، پھر بھی بے ثمر

ہو جاوے آخرش کو وہ محروم ہر طرح
جز یاس اس کو آئے نہ کچھ چار سو نظر

تب دل سے وہ کرے جو قناعت کو کر قبول ... فضل خدا سے جلد وہ ہو جاوے بہرور

....

منعم اگر تجھے بھی یہی حرص و طمع ہو ... مفلس مدام تو ہے قناعت اگر نہیں
اس کے چمن کو سدا سدا ہی بہار ہے ... واقف نہیں خزاں سے کوئی شاخ اور شجر

ملا گل محمد عالیؔ نے آٹھ اشعار پہلے قناعت کی تعریف میں سنائے اس کے بعد دو حکایتیں چوالیس (۴۴) اور بتیس (۳۲) اشعار کی سنائیں۔ ابتدائی اشعار کا مطلب کچھ یوں ہے کہ جو شخص قناعت کرتا ہے۔ وہ بے نیاز ہو جاتا ہے اور دارین میں سعادت حاصل ہوتی ہے۔ خدا قناعت کرنے والے سے خوش رہتا ہے۔ جسے قناعت کی مسرت میسر ہے۔ وہ مفلسی کے غم سے دور رہتا ہے۔

اِس کے بعد حاتم کی ایک کہانی نظم کی ہے۔ یہ کہانی کیا ہے دراصل حاتم اور ایک حریص کا طویل مکالمہ ہے۔ جس میں قناعت اور حرص کی تعریف اور خرابیاں بیان کی ہیں۔ آخر میں حاتم حریص کو قائل کر دیتا ہے کہ جتنا رزق، رزاق دیتا ہے اِس پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ ہر شخص کو روزی بہم پہنچاتا ہے یہاں تک کہ ماں کے پیٹ میں بچے کا پیٹ بھی بھرتا ہے۔

دوسری حکایت بھی حاتم کی ہے کہ ایک شخص نے حاتم کو اپنے گھر مدعو کیا حاتم نے تین شرائط پر اس کی دعوت قبول کی کہ جہاں میں چاہوں گا وہیں بیٹھوں گا۔ اور اپنی مرضی سے کھانا کھاؤں گا۔ اور تیسری شرط اس وقت بتاؤں

گا۔ جب تیرے گھر آؤں گا۔ اِس نوجوان شخص نے حاتم کے علاوہ اور لوگوں کو بھی مدعو کیا۔ جب حاتم نوجوان کے گھر پہنچا تو دسترخوان کی صف میں سب سے آخر میں بیٹھا میزبان نے احتجاج کیا تو حاتم نے اِس کی شرط یاد دلائی وہ خاموش ہو گیا۔ جب کھانا شروع ہوا تو حاتم نے اپنی آستین سے جو کی روٹی نکالی اور خدا کا شکر کر کے اسے بڑی رغبت سے کھانے لگا نوجوان نے پھر شکوہ کیا لیکن وہ دوسری شرط یاد کر کے اور حاتم کے قائل کرنے سے خاموش ہو گیا کھانے کے بعد حاتم نے تین گرم تپتے ہوئے آگ پر سرخ کئے ہوئے توے منگوائے انھیں برابر رکھوایا اور اطمینان سے ان پر قدم رکھتا ہوا گزر گیا اور کہا کہ جو لوگ قناعت کرتے ہیں انھیں کبھی کسی قسم کا گزند نہیں پہنچتا۔

دونوں کہانیاں فرسودہ ہیں لیکن حتی الامکان آسان زبان میں کہانیاں نظم کی ہیں۔ پہلی کہانی کی ابتدا فارسی کے شعر سے کی ہے۔ اشعار کا کوئی معیار نہیں لیکن قناعت کی تعریف استعاروں اور تشبیہوں کے ذریعہ کی ہے۔ اشعار میں توازن برقرار رکھنے کے لیے بے کار الفاظ بھی استعمال کئے ہیں لیکن اِس میں شک نہیں کہ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ کوشش قابل قدر ہے۔

نمونۂ کلام :

قناعت کا جاں سے تو خواہاں ہو — ترا دل نہ یارا پریشان ہو
قناعت کی عشرت سے جو شاد ہو — وہ زنداں عسرت سے آزاد ہو
کہا اس نے حاتم سے دے تو نشاں — ترا رزق آتا ہے از آسمان
کہا اس نے روزی تو سن لے فنا — فلک سے زمیں پر ہے دیتا خدا
سماسے سب ہی کو ہے روزی عطا — کہ آیا ہے قرآن میں فی السماء
یہ سن کر وہ تائب پشیمان ہوا — نصیحت کا حاتم سے خواہان ہوا
کہا اس کو حاتم نے اے ارجمند — طمع کو نہ ہرگز کبھی کر پسند
قناعت دل و جان سے کر اختیار — قناعت کا طالب ہو لیل و نہار

اب مولوی علاء الدین صافی نے اکیس اشعار کی ایک نظم سنائی۔ "قناعت"

کی تعریف میں کہتے ہیں۔ کہ جو لوگ قناعت کرتے ہیں انھیں کوئی غم نہیں ہوتا۔ حج کرنے کے لیے جو احرام باندھا جاتا ہے درحقیقت وہ جامۂ قناعت ہے۔ اسلام میں فاتح کی بڑی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔

اِس نظم کے بیشتر اشعار وزن میں نہیں۔ عجیب و غریب تشبیہات ہیں لیکن یہ کوشش کہ آسان سے آسان تر زبان میں نظم لکھی جائے پوری کی ہے۔ یہ نظم اِس لیے قابل قدر ہے کہ موزوں طبع نہ ہونے کے باوجود انھوں نے مشاعرے کے لیے نظم لکھی ہے۔

نمونۂ کلام:

مانند کباب آگ پہ کیوں کر نہ جلیں وے — جو سوز دلی سے کریں آرام "قناعت"
اِس کاسہ فلک میں نہ رہے نام کو ذرا آب — گر کھینچے اگر تشنۂ لب جام "قناعت"
یہ چشم گرو رکھ کے اگر کفر لیا مول — منکر نہ ہوئے جو کر دیدۂ اسلام "قناعت"

یہ ملک قناعت کہ ہے توشۂ فقیراں
شاھاں بھی پسند کرتے ہیں ہم نام "قناعت"

لالہ تارا چند متخلص بہ تارا حلوائی ہیں۔ حلوہ سوہن بناتے ہیں۔ لیکن موزوں طبیعت رکھتے۔ انھوں نے پچیس (۲۵) اشعار مبنی "قناعت" پر نظم سنائی۔ پچھلے مشاعروں میں یہ شریک نہیں تھے۔ شعر کہنے کی خدا داد صلاحیت بدرجۂ اُتم موجود ہے۔ "قناعت" کی تعریف بڑے دل کش پیرائے میں کی ہے نہ کوئی داستان نہ مبالغہ انھوں نے اپنی سادہ طبیعت کا بڑی سادگی سے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار کیاہے اِن مشاعروں کی دل چسپی اور کام یابی کا سب سے بڑا ثبوت خود تارا چند حلوائی ہیں۔ اردو شاعری کے اِس جدید موڑ کے پیش نظر اس نظم میں غضب کی روانی ہے۔

نمونۂ کلام:

مےِ عشق میں کیوں نہ سرشار ہوں میں — ہے گل رنگ ذوقِ نگار "قناعت"
نہ کیوں خیند آئے مجھے میٹھی میٹھی — ہے آرام کی جا کنار "قناعت"

قناعت خوش آئی ہمارے بنی کو | دو بالا نہ کیوں ہو وقار قناعت
صبا خاک میری نہ برباد کرنا | جہاں میں ہوں خاکسار "قناعت"
جلو میں ہے عزو حشم جاہ و نصرت | چلے آتے ہیں شہسوار "قناعت"
فزوں کیوں نہ ہو اشک کی آبرو پھر | ہے اِس چشم میں جوتے بار "قناعت"

"قناعت" کا دیکھا نہیں روتے زیبا
مگر ہوں میں امیدوار "قناعت"

سب اہلِ قناعت بہم ایک جا ہیں | نظر آگئی لو قطار "قناعت"
رہا طوطیا ہو کے چشم فلک میں | اڑا جب زمیں سے غبار "قناعت"
پھنسا ہوں میں حلوہ سوہن بیچنے میں | دگر نہ دکھاؤں بہار "قناعت"
میں داخل ہوا آج اِس انجمن میں | کھینچی میرے دل پہ حصار "قناعت"

لالہ دین دیال عاجزؔ، طالب علم ہیں گورنمنٹ کالج لاہور کے۔ انھوں نے سینتیس (۳۷) اشعار پر مبنی ایک مثنوی پڑھی۔ جس کا مطلب کچھ اس طرح ہے:

"کل رات جیسے ہی میری آنکھ لگی خواب میں دولت بیدار آئی۔ اِس کے ساتھ بہت سے مونس و غم خوار تھے۔ میں نے اس کے سامنے سر جھکایا تو اس نے بڑی محبت سے کہا کہ آؤ تمہیں طلسمات جہاں کی سیر کرائیں۔ میں حیران تھا کہ شکل و شبہات سے تو یہ پری نظر آرہی ہے۔ مگر یہ ہے کون؟ میں نے بڑی جرات سے ایک شخص سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ "قناعت" کی پری ہے۔ سب لوگ شہزادی کے ساتھ ایک باغ میں پہنچے جہاں ایک حوض پانی سے بھرا تھا اور اس کے کنارے ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ اِس تخت پر شہزادی جلوہ افروز ہوئی۔ شہزادی نے مجھ سے پوچھا کہ تم کچھ سمجھے بھی؟ میں نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا تو اس نے بتایا

کہ یہ باغ "قناعت" ہے جہاں ہمیشہ بہار رہتی ہے۔ یہاں وہ لوگ رہتے ہیں جو رضائے حق پر راضی ہیں جو لوگ حریص ہیں یہاں ان کا نام ونشان بھی نہ پاؤ گے۔ اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔"

یہ مثنوی ایک طالب علم کی ہے اِس لیے قابل قدر ہے۔ اگرچہ وہی قدیم انداز میں طویل استعارے میں "قناعت" کی تعریف کی ہے۔ لیکن بڑی سادہ اور سہل زبان میں قصہ نظم کیا ہے۔ بڑے خلوص اور سادگی سے "قناعت" کی تعریف کی ہے اِن اشعار میں ثقیل الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے۔ زبان کی صفائی اور سادگی نے نظم کو دل کش بنا دیا ہے۔ چند اشعار وزن میں نہیں لیکن مشاعروں کے مقصد سے با خبر ہیں۔

نمونۂ کلام:

خواب میں دولتِ بیدار سرھانے آئی
بخت خفتہ کو میرے گویا جگانے آئی

نظر لطف سے اِس نے مجھے ممتاز کیا
اور بصد لطف زباں سے یہ وہیں فرمایا

آؤ عاجز تمہیں ہم سیر جہاں کی کروائیں
جو طلسمات اِس جگہ وہ سارے دکھلائیں

میں کہ گردش سے سارے زمانے کی بہ تنگ آیا تھا
اور نہ کچھ غم کے سوا آج تلک پایا تھا

اے ناداں قناعت کی یہ شہزادی ہے
اور دنیا کے لیے باعث آزادی ہے

یہ نہ ہوے تو جہاں حرص کے پھندے میں پھنسے
اور قیامت تلک اِس قید میں پھرناک گھسے

گل و غنچہ تو وہاں گو کہ بہت دیکھے تھے
مثل گل پردہ ہتھیلی پہ نہ زر رکھتے تھے

سرو اس باغ میں جتنے تھے وہ آزاد تو تھے
سر بلندی کی ہوا دل میں نہ وہ رکھتے تھے

میں کہ حیران تھا اور بھید نہ کچھ جانتا تھا
ہاتھ باندھے ہوئے تھا تخت کی اک سمت کھڑا

شاہزادی کی نظر اتنے میں جو مجھ پہ پڑی
نظر لطف سے اِس طرح سے گویا وہ ہوئی

یہ وہ گلشن ہے کہ رہتی ہے سدا جس میں بہار
اور گلچیں کا خطر جس میں نہیں ہے زنہار

شیخ مولا بخش متخلص بہ بلند نے پچیس (۲۵) اشعار کی نظم پڑھی "قناعت" کے لیے بتایا کہ اِس کا مرتبہ عرش سے بھی بلند ہے۔ اگر مجھے "قناعت" کا مقام نظر آجائے تو وہیں جا کر رہ جاؤں۔ اِس میں جنت کی خوشبو ہے۔ میں نے جام قناعت پیا ہے لہذا اب میرے سامنے جام جم کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ اولیاء کو "قناعت" پسند تھی۔ اگر لوگ "قناعت" کی شان سے واقف ہو جائیں تو مروت اور انصاف کو آبرو مل جائے۔

اِس نظم میں شاعر نے "قناعت" کی تعریف میں قدیم تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے ہیں۔ بعض جگہ عجیب و غریب اصطلاحیں نظم کی ہیں جن کی وجہ سے اصل مقصد سے دور جا پڑے ہیں۔ لیکن سابق کے مقابلے میں آسان گوئی کی کوشش ضرور کی ہے

نمونۂ کلام:

اڑے ہوش پریوں کے بھی قاف میں پھر — جو اک بار دیکھا "خرام" قناعت"
سماں کیوں نہ روزوں رمضان کو ہو — کہ رکھتے ہیں ہم اب صیام" قناعت"
ازل سے ہے مرغوب مجھ کو "قناعت" — نہ کیوں کر ہوں میں نیک نام" قناعت"
کبھی دل" میں رکھتا ہے کہ آسمان پر — نہیں ایک جا پر قیام" قناعت"

شتر غمزے بھولے ہوئے نام قانع
پڑی ناک میں جب زمام" قناعت"

جوالا سہائے کا نستھ خورم آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ انھوں نے پہلے چھے (۶) اشعار قناعت کی تعریف میں پڑھے پھر سولہ اشعار میں ایک چھوٹی سی کہانی نظم کی ہے۔ آخر میں طالب علموں کے لیے دعا مانگی ہے۔

ابتدائی چھے اشعار میں خدا سے دعا کی ہے کہ مجھے قناعت سے بہرہ ور کر۔ کہانی کچھ اِس طرح ہے کہ دو بادشاہ تھے۔ ایک بادشاہ "قناعت" پسند تھا اور رعایا اِس کی وفادار تھی۔ دوسرا بادشاہ حریص تھا اور رعیت اِس

کے لالچ کے سبب سے بہت پریشان تھی آخر ایک دن دونوں کی فوجوں میں جنگ ہوئی اور حریص بادشاہ کی فوج نے فیصلہ کیا کہ قناعت پسند بادشاہ کو ہم اپنا بادشاہ بنائیں گے۔

اِس نونہال طالب علم کی کہانی بچوں کی طرح معصوم ہے۔ لیکن ان کے خیالات قابل قدر ہیں کہ عوام خود قناعت پسند تھے۔ اور انھوں نے حریص بادشاہ کو معزول کیا۔ ان کے لہجے میں بچوں کی سی سادگی اور بے تکلفی ہے۔ طبیعت موزوں ہے بعض اشعار اچھے ہیں۔

نمونۂ کلام:

خدایا مجھے کر قناعت گزیں ۔۔۔ بدرگاہ تو شکر اے لایزال
الٰہا تو کر مجھ کو رطب للسان ۔۔۔ قناعت کی بابت کروں کچھ بیان
جو مردم قناعت ہیں بہرہ ور ۔۔۔ وہ ہیں صاحب جاہ علم و ہنر
کوئی تھا تونگر کسی شہر میں ۔۔۔ "قناعت" سے مشہور تھا دہر میں
وہ اِس شہر کے لوگوں کی جان تھا ۔۔۔ "قناعت" کی اس شہر میں کان تھا
کسی جا پہ تھا دوسرا اک امیر ۔۔۔ کہ تھا حرص کی قید میں وہ اسیر
جو لشکر تھا اِس کا وہ بے حال تھا ۔۔۔ رعیت کا اس کی تباہ حال تھا

جو دنیا میں ہیں بی اے یا ایم اے
قناعت کی دولت تو اُن کو بھی دے

مصر رام داس نے حسب عادت فارسی میں پہلے چونتیس (۳۴) اشعار کے مستزاد میں قناعت کی تعریف کی ہے پھر تنتالیس (۴۳) اشعار میں ایک مثنوی سنائی۔

ابتدا میں کہتے ہیں کہ قناعت کرنے والے بے نیاز ہوتے ہیں انھیں کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ اگر حریص بن کر دولت حاصل کر بھی لی تو طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے قناعت کرنے والوں میں جو

خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور حریص جن تکلیفوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اُنھیں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثنوی میں سکندر کی کہانی نظم کی ہے کہ جب سکندر دنیا کو فتح کرنے کے لیے نکلا تو کئی ممالک فتح کرتے ہوئے چین کی سرحد تک جا پہنچا۔ جب فوجوں نے ڈیرہ ڈالا تو دیوار چین کا دروازہ کھلا اور خاقان چین کے سفیر چار تحفے لے کر سکندر کے پاس آئے۔ عمدہ کھانے عمدہ لباس، غلام اور کنیزیں۔ سکندر نے جب ان تحائف کا مقصد پوچھا تو خاقان کے سفیر نے کہا کہ مردوں کو اِن ہی چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ میں نے پیش کر دی ہیں۔ تو اِن ہی چیزوں پر "قناعت" کر۔

افسوس کہ مصر رام داس نے اردو کو قابل اعتنا نہ سمجھا ورنہ ان میں زبردست شاعرانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ انھوں نے فارسی کی نظم میں انگریزی اور عربی الفاظ استعمال کیے ہیں حالاں کہ اگر وہ چاہتے تو ان کے مترادف الفاظ لکھ سکتے تھے اور نئے مرکبات بنا سکتے تھے۔ انھوں نے عدالت کی مروجہ اصطلاحات مثلاً مختار، وکیل کچہری کے ساتھ ڈسمس کرنا، ڈگری چالان جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں:

نمونۂ کلام:

خواہندہ فقیرست بچشم ہمہ مردم	ہر چند امیرست
فرسند گدا را ہمہ جا ہست مدارا	باعزت و جاہے
در حرص و ہوا دور جوانی بسر آمد	و ز شرم گناہان
با موئے سفیدست شدن روز جزا را	با روئے سیاہی

یہاں محمد حیات فیض نے چوبیس (۲۴) اشعار کی نظم پڑھی۔ قناعت کی تعریف ہر ہر طرح کی ہے۔ فیض کی یہ نظم پچھلی نظموں سے بہتر ہے تشبیہات اور محاورات برمحل استعمال کئے ہیں۔ اگرچہ بعض اشعار بچکانہ معلوم ہوتے ہیں لیکن اکثر جگہ خیالات مربوط اور نظم میں روانی ہے غالب سے متاثر ہیں روشن

نفسان، آئینہ داران محبت، جیسے مرکبات اچھی طرح نباہے ہیں۔

نمونۂ کلام :

شاید کہ کوئی آگے سخی دان کرے گا — بیٹھے ہیں بچھائے ہوئے دامان "قناعت"
کیوں کر وہ بھلا آیت والعبد کو بھولیں — جو لوگ پڑھا کرتے ہیں قرآن "قناعت"
حیران نہیں ہوتے کسی وجہ سے ہرگز — اے اہل ہوس آئینہ داران "قناعت"

میر انور حسین ہما نے ۲۷ اشعار کی نظم سنائی۔ حسب روایت "قناعت" کی تعریف طرح طرح کی تشبیہیں دے دے کر کی ہے اور اہل قناعت کے اوصاف بیان کئے ہیں اور ہوس کی خرابیاں بیان کی ہیں۔ مشکل الفاظ، استعاروں سے پرہیز کیا ہے۔ نظم سطحی ہے لیکن آسان زبان میں مقصد بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض اشعار وزن میں نہیں صرف چند اشعار میں فارسی مرکبات لاتے ہیں۔ چند اشعار بے معنی ہیں۔

نمونۂ کلام :

جز اہلِ "قناعت" ملا ہے کسی کو — سراغ "قناعت" نشانِ قناعت"
شکیب و توکل میں ہے سود لیکن — ہوا و ہوس ہے زیان "قناعت"
در صبر و لعل توکل سے خالی — نہ بحر غنا ہے نہ کان "قناعت"
حریم ہوس سے ملا کچھ نہ بس اب — سر اپنا ہے اور آستاں "قناعت"
غم اندوہ ہوتا ہے روشن نفس کب — جو در پیش ہو دوریان "قناعت"

بجز صبر اہل دل پر سویدا
نہیں ہوتا رازِ نہاں قناعت

مولوی عطا اللہ صاحب عطا نے ۳۴ (چونتیس) اشعار کی نظم سنائی اس میں نصیحت بھی ہے۔ اہلِ قناعت کی توقیر اہل ہوس کی مذمت، ہمعصر شاعروں پر چشمک، حاکموں پر طعن اور ان سے ہمدردی کی التجا سب کچھ ہے۔ عطا صاحب میں شاعرانہ صلاحیتیں تھیں۔ زبان اگرچہ مشکل ہے عربی و

فارسی الفاظ کی بہتات ہے۔ کہیں کہیں اشعار میں سکتہ پڑتا ہے۔ بعض اشعار وزن میں نہیں لیکن بعض اشعار بہت رواں اور موزوں ہیں جن میں شاعرانہ حسن موجود ہے۔ اگر اس نظم میں بعض سقم نہ ہوتے تو اچھی نظموں میں اِس کا شمار ہوتا۔ ان کی طبیعت مشکل پسندی پر مائل ہے لیکن آسان طرزِ بیان کی کوشش ضرور ہے۔

نمونۂ کلام :

اے اہلِ ثروت ہے زیب و زینت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
اے اہلِ دولت ہے شان و شوکت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
حاجت نہیں ہے ڈبل روٹی کی ہم کو ملی ہے نان "قناعت"
کافی ہے بالکل یہ نان نعمت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
کارِ سخاوت کس کی ہے طاقت فعلِ قناعت ہے کس کی قدرت
اس عہد میں بھی ہے یہ غنیمت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
منعم نے پائی حاتم کی خصلت ممسک پھنسا ہے در رنج و عسرت
روزِ ازل سے ٹھہری یہ قسمت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
قانع کو ہر جا ہوتی ہے عزت طامع ہمیشہ پاتا ہے ذلت
عالم کو جاہل سے رہتی ہے نفرت دانا کی صحبت سے ہے دل کو راحت
گھر گھر خزینہ ہر جا دفینہ سینہ میں کینا قارون کی خصلت
ہاں ہے تو یہ ہے حاتم کی سیرت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
یہ چرخ غدار ہے سفلہ پرور اشراف کا ہے حال اِس سے ابتر
عالم کو کرتا ہے بے قدر یکسر جاہل کو بخشے ہم سیم و ہم زر
کھاتا ہے غم کو پیتا لہو کو آب و خورش ہے دانا کی اکثر
الحمد وللہ ہے یہ طراوت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"

شیخ الٰہی بخش رفیق نے ایک سو ستائیس اشعار کی مثنوی اور سترہ اشعار کی

ایک غزل سنائی۔ ابتداء منظر نگاری سے کی ہے۔ رات کا سماں اور صبح کی صباحت کو بڑے دلآویز انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد طویل استعارے میں قناعت کی تعریف اِس طرح کی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نورِ سحر دیکھ رہا تھا کہ نور کا ایک دریا بہتا وا نظر آیا۔ جس کے کنارے دو شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص اِس دریا میں ہاتھ دھو رہا تھا اور دوسرا شخص بے حد پیاسا تھا جو سینکڑوں جام بھر بھر کر پی رہا تھا لیکن اِس کی تشنگی رفع نہیں ہوتی تھی۔ پہلا شخص جو ہاتھ دھو رہا تھا وہ دراصل زمانے سے ہاتھ دھو رہا تھا۔ اِس کا لقب قناعت تھا ریاضت اور فقر کی شان اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔ بظاہر غم گیں تھا لیکن دل میں نور تھا۔ دوسرے شخص کو لوگ حرص کا پتلا کہتے تھے۔ قناعت نے جو اسے دیکھا کہ اس کا دل بس میں نہیں اور یہ دریائے ہوس میں غرق ہو رہا ہے تو اس سے کہا کہ بس کر کہیں دانۂ گندم کی طرح تیرا پیٹ نہ پھٹ جائے۔ تو فلک کی طرح ظالم ہے جس کا پیٹ ستاروں سے بھرا ہے اور وہ گردش کرتا رہتا قیامت تک اِس کا پیٹ نہ بھرے گا۔ حرص کے پتلے نے کہا کہ خدا نے ہاتھ کمانے اور کھانے کے لیے دیتے ہیں۔ تم سوکھ کر گور کے قریب پہنچ گئے ہو۔ یہ فاقہ کشی تمہاری جان لے لے گی۔ ہمت تمہارے سامنے کھڑی روتی ہے۔ تب قناعت نے کہا حق کے بندے مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میرا دوست اخلاق ہے جس نے پیار و محبت سے ہر ایک کو اپنا لیا ہے وہ کسی کو رنجیدہ نہیں ہونے دیتا وہ کدورت سے دلوں کو صاف کرتا ہے اور صبر پر مائل کرتا ہے۔ لوگ سکھ چین کی نیند سوتے ہیں۔ لیکن زر کے بندے پیسے کے لالچ میں نیند خراب کرتے ہیں اور قسمت سے زیادہ طلب کرتے ہیں۔ حرص کو بہت غصہ آیا اس نے کہا کوشش کو خدا نے بڑی اہمیت دی ہے وہ حیلے سے رزق دیتا ہے اور بہانے سے موت۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ دفعتاً دریا جوش میں آیا اور ایک صدف اوپر آیا اس نے کہا کہ میں پورے سال ابرِ نیساں کا منتظر رہتا

بھا۔ اور خدا سے امید وار تھا پیاس سے بے چین کہ اتنے میں گھٹا جھوم کے آئی اور صرف ایک قطرہ مجھے ملا لہٰذا دیکھ اِس بوند سے در شہوار ملا ہے بگڑی اپنے جال میں منتظر رہتی ہے رزاق اِس کو رزق پہنچاتا ہے۔

رفیق صاحب نے قناعت اور ہوس کا مکالمہ قلم بند کیا ہے۔ قناعت کی دلیلیں بڑی جاندار ہیں لیکن ہوس میں کوشش کو شامل کر کے انصاف سے کام نہیں لیا۔ اشعار سطحی تو نہیں لیکن فکر کا عنصر کم ہے۔ نظم میں روانی ہے منظر نگاری بڑی دلاویز ہے۔ بعض اشعار بہت اچھے ہیں۔ استعارہ در استعارہ موجود ہے تشبیہیں بھی ہیں لیکن طبیعت الجھتی نہیں۔ چند اشعار وزن میں نہیں کہیں کہیں سکتہ بھی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ مثنوی اچھی ہے۔ اصل مقصد واضح کیا ہے۔ زبان و بیان میں روانی اور برجستگی موجود ہے۔ شاعران مشاعروں کی جدت سے باخبر ہیں۔ اِس مشاعرے میں پہلی مرتبہ متروک لفظ "آئیاں" استعمال ہوا ہے۔

نمونۂ کلام :

شبنم نے جو دھویا رخ پرنور سحر نے
دامن کو بھرا موتیوں سے سبزہ تر نے
جھولے میں صبا گل کو جھلاتی ہوئی آئی
اطفال کے غنچوں کو کھلاتی ہوئی آئی
مستی میں وہ یکبارگی سب آئیاں شاخیں
اور باغ میں لینے لگیں انگڑائیاں شاخیں
اے حرص کے پتلے یہ تری تشنہ دھانی
بس کرتا نہیں اور پیے جاتا ہے پانی
میں دیکھتا ہوں تیری ہوس کم نہیں ہوتی
اور طبع کو سیری ترے اک دم نہیں ہوتی
منہ بند کر اس جان ہوسناک کا ظالم
کیا ڈھنگ اڑایا ہے یہ افلاک کا ظالم
کچلول شکم دانۂ انجم سے بھرا ہے
اس پر بھی سدا پھرتا بشکل فقرا ہے
لے لے دے گی اک روز یہی حرص دم اس کا
اور تا بقیامت نہ بھرے گا شکم اِس کا

سید اصغر علی فقیرؔ نے بیس بندوں پر مشتمل مسدس پڑھا جس میں

"قناعت" اور قانع کی تعریف کی ہے۔ اور خود قانع ہونے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ ٹیپ کا شعر فارسی کا ہے۔ "قناعت" کی تعریف استعاروں اور تشبیہوں سے کی ہے۔ اصل قناعت کو جو مرتبے عطا ہوتے ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔ پہلے دو شعر جو اردو میں ہیں ان میں روانی ہے طبیعت آسان گوئی پر اکساتی ہے۔ مثلوں کا مقصد بھی جانتے ہیں تاہم فارسی کے شعر سے نظم میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہیں قاری کا ذہن رکتا ہے۔ بعض اشعار وزن میں نہیں ہیں۔

نمونۂ کلام :

یہ ہے وہ باغ کہ جس کو نہیں خوفِ خزاں — یہ وہ ہے سرو کہ عاشق ہے ہر اک سرِ رواں
یہ وہ غنچہ ہے کہ صدقہ ہے ہر اک غنچہ دھان — دیکھ کر اس کو بھی کہتے ہیں سب خرد و کلاں

اشیاقیکہ بدیدار تو دارد دل من
دل من داند و من دانم و داند دل من

یہ قناعت ہی عجب چیز ہے اک ذائقہ دار — کہ لیا جس نے اٹھا سر پہ "قناعت" کا یہ بار
اسے آسائش و آرام ہے یہی لیل و نہار — اور جو جائے کہیں تو وھاں بس یہ پکار

اشیاقیکہ بدیدار تو دارد دل من
دل من داند و من دانم و داند دل من

مفتی امام بخش رئیس بٹالہ نے شیخ سعدی کے قول کو تین سطروں میں فارسی میں نظم کیا ہے۔ پھر ایک قطعہ اور ایک رباعی فارسی میں "قناعت" کی شان میں سنائی۔

نمونۂ کلام :

اے "قناعت" تو نگرم گردان — کہ ورائے تو ہیچ نعمت نیست
گنج صبر اختیار لقمان ست — ہر کرا صبر نیست حکمت نیست
بعد ازاں از زبانم سخن ست — ایں رباعی بہ پیش انجمن ست

مولوی محمد سعید، سعیدؔ نے اکہتر (۷۱) اشعار کی ایک مثنوی سنائی جس کا

مقصد یہ ہے کہ کل شام کو جب میں بستر پر لیٹا تو اپنے علم و ہنر پر غرور پیدا ہوا اور اپنے مقاصد پورے کرنے کی بہت سی ترکیبیں ذہن میں آنے لگیں اور میں سو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت حسین عورت جس کے اعضا سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے سادہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ چہرے پر نور برس رہا تھا۔ میں اسے پری سمجھا۔ میں نے اس سے نام پوچھا تو بولی کہ لوگ مجھے "بی قناعت" کہتے ہیں خدا کی بندی ہوں، مگر تم اپنی سناؤ۔ میں تو ہر ولی کی محبوبہ، ہر نبی کی مرغوب ہوں۔ میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی۔ پھر عیسیٰ کی انیس بنی، احمد (نبی کریم صلعم) کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ یحییٰ علیہ السلام کی ہمدم و ہم راز داؤد کی سہاگن، لقمان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ حضرت یونس، یعقوب ایوب، یوسف سب مجھ سے محبت کرتے تھے۔ میں اکیلی نہیں میرے اور بھی رشتہ دار ہیں۔ صبر میرا بھائی ہے جو حضرت ایوب کا غلام تھا۔ ایک بھائی توکل ہے تسلیم و رضا دونوں میری سگی بہنیں ہیں۔ لیکن دنیا میں میری ایک سوکن ہے۔ بڑی رنگیلی اور سونے میں پیلی لیکن وہ سراپا مکر و فریب ہے۔ حرص و طمع اس کا نام ہے اپنا آنچل دکھا کر فریفتہ کر لیتی ہے۔ ناز و انداز سے دل کو لبھاتی ہے لیکن وہ لوگوں کو دھوکے دیتی ہے دیس کی خاک چھنواتی ہے اور آخر بدنام و خوار کر کے ناکام کر دیتی ہے۔ اپنی تعریف کچھ بھلی نہیں لگتی لیکن میں سرمایۂ دل نوازی ہوں۔ کلید شادمانی، متاع کامرانی۔ میں خود ہی ایک دولت ہوں۔ آدمی کو ہر حال میں خوش رکھتی ہوں۔ گداگر کو شہنشاہ بناتی ہوں، محتاج کے سر پر تاج رکھتی ہوں۔ گناہ سے بچاتی ہوں، عاقبت میں خدا سے ملاتی ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ اے یار غم خوار میں مدت سے تمہارا منتظر تھا۔ اس نے کہا تو پھر میں تمہاری ہوں۔ لیکن تم مجھ سے کبھی جدا نہ ہونا اور میری سوکن سے کبھی نہ ملنا۔

یہ بڑی دل چسپ نظم ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ "قناعت" کو انسان سے

اِس طرح قریب کر کے دکھایا ہے کہ "قناعت" مجسم معلوم ہوتی ہے اور اپنی ذات کا ایک حصّہ معلوم ہوتی ہے۔ حرص کو قناعت کی سوکن کہہ کر عجیب قسم کا طنز و مزاح پیدا کر دیا ہے جسے پڑھ کر بے اختیار دل ہی دل میں ہنسی آتی ہے۔

نظم میں روانی، دل کشی اور برجستگی ہے۔ اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے نام غیر مرتب ہیں۔ لیکن زبان بہت سہل اور رواں ہے۔

نمونۂ کلام:

مدت سے تمہارے ہم تھے مشتاق — اور ہجر تمہارا تھا ہم کو شاق
تھے ایسے کہاں نصیب اپنے — دکھلاتی جو صورت اپنی تم نے
بتلاؤ ہمیں پر ایک بات اب — حصّہ میں ہمارے آؤ گی کب
سن کر یہ بات آگے آئی — شرمندہ سی ہو کے مُسکرائی
بولی لو آج ہی سے حضرت — چھوڑوں گی نہ آپ کی رفاقت
واقع میں سعید ہو اگر تم — سن لو اسے کان کھول کر تم
اک دم میرے پاس سے نہ ہلنا — سوکن سے میری کبھی نہ ملنا
ہر بات میں میری رائے لینا — ہر کام میں میرا ساتھ دینا

اب مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی نظم سنائی جو ایک سو بیس (۱۲۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ اِس نظم کا مقصد یہ ہے کہ خواجہ قناعت کو یہ اطلاع ملی کہ دنیا والے حرص و ہوس میں پڑ کر اس کی تعلیم بھلا بیٹھے ہیں یہ سن کر اسے بہت صدمہ ہوا اور انتہائی غصے میں آیا۔ اِس ملک القدس کے دربار میں یہ عرضی لکھ کر بھیجی کہ میں اب یہاں رہنا نہیں چاہتا اور اِس عرضی میں اہل دنیا کے حالات جو بگڑ چکے تھے تمام لکھے اور التجا کی کہ مجھے واپس بلا لیا جائے۔ ملک القدس نے عرضی پڑھ کر حکم دیا کہ ساری خلقت کو طلب کیا جائے اور اسے آئینۂ اسرار کے سامنے سے گزارا جائے تاکہ سب کی حقیقت

عیاں ہو جاتے۔ چناں چہ ساری مخلوق جمع ہوتی۔ پہلا گروہ سامنے سے گزرا تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں شان استغنا موجود ہے اہل علم و فضل ہیں لیکن دنیا ان کی قدر نہیں کرتی۔ ان لوگوں کی ملک القدس نے اعزاز دوامی کا تاج عطا کیا۔ اب دوسرا گروہ سامنے آیا۔ یہ اہل ہوس تھے اور ان کے پیٹ جسم کے پورے اعضا پر حاوی تھے۔ دو گروہ اور سامنے سے گزرے وہ بھی ان ہی لوگوں میں سے تھے جو حریص تھے۔ شاعر نے بڑے ادب سے سوال کیا :

جس خانۂ دل میں یہ طلسمات عیاں تھے　　　آئینۂ حالات و خیالات جہاں تھے

اِس طرح کا گھر خلق میں سوچو تو کہاں ہو

حیران ہوں کہ وہ خانۂ دل ہو تو کہاں ہو

آخر میں شاعر نے انکشاف کیا کہ وہ خانۂ دل خود ہر انسان کے پہلو میں موجود ہے۔ شاعر نے حکیمانہ نکتہ بیان کیا ہے کہ انسان کا دل ہی وہ آئینہ ہے جس میں اہلِ علم کے صحیح خد و خال نظر آتے ہیں۔ لیکن اِس سے فائدہ اٹھانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

قناعت جو اِس نظم کا اصل موضوع ہے اِس پر آزاد نے صحیح طور پر روشنی نہیں ڈالی۔ قناعت کے مختلف پہلو بیان کرنے کے بدلے دوسری غیر ضروری باتیں اِس قدر طوالت سے بیان کی ہیں کہ آزاد کی اِس مثنوی کا تاثر ختم کر دیتی ہے۔ یہ مثنوی اِس مرتبے کی نہیں جس مرتبے کی دوسری مثنویاں ہیں۔ استعارہ در استعارہ طبیعت کو الجھا دیتا ہے اور اصل مقصد ذہن سے نکل جاتا ہے۔ اگرچہ اِس میں بڑے حکیمانہ نکات بیان کیے ہیں۔ لیکن اِس نظم میں وہ روانی نہیں جس سے توقع آزاد سے تھی۔

پنڈت جواہر لال نے گیارہ اشعار کی نظم سنائی۔ انھوں نے "قناعت"

کی اور "قانع" کی تعریف کی ہے۔ ان کی طبیعت مشکل پسند ہے۔ مرکبات، استعارے اور تشبیہیں فارسی کی خوب استعمال کی ہیں۔ اگرچہ مشاعروں کی اہمیت سے واقف ہیں لیکن اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے فارسی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ کلام رواں ہے۔ صاحب ذوق ہیں۔

نمونۂ کلام:

مشتاق ہے دل بسکہ بہ آہنگ "قناعت" — اک گام میں طے کرتا ہوں فرسنگ "قناعت"

دل سیر سدا جوہر معنی سے ہیں ان کے — باندھے ہوتے جو ہیں بشکم سنگ "قناعت"

ہوں حادثۂ دھر اگر سد رہ اس کے
جوں مرغ ہے اڑتا فرس سنگ قناعت

سر پر جو دھرے تاج ہیں تسلیم و رضا کے — رکھتے ہیں وہ زیر قدم اورنگ "قناعت"

..........+.......

"تہذیب" نواں مشاعرا[1]

نواں مشاعرہ جس کا عنوان "تہذیب" تھا اس کا حال زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صادق نے اپنے مقالے میں "آزاد معاصرین کی نظر میں" ۱۵ اپریل ۱۸۷۵ء کے ایک رسالے "خیرخواہ عالم" ایس۔ زیڈ۔ اے[2] لاہور کے حوالے سے لکھا ہے:

> "... لیکن اب کے جلسہ اتنا بے رونق تھا کہ سابق میں نہ ہوا تھا۔ نہ کوئی عمدہ مشاعرہ تھا اور نہ اعلیٰ درجے شائقین تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید دہلی کے دربار کے باعث اکثر لوگ دہلی سے چلے گئے ہیں جلسہ بے رونق تھا۔ رفیق نے اب کی مرتبہ جو "تہذیب" کے مضمون

---

[1] ضمیمہ اخبار پنجاب، یعنی "انجمن پنجاب کے مشاعرے" لاہور: انجمن پنجاب پریس، مارچ، ۱۸۷۵ء، نمبر ۸،

[2] "یہ فرضی نام "سیف الحق" "ادیب" کا ہے، جس کے لیے آزاد کا خیال تھا کہ یہ حالی کے شاگرد تھے اور آزاد کے مخالف ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کتی درنہ دیگر شعرا کے کلام میں آزاد سے کہیں زیادہ اسقام تھے۔ سیف الحق ادیب اخبار پنجابی" میں آزاد کے خلاف مستقل کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔

، مکاتب آزاد "لاہور: ص ۴،

کی مثنوی سنائی تو اس میں اخبار والوں کو بھی
کچھ سنایا۔ جس پر رفیق صاحب کو طیش آگیا اور
سب کو مصنف ٹھیرا کر برابر اس کو پڑھا۔ اور
اس کے مضمون سے پایا جاتا تھا کہ وہ اخبار پنجابی کو
آوازہ کس رہا ہے...... اب اس مشاعرے میں
آج کل کے لونڈے ہیں۔ شاعر اکثر آتے ہیں، کوئی
کنجڑا ہے اور کوئی حلوائی وغیرہ جس میں آزاد صاحب عمدہ
شاعر تصور ہو سکتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم پہلے لکھتے
کہ انجمن کے مشاعرے میں شاعر منتخب کئے جاویں
تو بہتر ہے لیکن اب تو انتخاب کی کچھ ضرورت بھی نہیں
رہی کیوں کہ اچھے شاعروں نے اس طرف توجہ اور
شریک ہونا ہی چھوڑ دیا ہے[1]

بہر حال ہمیں اس مشاعرے کی تفصیل معلوم نہیں صرف نظم آزاد میں "مصدر تہذیب" کے عنوان سے ایک مثنوی موجود ہے جو ایک سو پینتالیس (۱۴۵) اشعار پر مبنی ہے۔ ابتدا میں آغاز آفرینش کے پرسکون ماحول کا نقشہ کھینچا ہے۔

بائیس اشعار میں ازل کی ابتدا، پرسکون ماحول، دنیا کی بہار کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ تمہید کافی طویل ہے۔ اس میں آزاد نے شاعرانہ حسن پیدا کرنے کے لیے روز ازل کا دبدبہ سکون اور دنیا کی منظر کشی کی ہے اور دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ مختصر یہ کہ ملک القدس نے خسرو اخلاق کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ دنیا والوں کو حسن خلق کی تعلیم دے۔ لوگ اس کے حسن سلوک سے بہت متاثر ہوتے اور اس کے غلام بن گئے لیکن ہزل اور تمسخر نے اس کی تمام

---

[1] سادق، ڈاکٹر، ص

کوششوں کو پامال کر دیا۔ یہ حال دیکھ کر خسرو اخلاق نے ملک القدوس کو ان کا حال لکھ کر بھیج دیا۔ ملک القدس نے قہر کو دنیا میں بھیجا اس نے چن چن کر غلط کاروں کو سزا دی۔ اِس کے بعد بزم قدس میں "تہذیب" کو حکم ملا کہ وہ دنیا میں جا کر اصلاح کا کام سرانجام دے۔ "تہذیب" نے دنیا میں آکر سب سے پہلے جشن عام کیا اور یہ حکم دیا کہ مدرسوں کے طالب علموں کے لیے صرف زبان سے سبق یاد کر لینا کافی نہیں انھیں چاہیئے کہ وہ علوم کے معنوں پر غور کریں اور انجمن پنجاب کے جلسوں کی روئداد اور رسالوں میں شائع کی جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مشہور ہو اور اِس کا فیض مقاصد عالم میں عام ہو جائے۔

نمونۂ کلام:

زمین پہ مہر کی جس دن کہ تھی نظر پہلی
اور آفرینش عالم کی تھی سحر پہلی

مزاج جملہ عناصر کا اعتدال پہ تھا
اور اعتدال سے جو کام تھا کمال پہ تھا

وہ صبح خلق میں بنیاد تھی زمانہ کی
اور ابتدا تھی زمانے کے کارخانے کی

زمین سبزہ قدرت سے لہلہاتی تھی
صبا جو اس پہ گزرتی تو لوٹ جاتی تھی

تمام دشت چمن در چمن بڑے ہوئے تھے
پہاڑ پھولوں سے دامن بھر کھڑے ہوئے تھے

وہ شاہ لطف سے تھا کر رہا جہاں پہ نظر
کبھی عیاں پہ نظر تھی کبھی نہاں پہ نظر

خدا کے بندوں پہ الفت زلبس تھی عام اس کی
فروغ عام تھی مثل یہ تمام اس کی

تو خاص و عام وہاں آکے باریاب ہوئے
سبھوں کو واں سے عطا خلعت و خطاب ہوئے

اِن ہی میں ہزل و تمسخر کے بھانڈ بھی آئے
ظرافتوں نے بہت باغ سبز دکھلائے

ہر ایک بات میں چالاکیاں وہ کرنے لگے
حضور شاہ میں بے باکیاں لگے کرنے

یہ حکم آج سے ہو جائے عام عالم میں
اور انتظام ہو اس کا تمام عالم میں

کہ لفظ جیسے زبانوں پہ ہیں رواں ہوتے
یہ ان کو منہ سے ہیں بک بک کے نیم جاں کرتے

ہوا یہ اتنے میں اک حکم دوسرا جاری
کہ جلسے انجمنوں کے ہیں جابجا جاری

نہ ان کی باتیں زبانوں پہ منحصر ہوویں
وہ سب رسالوں میں چھپ چھپ کے مشتہر ہوویں

مولانا حالیؔ لاہور چھوڑ چکے تھے۔ ڈاکٹر لائٹنرؔ آزاد سے ناراض ہو چکے تھے، حالاں کہ وہ ایران و افغانستان وغیرہ کا پر اسرار سفر کر چکے تھے۔ لیکن ان پر سے ڈاکٹر لائٹنرؔ کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنرؔ کی تصنیف "سنین اسلام" کے سلسلے میں آزاد سے ان کی اَن بن ہو چکی تھی جیسا کہ ان کے نجی اور دفتری خطوط سے ظاہر ہے جو انھوں نے ڈاکٹر لائٹنرؔ کو لکھے۔ "اخبار پنجابی" اور "وطن" کے اکثر علماء اور شعرا اِس جدید اردو شاعری پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ لیکن آزاد اِن نازک حالات میں بھی اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔

انھوں نے ایک طرف تو عنوانی مشاعروں سے اپنا دامن وابستہ رکھا کیوں کہ وہی اس کے بانی تھے اور دوسری طرف اشاروں اور کنایوں میں اِن اعتراضات کی نشاندہی بھی کی۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں جب کہ وہ کھل کر حکومت کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے تھے! اور نہ عوام پر راز افشا کر سکتے تھے اِس ابتدائی معیار کو قائم رکھنا بہت مشکل تھا اگر وہ اِس معیار تک اِس مثنوی کو نہ پہنچا سکے تو کوئی تعجب نہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن حادثات نے مولانا آزاد سے شاعرانہ صلاحیتیں چھین لیں اور پھر خود انھیں بھی اِس کا احساس ہو گیا تھا اسی لیے انھوں نے اپنی پوری توجہ نثر کی طرف منعطف کر دی۔

....

۱؎ اسلم فرخی، ڈاکٹر محمد، "محمد حسین آزاد۔ حیات اور تصانیف"، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان)، حصہ اول، ص ۱۶۵

۲؎ "مکتوبات آزاد"، صص ۸ ـ ۱۰۷

"تہذیب" نوان مشاعرہ[1]

۱۲ مارچ ۱۸۷۵ء کے نویں مشاعرے کی اس غیر مطبوعہ مثنوی میں ۱۰۴ اشعار ہیں۔ یہ مثنوی سید اصغر علی حقیر لکھنوی کی ہے تمہید میں صبح کے اس منظر کو پیش کیا ہے جو بڑا دل فریب ہے اس کے بعد طویل استعارہ شروع ہوتا ہے کہ صبح کے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ناگہاں ایک غنچہ دہن نے مجھے پکارا

---

[1] آغا محمد باقر مرحوم نے انجمن پنجاب سے متعلق جتنی دستاویزات اور رسالے ہیں وہ سب میرے ہاتھوں کھلوائے۔ ان میں زرد کاغذ پر خط نستعلیق میں چند نظمیں درج تھیں جن کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لیے گارسین دتاسی نے محض اخبار پنجابی" کے حوالے سے آٹھویں مشاعرے کی نشاندھی کی ہے اور پنجابی نے مشاعروں میں حلوائی، تاراچند اور طالب علموں کی شرکت پر اعتراض کیا ہے اور صرف شیخ الٰہی بخش رفیق کی مثنوی "مصدرِ تہذیب" کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن اس مشاعرے کی دو مثنویاں مجھے مل گئیں۔ پہلی مثنوی سید اصغر علی حقیر کی ہے اور دوسری رفیق کی ہے۔

اس کے بعد اس دستاویز پر ایک نظم کا ایک حصہ بھی موجود ہے جو نویں مشاعرے کا ثبوت ہے۔ اگرچہ پوری مثنوی نہیں لیکن یہ دستاویز صفحہ ۲۵ سے شروع ہوتی ہے اور اس پر "اخلاق" سے متعلق سات اشعار موجود ہیں۔ اس کے علاوہ نظم آزاد میں شرافت حقیقی کے عنوان سے مولانا آزاد کی مثنوی موجود ہے جو اخلاق سے متعلق ہے اس سے ثابت ہو گیا کہ مشاعرہ نمبر دس کا عنوان "اخلاق" تھا۔ یہ مسودہ بیگم آغا باقر مرحوم نبیرہ آزاد کے پاس موجود ہے۔ (صفیہ بانو)

اِس تقریر کو سُن کر میں نے اس کا حسب و نسب پُوچھا تو ایک سپاہی مجھے نظر آیا اِس نے آکر بتایا کہ یہ شہزادی "تہذیب" کا گھر ہے۔ میں نے اس غنچہ دہن سے زمانے کی شکایت کی اور اپنا دکھ درد بیان کیا تو اس نے بڑی تسلی دی اور کہا کہ میرے ساتھ چلے آئیں تمہیں شہزادی تہذیب کے دربار میں لے جاؤں گی۔

شہزادی "تہذیب" کا ذکر سن کر میں نے اِس کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ غنچہ دھن مروت ہے۔ اِس کا کام یہی ہے کہ کوئی شہزادی "تہذیب" سے ملاقات کا طالب ہو یہ اسے اس کے دربار میں لے جائے۔ دربار میں جانے سے پہلے میں نے "تہذیب" کی شان میں قصیدہ لکھا۔ اِس قصیدے میں دس اشعار ابتدائی ہیں اور "تہذیب" کی تعریف میں اٹھارہ اشعار ہیں:

نمونہ کلام:

اے رخش قلم نظم کا میدان دکھادے — اے ذہن رسا اپنی رسائی کا پتا دے
شہزادی تہذیب کا اب لکھ کے سراپا — اے دل تو اسے بزم سخنوراں میں سنا دے

شہزادی تہذیب کا سراپا شاعر نے اِس طرح پیش کیا ہے جیسے قدیم محبوب کا سراپا لکھا کرتے تھے لیکن اِس سراپا میں عریانی نہیں بلکہ ہر عضو کو صفات پاکیزہ سے تشبیہ دی ہے۔

نرگس کو یہ تہذیب اگر آنکھ دکھادے — اک لطف ہو بیمار کو بیمار شفا دے
چشموں پہ کریں غور ذرا مردم دیدہ — وہ چشم ہے جو چشمہ الفت کا پتا دے
بینی کا ہے اِس واسطے مابین پس پردہ — تا آنکھ کو یہ آنکھ نہ نظروں سے گرادے
رخسار ہیں یا ترجمہ سورۃ مصحف — نقطے کا نہ کسی طرح سے یہ خال بتادے
امکان ہے گر کان کا ہو وصف کسی سے — "تہذیب" اسے کان جواہر کا صلہ دے
وہ چاہ زنخدان ہے کہ جو چاہ میں اپنے — پائے تو دل یوسف کنعان کو گرادے
دیکھے جو کوئی گردن پر نور کا جلوہ — وہ نور ہے جو طور کی قندیل بجھادے

یہ سینہ بھی ہے خلق و مروت کا خزینہ   "تہذیب" کی توصیف نہ کیوں سب کو سکھا دے

۳۴ اشعار میں شہزادی کا ذکر ہے کہ جب میں اِس مہ لقا کے ساتھ چلا تو ایک شخص جس کا نام خلق تھا۔ اس نے بتایا کہ جب سے شہزادی نے سنا ہے کہ ایک شاعر یہاں آیا ہے ملنے کے لیے بے چین ہے۔ مروت نے چپکے سے اس کے کان میں کہا کہ یہ وہی شاعر ہے جو ہند سے آیا ہے۔ خلق نے مروت سے کہا کہ انھیں شہزادی کے دربار میں پیش کرو۔ یہ قصیدہ بھی سنائیں گے اور باغ میں آنے کا سبب بھی۔ آخر شہزادی کے دربار میں باریاب ہوتے اپنا قصیدہ پیش کیا۔ شہزادی قصیدہ سن کر بہت خوش ہوئی اور خلق مروت بطور انعام بخشے۔

اِس مثنوی میں کہانی کا عنصر زیادہ ہے۔ شاعر اصل مقصد سے دور ہو گئے ہیں لیکن اِس نظم میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ "باتہذیب" ہونے کے لیے خلق اور مروت کا ہونا لازمی ہے۔

اِس مثنوی کو پڑھ کر بے اختیار ذہن مولانا آزاد کی مثنویوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اِس مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ اِس میں منظر نگاری، سراپا اور مکالموں کو بھی خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے۔ منظر نگاری میں میر انیس سے متاثر ہیں۔ اِس مثنوی میں ان کا انداز بدلا ہوا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اِس میں اصل عنوان پر زور دینے کے بجائے کہانی پر قوت تخیل زیادہ صرف کی ہے۔ فارسی الفاظ کے باوجود زبان سہل اور رواں ہے کہیں کہیں اشعار میں سکتہ پڑتا ہے شاعرانہ تعلّی اور زمانے کا شکوہ بھی ہے۔

مصدر تہذیب کی یہ مثنوی بھی غیر مطبوعہ ہے۔ لیکن گارسین دتاسی کے علاوہ اور دوسرے تنقید نگاروں نے بھی اپنی تنقیدوں میں اِس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی شیخ الٰہی بخش رفیق صاحب کی ہے۔ اِس مثنوی نے جلسے میں ہنگامے برپا کر دیا۔ رفیق صاحب نے اخبار پنجابی کو بے نقط سنائیں اِس کے علاوہ دیگر عہدیداروں، حکام، شعرا اور خاص طور پر آزاد

تک نہ پہنچ سکے۔ اگرچہ نام نہیں لیا لیکن قرائن سے آزاد ہدف بنے کیوں کہ رفیقؔ کے علاوہ جو شعرا مشاعرے میں کام یاب نہیں ہوتے تھے وہ آزاد کے خلاف محاذ بنا لیتے تھے۔ اس کے علاوہ جن شعرا کا کلام واقعی پسندیدہ ہوتا تھا ان ہی کو پندرہ سے بیس روپے تک ملا کرتے تھے۔ دوسرے شعرا جن کا کلام اِس لائق نہیں ہوتا تھا وہ محروم رہتے اور آزاد کے خلاف زہر اُگلتے۔ آزاد نے اپنے ایک خط میں اِس کی نشان دہی کی ہے۔[1]

اِس مثنوی میں ۱۵۴ اشعار ہیں۔ ۲۹ اشعار کے بعد ۳۶ اشعار پر × نشان بنا ہوا ہے۔ اِس مثنوی کا مطلب یہ ہے کہ جب رات ہوئی تو نا امیدی اور غم کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کوئی غم خوار اور دوست نہیں سوائے رنج و الم کے۔ میں نے سوچا کہ کوئی ایسا کام کیا جائے کہ رات کٹ جائے۔ اِس کیفیت کا اظہار گیارہ اشعار میں کیا ہے۔ اِس کے بعد زمانے کا شکوہ ہے۔

اہل دنیا کی باتیں ہی الٹ گئی ہیں۔ چال چلن بگڑ چکے ہیں۔ جہالت کی تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسے جاہلوں پر جہالت فدا ہوتی ہے اور تہذیب سرہانے کھڑی روتی ہے یہ لوگ وہ ہیں جو صرف اپنا ہی بھلا چاہتے ہیں۔ اور مغرور ہیں۔ غفلت کی چربی آنکھوں پر ہے یہ خود بین اور خود نما آرام طلب، بداندیش بے مہر حریص اور موت سے بے خبر ہیں یہ نہیں جانتے کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار پر × نشان لگا ہے:

اور کچھ لوگ کہ ہیں علم کے مشتاق اِن میں	مولوی بن کے ہوتے شہرۂ آفاق اِن میں
آئی چہرے پہ موٹاپے سے بحالی اِن کے	پیٹ مٹکوں کی طرح رہ گئے خالی ان کے
سر پہ دستار فضیلت کی دھرے پھرتے ہیں	اور تکبر کی ہوا سر میں بھری پھرتے ہیں

---

[1] "مکاتیب آزاد"، محولہ بالا، ص ۴،

خود پسندی نے انھیں کر دیا مغرور اتنا — فخر رازی سے بھی ہیں کھینچتے کچھ دور اپنا
کہتے اک اک سے حکایت ہیں یہ دن رات — سخن شیخ کہا اور کہا اپنی بات
گر لیاقت پہ نظر کیجیے تو خاک نہیں — بے وقوف ایسا بھی کوئی تہ افلاک نہیں
کیست امروز بعالم بشرے صاحب علم — ہم چو مانیست بہ دنیا دگری صاحب علم
پوچھیں گر لفظ کے معنی تو خفا وہ ہو جائے — اور طبیعت ابھی اک لحظہ میں برہم ہو جائے
یا وہ گویوں میں تو نام ان کا رقم ہوتا ہے — پر ذرا علم کا دعوٰی نہیں کم ہوتا ہے

چاہتے فضیلت و کمالات میں کامل ہو جائیں [۱]
کر کے محنت علماؤں میں یہ شامل ہو جائیں

اور جنھیں حاکموں نے صاحب فرمان کیا — اس رعیت کے تھا اکرام کا سامان کیا
سو اب ان کے بھی ہیں بگڑے ہوئے دستور بہت — اس حکومت نے انھیں کر دیا مغرور بہت
تھا یہ سامان کبھی مظلوم کی دل داری کا — اب حکومت نہیں پیشہ ہے ستم گاری کا
خنجر کبر کا ہر میان بنایا دل کو — اور دریائے تکبر میں ڈبایا دل کو
زنگ سے ایک کا آئینہ دل صاف نہیں — رحم دل میں نہیں اور سینہ میں انصاف نہیں
دیتے اوروں کو سزائیں ہیں بد افعالی پر — دل میں شرماتے نہیں اپنی بد اعمالی پر

خوبیاں اتنی مگر ہیں انھیں درکار ضرور
آج کرنا ہوا جن کا مجھے اظہار ضرور

نیک طینت ہو خدا ترس ہو اور بھی ہو — خلق ہو رحم و دیانت بھی ہو انصاف بھی ہو
جس میں یہ وصف ہوں حاکم بھی ہے سردار بھی ہے — کشور دل کا زمانے کے وہ مختار بھی ہے
اور وہ شاعر کی بہت دھوم یہاں ہے جن کی — غیب کے قفل کی کنجی یہ زباں ہے جن کی
بات کو عقل کے میزان میں نہیں تولتے ہیں — قفل مضمون مطالب کا نہیں کھولتے ہیں
بات اصلی کا زبان تک نہیں لانا آتا — ایک چین چین ہی کا زیور ہے بتانا آتا

۱؎ کتابت کی غلطی۔

اور اگر شاہد مضمون کو کبھی پاتے ہیں
ایسا خوش رنگ لفافہ اسے پہناتے ہیں

کہ جو سنتا ہے وہ کہتا ہے سبحان اللہ
اصل مطلب کو جو ڈھونڈو تو نگہبان اللہ

جان مضمون پہ نہیں رحم ہیں کرتے ظالم
خون معنی میں عبث ہاتھ ہیں بھرتے ظالم

اصل مطلب کی طرف چاہیئے لائیں دل کو
اور کہو گو رضا میں نہ بنائیں دل کو

پر یہ فرقہ جو زمانے میں ہے اخبار نویس
ملک معنی کا حقیقت میں ہے اسرار نویس

ہے جو اخبار تو اک فیض کا گنجینہ ہے
اور اِسرار حقیقت کا یہ آئینہ ہے

کبھی اصلاح خلائق کا وسیلہ ہے یہ
کبھی فی الجملہ کمائی کا بھی حیلہ ہے یہ

عیب و خوبی کے جو معنی ہیں وہ کھل جاتے ہیں
حق و باطل جو ہیں آنکھوں میں وہ تل جاتے ہیں

پر اب اِن کے بھی طریقے ہیں بگڑتے جاتے
گل حق شاخ عبارت سے ہیں جھڑتے جاتے

ہے ان میں بھی نہ کچھ لوگ بدستور اب تو
بوئے انصاف جو تھی ہو گئی کافور اب تو

اے رفیق اب جو میں انصاف کا دم بھرتا ہوں
اور اخبار نویسوں پہ نظر کرتا ہوں

کر دیا بغض و حسد نے بھی عجب حال ان کا
تھا جو اخبار ہوا نامۂ اعمال ان کا

صاف جس صفحہ پر تحریر نظر آتے ہیں
منہ چڑاتی ہوئی تصویر نظر آتے ہیں

پر اِن اخبار نویسوں کا ہوں مشکور بہت
گو ہیں نزدیک ہوں بیٹھا ہوا یا دور بہت

چاہیئے ان کو خوشامد کو تو چھوڑیں بالکل
راہ سیدھی جو ہے منہ ان سے نہ موڑیں بالکل

سچ میں جو جھوٹ ملا کر نہیں اک تل لکھتے
حق کو حق لکھتے ہیں باطل کو ہیں باطل لکھتے

اِس کے بعد تجارت پیشہ لوگوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو دنیا کے سفر سے تجربہ اور تجارت کا منافع حاصل ہوتا تھا اب اِن کے طور بھی بدل گئے۔ عقل نے فکر کی شطرنج بچھائی ہے اور محض ہیر پھیر سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور گھر بیٹھے خلق خدا کو لوٹتے ہیں۔ اب انھیں چاہیئے کہ ہمت مردانہ کام میں لائیں۔ زاہدوں کا زہد اب دھوکا بن چکا ہے۔ ان کی تسبیح مکر کی زنجیر ہے یہ مسجد کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ یہ گربۂ مسکین بنے ہوتے ہیں۔

بظاہر دنیا سے منہ موڑ لیا ہے لیکن حرص کا دامن پھیلا ہوا ہے۔ جو لوگ کہ شجاعت کا دم بھرتے ہیں وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگے ہیں اگر انھیں میدان جنگ میں بھیجا جاتے تو منہ چھپاتے پھریں۔

جب شجاعت ہے کہ دل ان کا پس و پیش نہ ہو — اور قومی ملک پہ اعداتے بد اندیش نہ ہو
اپنے حاکم سے جو رکھتا کوئی کینہ ہووے — تیغ ہو ان کی اور شخص کا سینہ ہووے
چاہیئے ہم وطنوں کے لیے پر ہو جاویں — زیر دستوں کی حفاظت کو سپر ہو جاویں
ورنہ سچ کہے گئے ہیں اگلے زمانے والے — کم بہت رہتے ہیں دنیا میں ستانے والے

اور جو لوگ توکل کا دم بھرتے ہیں وہ مکر کا جال پھیلائے ہوئے ہیں۔ اگر کسی کو کچھ دیتے ہوتے دیکھتے ہیں تو ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے ہیں۔

ان اعتراضات کے بعد شاعر نے ان صفات کا ذکر کیا ہے جو انسان کو آدمی بناتی ہیں۔

رحم، انصاف، وفا، خوف خدا، صبر، توکل، حلم، خوش اخلاقی، مروت اور ہمدردی۔ جس انسان کا دل علم و ادب کا غنی ہو جس شخص میں یہ صفات موجود ہوں ہم اس کو بشر کہتے ہیں۔

پھر نصیحت کی ہے کہ تہمت، غیبت، عداوت، بادہ خواری، رشوت، بے ادبی کے علاوہ بے محل بولنا زیب دیتا۔ دل بول اٹھا کہ میں مصدر تہذیب ہوں، عقل نے کہا میں ترغیب دوں گی۔ فکر نے کہا میں عقل کا سرمایہ ہوں تدبیر نے کہا کہ یہ بے چارے میری وجہ سے ہنرمند بنے ہیں۔ آنکھوں نے کہا کہ ہم جہان دیدہ ہیں۔ علم نے کہا یہ دیوانے ہیں عدالت نے کہا یہ جو سیکھتے ہیں وہ افسانے ہیں۔ آخر تقدیر نے یہ کہہ کر سب کا منہ بند کر دیا کہ میں نہ ہوتی تو آپ بھی نہ ہوتے۔

پھر شاعر نے صبح کی منظر کشی کرتے ہوئے مثنوی ختم کی۔

اِس مثنوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعرا کی آپس کی چشمک آخر مشاعروں کو

لے ڈوبی ۔سیاسی اعتبار سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شعرا کو حکام پر سے اور ایک دوسرے پر سے اعتماد اٹھ گیا اور جو مقصد ان مشاعروں کا تھا وہ پسِ پشت جا پڑا۔ ویسے یہ مثنوی ان روایات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جب مشاعرے اکھاڑا بن جاتے تھے۔ کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے بعض اشعار وزن میں نہیں رہے۔ زبان میں روانی ہے اِس مثنوی کو پڑھ کر تضحیک روزگار اور انشاء و مصحفی کا دور یاد آجاتا ہے۔

.........+..........

اخلاق دسواں مشاعرہ

دسویں مشاعرے کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن غیر مطبوعہ مسودہ پر فیض کی نظم اخلاق پر ہے جس کے صرف سات اشعار تھے۔ اور یہ اشعار نویں مشاعرے کے غیر مطبوعہ مسودے پر درج تھے۔ اس مشاعرے میں یقیناً دوسرے شعرا بھی شریک ہوں گے لیکن سوائے مولانا آزاد کی مثنوی "شرافت حقیقی" جو معنوی اعتبار سے اخلاق سے منسلک ہے اور کسی شاعر کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ فیض کے اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

دکھا دے گر ہمیں وہ خلق کی اے رہبران بے شک
خدائے لم یزل کا لطف ہے اور عین احسان ہے

نگاہِ غور سے اِس پردۂ اخلاق کو دیکھو
کہ نور ہر ذات خالق مطلق درخشاں ہے

بجز اخلاق و شفقت کے اگر سب چھوڑ دے اے دل
مناسب واسطے تیرے ہے وہ اور یہ بھی شایاں ہے

سوائے شیر دل اخلاق کا ہوتا ہے کب خواہاں
کہ ہر روباہ وش اس دشت سے داغ گریزاں ہے

گلستان جہاں میں صاحب اخلاق و بے شفقت
برنگ غنچہ خنداں ہے بساں ابر گریاں ہے

مقبوضہ بیگم آغا باقر نبیرہ آزاد

کروں میں کیا بیاں بے شفقت و اخلاق کا تم سے
بصورت شکل شیطان ہے بشریت میں مردان ہے
قدم رکھا ہے..... خلق میں اے فیض گر تو نے
ہراساں ہو نہ ہرگز تیرا حامی شاہ مردان ہے

"شرافت حقیقی" مولانا آزاد کی مثنوی ہے۔ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد نے جس ترتیب سے اسے "نظم آزاد" میں شائع کیا ہے اور جو خود ان کا خیال تھا اس اعتبار سے یہ مثنوی اس دسویں مشاعرے میں پڑھی گئی جس کا عنوان "اخلاق" تھا۔ معنوی اعتبار سے بھی شرافت حقیقی اخلاق سے منسلک ہے۔ ناقدین نے بھی اسی ترتیب سے "نظم آزاد" پر تنقید کی ہے اس کے علاوہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ مثنوی دسویں مشاعرے میں پڑھی گئی اور شاعری اب اس مقام تک پہنچ چکی تھی جہاں سے جدید اردو شاعری میں مقصدیت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نصاب تیار کرنے کے لیے لکھی گئی۔ زبان نہایت رواں ہے مقصدیت پر زور دیا گیا ہے۔ صفائی، سادگی اور زور بیان نمایاں ہیں۔ زبان شوکت الفاظ سے پاک اور نہایت پاکیزہ ہے:

میں پوچھتا نہیں ہرگز تمہارا نام ہے کیا ۔۔۔ نہ یہ کہ بزرگوں کا اور مقام ہے کیا
نہ خانوادے سے مطلب نہ خانماں سے غرض ۔۔۔ یہاں تو نام سے کچھ ہے نہ ہے نشان سے غرض
تمہارے کام اگر اچھے تو نام اچھے ہیں ۔۔۔ گھرانے اچھے، گھر اچھے، تمام اچھے ہیں

دوسرے بند میں دولت و حشمت کے مقابلے میں ہمت کو بڑی دولت کہا ہے تیسرے بند میں با اصول ہونے پر اصرار کیا ہے۔ چوتھے بند میں مروت اور ہمت عالی کی تعریف ہے۔ پانچویں بند "متاع حسن دیانت" اور وفا کا ذکر ہے۔ چھٹے بند میں کہتے ہیں کہ عقل شعور اور تجربہ بھی ضروری ہے:

مجھے غرض نہیں کالج میں تم پڑھے کہ نہیں
جماعتوں کے مدارج پہ تم چڑھے کہ نہیں

کتابیں پڑھ کے جو کیں حفظ بر زبان تو کیا
اور ان میں پاس ہوئے دے کے امتحان تو کیا
تمہارے خلق پہ بھی کچھ اثر ہوا کہ نہیں
زبان سے کہنے کی دل تک صدا گئی کہ نہیں
فقط جو عالم ذی شان ہو گئے تو کیا
میرے حسابوں وہ شیطان ہو گئے تو کیا

پھر کہتے ہیں کہ جو کچھ پڑھو اس کا اثر دل پر لو اور دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچاؤ:

مجھے غرض نہیں سب کچھ ہو تم کہ کچھ بھی نہیں
مگر یہی ہے تمنا کہ ایسے ہو کے رہو
میاں جلسہ جو آزاد پوچھے آ کے کبھی
کہو کسی میں لیاقت ہو اگر یہ کہنے کی
کہ باصفا و سبک روح و پاک جان ہم ہیں
تو تم جواب میں جھٹ بول اٹھو کہ ہاں ہم ہیں

..........+..........

انجمن پنجاب کے مشاعرے، موضوعات اور شرکاء

انجمن پنجاب کے عنوانی مشاعروں کی بنیاد ۸ مئی، ۱۸۷۴ء کو رکھی گئی۔ شام کے چھے بجے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام سکشا سبھا کے مکان میں اِس مشاعرے کا پہلا جلسہ جسے "افتتاحیہ" کہنا زیادہ مناسب ہے منعقد ہوا جس میں کرنل ہالرائیڈ، جسٹس بولنو، جج چیف کورٹ، مسٹر تھارنٹن سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ کرنل میکگیس مسٹر نیک کمشنر اور مسٹر نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور، نواب عبدالمجید خان، فقیر سید قمر الدین وغیرہ تھے۔ جلسے کے صدر جسٹس بولنو تھے۔

سب سے پہلے مولانا آزاد نے اردو شاعری میں انقلاب برپا کرنے کی تجویز پیش کی اور ایک اپنی نظم[1] "شام کی آمد اور رات کی کیفیت" سنائی۔ اور آئندہ مشاعرے کے لیے عنوان "برکھا رت" تجویز ہوا۔

پہلا مشاعرہ تیس مئی، ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا۔ اِس جلسے کے متعلق صرف دو شعرا کے نام ملتے ہیں۔ آزاد اور حالی۔ دوسرے مشاعرے کے لیے عنوان "زمستان" دے دیا گیا۔ پنڈت کیفی نے اپنے مضمون "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ" میں اِس مشاعرے کا تفصیلی حال لکھا ہے[2]۔ ان کے بقول اِس مشاعرے میں نو شعرا شریک تھے۔

"شاہ انور حسین ہما، مولوی مرزا اشرف بیگ خان اشرف،

---

[1] نظم آزاد میں اس مثنوی کا نام مثنوی موسوم بہ "شب قدر" لکھا ہے۔

[2] شائع شدہ منشورات۔

منشی الٰہی بخش رفیقؔ، مولانا آزادؔ، مولوی محمد مقرب علی رئیس جگراؤں، مولوی عمر جان ولیؔ، مولوی قادر بخش، مولوی عطا اللہ اور مولوی علاؤالدین محمد کاشمیری۔"

۳۔ مشاعرہ منعقدہ ۳ اگست ۱۸۷۴ء، مطبوعہ ضمیمہ نمبر ۲، ماہ جولائی بعنوان "امید" مشاعرے میں نو شعرائے کرام نے حصہ لیا:

"مولوی عمر جان ولیؔ، مولوی الطاف حسین حالیؔ، محمد مرزا بیگ، مرزا محمد عبداللہ بیگ، مرزا محمود بیگ راحتؔ، مولوی محمد حسین آزادؔ، مرزا اشرف بیگ شاہ انور حسین ہماؔ، مولوی عطا اللہ خان عطاؔ اور شیخ الٰہی بخش رفیقؔ"

۴۔ چوتھا مشاعرہ یکم ستمبر ۱۸۷۴ء مطبوعہ ضمیمہ ماہ اگست نمبر ۳، "حبِ وطن" کے عنوان سے منعقد ہوا۔ اِس مشاعرے میں ۱۲ شعرائے کرام نے حصہ لیا:

"مولوی عمر جان ولیؔ، پنڈت کرشن لال طالبؔ، مُلّا گل محمد محمد عالیؔ، مفتی امام بخش (رئیس دگالہ، فارسی)، انور حسین ہماؔ، شیخ الٰہی بخش رفیقؔ، مصر رام داس قابلؔ (فارسی) مولوی عطا اللہ خان عطاؔ، منشی علاءالدین صافیؔ، لالہ گنڈا مل، سید اصغر علی حقیرؔ لکھنوی، مولوی محمد حسین آزادؔ اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ۔

۵۔ پانچواں مشاعرہ ۹ اکتوبر ۱۸۷۴ء میں منعقد ہوا جس کی روئیداد ضمیمہ ماہ ستمبر، نمبر ۴ میں شائع ہوئی۔ اس کا عنوان "امن" تھا۔ اِس مشاعرے میں حصہ لینے والے شعرا مندرجہ ذیل ہیں:

"منشی لچھمن داس برہمؔ، مولوی گل محمد عالیؔ، مولوی شاہ محمد صادق الحسین شریفؔ (مہتمم اخبار "طلسم حیرت")، مدراس، مفتی امام بخش، مصر رام داس قابلؔ، (فارسی) مولوی محمد حسین آزادؔ

سید اصغر علی حقیرؔ اور مولوی سلطان علاء الدین صافیؔ، مولوی عطاء اللہ خان عطاؔ، اور مولوی عمر جان ولیؔ۔"

۶۔ چھٹا مشاعرہ ۱۴ر نومبر ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا جس کا عنوان "انصاف" تھا۔ اور جس کی کارروائی ضمیمہ ماہ اکتوبر، نمبر ۵ میں شائع ہوئی۔ اِس مشاعرے میں مندرجہ ذیل شعرا شریک تھے۔:

"مولوی فصیح الدین رنجؔ، مولوی محمد شریف (مہتمم "اخبار طلسم حیرت" مدراس)، مصر رام داس قابلؔ، (فارسی) منشی لچھمن داس برہمؔ، میر انور حسین ہماؔ، منشی اصغر علی حقیرؔ، ملا گل محمد عالیؔ، منشی الٰہی بخش رفیقؔ، مفتی امام بخش (رئیس بٹالہ، فارسی)، مولوی محمد عطاء اللہ خان عطاؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولوی محمد حسین آزادؔ اور پنڈت کرشن لال۔"

۷۔ ساتواں مشاعرہ منعقدہ ۱۹ر دسمبر ۱۸۷۴ء، ضمیمہ ماہ نومبر و دسمبر، نمبر ۶، بعنوان "مروت"۔ اِس مشاعرے میں حصہ لینے والے شعراء مندرجہ ذیل ہیں:

"ملا گل محمد عالیؔ، مولوی سلطان علاؤ الدین، مولوی محمد شریف، منشی لچھمن داس برہمؔ، مصر رام داس قابلؔ (فارسی)، مولوی عطاء اللہ خان عطاؔ، شیخ الٰہی بخش (رئیس بٹالہ)، سید اصغر علی حقیرؔ، مولوی عمر جان ولیؔ، پنڈت کرشن لال طالبؔ، مولوی محمد حسین آزادؔ، اور مولوی محمد سعید۔"

۸۔ آٹھواں مشاعرہ منعقدہ ۳۰ر جنوری ۱۸۷۵ء، ضمیمہ ماہ جنوری، نمبر ۷، بعنوان "قناعت"۔ اِس مشاعرے میں یہ شعرا شریک ہوئے:

"ڈاکٹر لچھمن داس برہمؔ، ملا گل محمد عالیؔ، مولوی سلطان علاؤ الدین صافیؔ، لالہ تارا چند (حلوائی)، لالہ دین دیال عاجزؔ طالب علم، شیخ مولا بخش بلندؔ، جوالا سہائے کائستھ خرمؔ

(طالب علم جماعت ہشتم)، مصر رام داس قابلؔ (فارسی)، میاں محمد حیات فیضؔ، میر انور حسین تمناؔ، مولوی عطا اللہ خان عطاؔ، شیخ الٰہی بخش رفیقؔ، سید اصغر علی حقیرؔ، مفتی امام بخش، مولوی محمد سعیدؔ، مولوی محمد حسین آزادؔ اور پنڈت جواہر لال۔

۹۔ نواں مشاعرہ "تہذیب" کے عنوان سے منعقد ہوا۔ ۱۳ر مارچ ۱۸۷۵ء اس مشاعرے کی تفصیلات فراہم نہ ہو سکیں۔

۱۰۔ دسواں مشاعرہ اخلاق کے عنوان سے تھا لیکن اس کے کوائف نہ مل سکے۔ شعرا میں صرف دو نام ہیں فیضؔ اور آزادؔ

بہر حال ان مشاعروں کو کسی نہ کسی طور ختم ہونا ہی تھا۔ ان کی ابتدا حکومت وقت کے اشارے سے ہوتی تھی۔ خود حاکمین وقت کو ان مشاعروں کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ گورنر جنرل نے برصغیر میں اور خاص طور پر انجمن پنجاب کی سرپرستی کی۔ انجمن کی کوششوں سے اورنٹیل کالج قائم ہونے کی زبردست جدوجہد ہو رہی تھی جس میں ڈاکٹر لائٹنر پیش پیش تھے۔ اس کالج کو یونی ورسٹی کا مرتبہ دینے کی جو پر زور سفارشات ہوئیں ان پر گورنر جنرل نے ڈاکٹر لائٹنر کو تہدیدی خط لکھا۔ دوسری وجہ یہ کہ خود وہ شعرا جو مشاعروں میں شریک ہوتے تھے انھیں مالی امداد کی توقع تھی۔ اگر مشاعروں کے قصیدوں اور بعض نظموں پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ شعرا کسی نہ کسی خاص توجہ کے متمنی تھے۔ لیکن شعرا کو پندرہ یا بیس روپے فی نظم مل جاتے تھے۔ داد و دہش کا یہ انداز ان شعرا کے لیے بالکل نیا تھا۔ انھیں توقع تھی کہ جس طرح زمانۂ قدیم میں شعرا کو جاگیروں اور خلعتوں سے نوازا جاتا تھا اسی طرح یہ حکومت بھی اسی داد و دہش کا مظاہرہ کرے گی۔ تیسرے یہ کہ آخری مشاعرے میں اور اس کے علاوہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو نظم میں طالب علموں نے بھی دل چسپی لینا شروع کر دی تھی جو کالج میں پڑھ رہے تھے۔ اور زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ پر ان

کی نظر تھی۔ غالب کے شاگردوں اور لکھنوی شعرا کو یہ بات ناگوار گزری اگرچہ وہ اردو نظم کے طرحی مشاعروں میں شریک تھے لیکن اس کے اِس حسن انجام کا ان کو اندازہ نہ تھا جس کا اندازہ طلبا مشاعرے میں کر چکے تھے۔ اِس کے علاوہ حکومت وقت سے مطابقت کے خیال سے اہل زوق جیسے کہ تارا چند حلوائی تھے۔ ان کا اور ان جیسے شعرا کی اِن مشاعروں میں شرکت لکھنوی اور دہلوی شعرا جنھوں نے اپنے استادوں کی آنکھیں دیکھی تھیں برداشت نہ کر سکے اور ان کے برابر بیٹھ کر اپنا کلام سنانا ہتک سمجھا۔ اِس کے علاوہ اِن مشاعروں میں حکومت وقت کے خلاف بھی اشعار پڑھے گئے۔ غدر کے قصے دھرائے گئے۔ رمز وکنایہ میں امن، حب وطن، قناعت کی سرپرستی کرنے والے انگریزوں پر یہ شعرا ایک طرف تو بھروسہ نہ کر سکے دوسرے ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔

یہی وہ زمانہ تھا جب سر سید نے ذریعہ تعلیم اُردو کی مخالفت کی۔ "تہذیب الاخلاق" اپنا کام کر رہا تھا۔ اردو والوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا اس علاوہ حالی جیسے بزرگ بھی سر سید کے ساتھ ان کی تحریک میں شامل ہوگئے۔ دوسری طرف ذاتی پرخاش کی بنا پر اکثر شعرا مولانا آزاد سے معاندانہ رویہ اختیار کرنے لگے اور مولانا آزاد تھے کہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اردو شاعری کو نئی راہ پر ڈال دیا جائے۔ لہذا تنہا ہی مقابلہ کرتے رہے۔ ایک وجہ اور سمجھ میں آتی ہے کہ ڈیوک آف ونڈسر کے آنے کی خبر تھی ان کی پیشوائی اور دہلی دربار میں رسائی حاصل کرنے کے لیے لوگ دہلی کی طرف دوڑ پڑے۔ اور پھر یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ڈاکٹر لائٹنز کو مستشرق ہونے اور قدیم وجدید علوم کے احیاء کے سزا میں خطابات یا خاص تمغہ سے سرفراز نہیں کیا گیا جس کی شکایت اخباروں میں کی گئی۔ غریب اور رئیس عزت دار شاعروں نے اپنی عافیت اِسی میں سمجھی کہ وہ کنارہ کش ہو جائیں۔ اور اِس طرح ان مشاعروں کا خاتمہ ہو گیا۔

ورنہ نہ تو حالی جیسے فرشتہ خصلت انسان ایسے تھے کہ وہ زندگی بھر آزاد سے

پر خاش رکھتے اور نا ہی آزاد باوجود اپنی آتش مزاجی کے ایسے کم ظرف تھے کہ ایسے عظیم مقصد سے منہ موڑ لیتے۔ ڈاکٹر لائٹنر کی بیماری، ان سے سنین اسلام کے سلسلے میں پرخاش، عالم بیٹی کا انتقال اور جاسوسی کا راز اپنے سینے میں دفن کئے آخر وہ شاعری جیسی نازک صنف سے علیحدہ ہو گئے۔ اور اپنی پوری صلاحیتوں کا اظہار نثر پر صرف کر دیا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے لکھا ہے:

"کہ انجمن پنجاب کو ان مشاعروں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

حالاں کہ انجمن پنجاب کے اراکین ہی نے ان مشاعروں کی بنیاد ڈالی پہلے شکسا سبھا اور پھر انجمن کے حال میں یہ مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ ان مشاعروں کے علاوہ اخبار "انجمن پنجاب" مشاعروں کے زمانے میں علیحدہ ضمیمہ شائع کر رہا تھا۔ جو "گلدستہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ اور دوسری ادبی نشستوں کی روئداد جو ہر ہفتہ منعقد ہوتی تھیں انجمن قصور کے رسالے میں شائع ہوتے تھے۔ لہذا انجمن پنجاب سے ان مشاعروں کو علیحدہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔"

..........×..........

مشاعروں کی روئیداد

انجمن پنجاب کے عنوانی مشاعروں نے جدید اردو شاعری کے لیے ایک ماحول پیدا کیا۔ یہ محض چند ذہنوں کی اختراع نہیں تھی، بلکہ سیاسی اور سماجی بدلتے ہوئے حالات کے احساس و شعور نے اسے پیدا کیا تھا۔ یہ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ایک کوشش تھی جس کو زندگی میں پیدا ہونے والے حالات نے وقت کی آواز بنا دیا تھا۔ آزاد کے ساتھ حالی بھی پنجاب کے مشاعروں میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق تھا اور لاہور میں مقیم تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے "انجمن پنجاب" نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا۔ اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی مشاعروں کا درو بست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہوگئی ہے اِس کو جہاں تک ممکن ہو سکے وسعت دی جائے اور اِس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے۔ جدت پسند طبقوں پر جس قدر مغربی انشاپردازی کی لے اب تک کھلی تھی وہی ان کے اڑی۔ بہت سے موزوں طبع اور بعضے کہنہ مشق بھی جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ چکا تھا۔ اِس مشاعرے میں شریک ہونے لگے۔ اگرچہ یہ صحبت مدت تک جمی رہی۔ راقم صرف چار جلسوں میں شریک

ہونے پایا تھا کہ بہ سبب ناموافق آب و ہوا کے لاہور سے
تبدیل ہو کر دہلی چلا آیا۔ مجھے مغربی شاعری کے اصول سے نہ
اِس وقت تک کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ نیز میرے
نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی نامکمل
زبان میں جیسی کہ اُردو ہے ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ تو میری
طبیعت مبالغہ اور اغراق سے بالطبع نفوذ تھی اور کچھ اِس
نئے چرچے نے اِس نفرت کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ اِس بات
کے سوا میرے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے انگریزی
شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام
عائد ہو......" [۱]

حالی کے یہ خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ انھیں "انجمن پنجاب"
کے مشاعروں سے نسبت تھی وہ خود اِس تحریک میں شریک تھے۔ لیکن وہ مغربی
شاعری کے تتبع کے قائل نہیں تھے۔ انھیں اپنی شعری روایات بھی عزیز تھیں۔ اِس
لیے انھوں نے نئے اثرات قبول کرنے اور نئی تحریک میں شامل ہونے کے باوجود اپنی
روایات سے چشم پوشی نہیں کی۔ یہ صورت حال ان کے صحیح فن کارانہ اور صحت مند
تنقیدی شعور پر دلالت کرتی ہے۔ اِس کا اثر یہ ہوا کہ "انجمن پنجاب" کے ہاتھوں جس
جدید شاعری کا آغاز ہوا۔ اِس میں انتہا پسندی شامل نہ ہو سکی۔ توازن اور اعتدال
کا دامن اِس نے اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ ہمیشہ اپنے حدود ہی میں رہی یہی
سبب ہے کہ اُردو شاعری کو جدّت سے ہم کنار کرنے میں اِس کا بڑا حصہ ہے۔

"انجمن پنجاب" کے مشاعروں میں آزادؔ اور حالیؔ کو بڑی اہمیت حاصل تھی اِس
زمانے میں آزادؔ اور حالیؔ نے بعض اہم نظمیں لکھیں۔ حالیؔ کی اِس زمانے کی اپنی نظمیں

---

[۱] عبادت بریلوی۔ ڈاکٹر "جدید اُردو شاعری"، "اردو دنیا"، کراچی: ص ۱۴

اُردو شاعری کے اِس نئے موڑ کی نشاندھی کرتی ہیں۔ ان کے موضوعات نئے ہیں ان میں ایک نیا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ ایک نئے شعور کی ترجمان ہیں۔ اِن میں نئے حالات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اِن میں ایک نیا انداز نمایاں ہے۔ یہ ایک نئے اسلوب کی حامل ہیں۔ ان کی ہیئت اور صورت بھی نئی ہے ایسی نظمیں اِس سے قبل اُردو میں نہیں لکھی گئیں۔ اس لیے جدید شاعری میں آج بھی انھیں سنگ میل کا مرتبہ حاصل ہے۔

انجمن کے اِن مشاعروں نے اِس بات کا احساس دلادیا کہ اب ہمیں شاعری کو نئے راستوں پر ڈالنا ہوگا۔ افادیت اور علمیت کا جوش اِس میں پیدا کرنا ہوگا۔ اِس مقصد کے لیے غزل کافی نہیں چناں چہ نئے اصناف کی طرف بھی انھوں نے توجہ دلائی۔ مغربی اثرات کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے تحریک کی شکل عطا کی۔ اِن میں مبالغہ، انفعالیت، حزن و یاس اور قنوطیت کے بجائے حقیقت واقعیت، زندگی اور جولانی، رجائیت اور مسرت کو پیش کیا جانے لگا۔ اور لوگوں کو یہ احساس پیدا ہوگیا کہ شاعری اب محض تفنن طبع کے لیے نہیں بلکہ اسے عظیم مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سیاسی نقطہ نظر سے بھی ان مشاعروں کی بڑی اہمیت ہے، برصغیر کے سیاسی اور سماجی حالات پچھلے صفحات میں درج کئے گیے ہیں اِس کی تفصیل کی اس وقت ضرورت نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل ہند کے سامنے ازسرنو زندگی شروع کرنے کے لیے صرف دو صورتیں باقی تھیں۔ یا تو وہ اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے انگریزوں سے نبرد آزما ہوتے یا پھر نئے حالات سے مطابقت پیدا کرلیتے۔ اہل ہند مطابقت کے لیے کمربستہ ہوچکے تھے۔ "انجمن پنجاب" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس نے نظم و نثر کے ذریعہ

عوام کے اذہان کو اِس مطابقت کے لیے آمادہ کرلیا۔

دوسری طرف انگریز خود تعلیم کو عام کرنے کے لیے نئے نصاب تیار کرنے کی فکر میں تھے۔ اِس کا مقصد چاہے کچھ ہو لیکن انھوں نے انجمن کی سر پرستی میں اِن مشاعروں کے ذریعہ حصّہ نظم کو استوار کر کے نئے نئے ذہنوں کو نئی راہوں پر ڈال دیا۔ دوسری طرف سرسید خود بھی اردو کے زبردست حامیوں میں سے تھے انھوں نے بھی اپنے خطوط کے ذریعہ انجمن کے مشاعروں اور انجمن کی کارروائیوں کو سراہا۔

سرسید کی اصلاحی تحریک اگرچہ شروع ہو چکی تھی لیکن اس نے قوت اسی وقت حاصل کی جب انجمن کی کارکردگی نے یہ ماحول تیار کیا۔ آزاد کے علاوہ عناصر خمسہ نے جو کچھ تبدیلیاں اُردو ادب میں پیدا کیں اگر غور کیا جائے تو ان کے ذہن یقیناً انجمن کے ان مشاعروں سے اور زیادہ ہموار ہو گئے۔ اور ادب کو افادیت کے تصور سے آشنا کرنے والے یہی لوگ تھے۔ ان میں حالی کا نام سرفہرست ہے جو مشاعروں کی افادیت سے مکمل طور پر آشنا ہوئے۔ اگرچہ وہ خود پہلے سے مبالغہ آرائی اور گل و بُلبل کے افسانوں سے بے زار تھے۔ لیکن مشاعروں نے اِن کے خیالات میں ایسا نکھار پیدا کیا کہ مدو جزر اسلام جیسی معرکتہ الآرا مسدس معرضِ وجود میں آئی۔

لاہور کے قیام کے زمانے ہی سے حالی ترجموں کے ذریعہ انگریزی خیالات اور اُردو میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت کو محسوس کر چکے تھے۔ لہٰذا مقدمہ شعرو شاعری میں یورپی ناقدین کا ذکر انھوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔ سرسید کے ساتھ ان کی تحریک میں شامل ہو کر انھوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے۔ کہ جن کی مثال اردو ادب میں ملنی مشکل ہے۔ ان کی تحریر میں یہ دلائل اور افادیت انجمن کی مرہونِ منت ہے۔

اِسی طرح شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد سرسید کی سرکردگی میں اردو ادب میں گراں

قدر اضافہ کر گئے۔ اگر ان کڑیوں کو ملایا جائے۔ تو اندازہ ہوگا کہ انجمن کے ان مقصدی مشاعروں نے ان کے ذہنوں کو براہ راست متاثر کیا اور اردو ادب میں انھوں نے اپنے لیے ان نئی راہوں کا تعین کیا جن کے ذریعے برصغیر میں اور خاص طور پر مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوگئی۔ انھوں نے سیاسی حالات کا بغور مطالعہ کر کے زندگی کے لیے اصول مرتب کیے۔

انگریزوں نے اِس موقعہ پر پوری پوری مفاہمت کی انجمن پنجاب میں کرنل ہالرائیڈ ڈاکٹر ولز اور ڈاکٹر لائٹنز جیسے مستشرقین نے قدیم اور جدید ادب کو ہم آہنگ کرنے میں ادبا کا پورا پورا ساتھ دیا۔ خاص طور پر ڈاکٹر لائٹنز نے اِس کے لیے حکومت وقت سے اتنی جد و جہد کی کہ ان کو تہدیدی خط لکھے گئے۔[1]

انجمن کے ان مشاعروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں وہ انگریز شریک تھے جن کا تعلق شعبۂ تعلیم سے تھا۔ لہٰذا تعلیم اور نصابی کتب کے سلسلے میں ان لوگوں نے انجمن کی پوری پوری حمایت کی۔ یہ مشاعرے نصابی کتب کے حصّہ نظم کو مرتب کرنے کے سلسلے میں منعقد کیے گئے تھے۔ لیکن اس کے اثرات بڑے دور رس نکلے۔ پورے برصغیر میں مقصدی نظم گوئی رواج پا گئی جس میں ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

شبلی اگرچہ حالی کے مرتبہ کے شاعر نہیں لیکن انھوں نے بھی مختلف سیاسی، سماجی اور فنی اور تہذیبی موضوعات پر قلم اٹھایا ان کی تمام نظمیں ایک مخصوص مقصد سے افادیت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ جن میں اجتماعی شعور ملتا ہے۔

. . . .+. . . . .

---

[1] اورنٹیل یونی ورسٹی کے باب میں اِس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

باب ششم

انجمن کے تنقیدی مقالات

آزاد کے مقالات

باب ششم

انجمن کے تنقیدی مقالے

(آزاد کے مقالات)

سرسید :

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد دہلی کے شرفا اور اہل قلم جس کا جدھر منہ اٹھا نکل گئے۔ حالی کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں لاہور بک ڈپو میں اِن کتابوں کی زبان کی تصیح کرنے کا کام مل گیا جو انگریزی سے ترجمہ ہوتی تھیں۔ مولانا حالی اپنی شاعری کے ابتدائی دور ہی سے مبالغہ اور تصنع سے بے زار تھے۔ غالب اور شیفتہ کی صحبت نے ان کے اِس خیال کو ثبات بخشا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون سی کتابیں تھیں جن کی زبان کی تصیح مولانا حالی نے کی لیکن اس زمانے نے جو اثرات، ان کی ذہن پر مرتب کیے وہ بڑے دور رس تھے۔

پورے ہندوستان میں اِس وقت جگہ جگہ انجمنیں قائم ہو رہی تھیں جن کا تذکرہ گارسین دتاسی نے اپنے خطبات اور مقالات میں کیا ہے۔ نظم اور نثر کی جدت پر مخالفتیں بھی ہو رہی تھیں اور لوگ اِس کے ہم نوا بھی تھے۔ "انجمن پنجاب" کے مشاعرے اِس بات کی دلیل ہیں کہ نظم پر کڑی تنقید کی وجہ سے اور مولانا آزاد کی جدت پسند طبیعت نے تنقید کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا اور انھوں نے "انجمن پنجاب" کے مشاعروں کی بنیاد رکھی اور اپنے پہلے خطبے میں انھوں نے شعرا کی اصلاح پر بڑی مدلل بحث کی۔ اور اُردو شاعری میں ایسے درخشاں

مستقبل کی نشان دہی کی جس کے نتیجے میں جدید اردو شاعری کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ نظم کے سلسلے میں یہ تجربہ کی حیثیت رکھتے ہیں یہ تجربہ اتنا کام یاب ثابت ہوا کہ اردو نظم کی کایا ہی پلٹ گئی۔[1]

اسی طرح نثر میں بھی بڑے کام یاب تجربے کیے گئے۔ رسالہ "انجمن پنجاب" اگرچہ "انجمن پنجاب" کی کارروائیوں کو عوام تک پہنچانے کے سلسلے میں جاری کیا گیا تھا لیکن اس پرچے کی زبان بھی اتنی آسان اور جلسوں کی کارروائیوں کا اندراج اس طریقے سے کیا گیا ہے کہ تصنع اور بناوٹ کا کہیں دور دور پتا نہیں۔ اس کے علاوہ اس پرچے میں جو مضامین شائع ہوتے۔ ان کی زبان و بیان دیکھ کر حیرت اس لیے نہیں ہوتی کہ لوگ اس انقلاب کے نہ صرف متمنی تھے بلکہ کوشاں تھے۔ اسی پرچے میں چھوٹے بڑے مضامین اور مقالے لکھے گئے۔ اسی پرچے میں مولانا آزاد نے اپنی مختلف تنقیدی کتابوں کی داغ بیل ڈالی۔ اسی پرچے میں حالی کی سادہ، پرکشش، درد انگیز، صاف ستھری زبان میں عنوانی مشاعروں کی نظمیں شائع ہوئیں۔ مقبول عوام و خواص ہوئیں اور جدید اردو شاعری کا یہ تجربہ کام یابی سے بڑھ کر سنگ بنیاد بن گیا۔

"انجمن پنجاب" کی مقبولیت اس کے مشاعرے اور مضامین کو پڑھ کر خود سر سید بے حد متاثر ہوتے اور یہ مشورہ دیا۔

[2] یہ مثنویاں آب زلال سے زیادہ خوشگوار ہیں بیان میں، زبان میں آمد ہیں، الفاظ کی ترکیب میں صفائی و سادگی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھ جاتی ہیں ہاں یہ بات سچ ہے کہ ہمارے ان باعث افتخار شاعروں کو ابھی نیچے کے میدان میں پہنچنے کے لیے آگے قدم اٹھانا ہے۔ اور اپنے اشعار نیچرل پوئٹری کا

---

[1] آزاد، محمد حسین، "نظم آزاد"، لاہور: لکشمی مینشن، دی مال، ۱۸۹۹ء، ص ۴۱

[2] "تہذیب الاخلاق"، علی گڑھ: ، ج دوم، ص ۵۵۶

کے ہم عصر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے۔ مگر اِن مثنویوں کو دیکھنے سے اتنا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ اور اس کا بھی تصور ہو سکتا ہے۔ کہ اگر ہماری قوم اِس عمدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ رہے اور ملٹن اور شیکسپیئر کے خیالات کی طرف توجہ فرماتے اور مضامین عشقیہ اور مضامین خیالیہ اور مضامین بیان واقعہ اور مضامین نیچر میں جو تفرقہ ہے اس کو دل میں بٹھلاتے تو اِن بزرگوں کے سبب ہماری قوم کی لٹریچر کیسی عمدہ ہو جائے گی۔

سرسید کا یہ مشورہ بجائے خود ایک تنقید ہے اور اِن عملی تنقیدوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سچی انشاپردازی وہ ہے جو سننے والے کی سمجھ میں فوراً آجائے دوسرے شرط یہ ہے کہ اِس میں جو مضمون ادا ہو سچائی اور خلوص پر مبنی ہو یعنی جو کچھ دل میں ہو وہی زبان و قلم اور صفحۂ کاغذ پر منعکس ہو اور اِن خیال آرائیوں سے اجتناب کیا جائے جن سے تصانیف پرانے ادیبوں کی کتابیں نظر آنے لگیں۔ سرسید نے صنائع و بدائع کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا اِسی طرح سرسید نے اصناف نثر و نظم کے متعلق بھی تنقیدی نظریات ہمیں دیئے۔

سرسید کے اسلوب نگارش میں پانچ چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بے ساختگی اور بے تکلفی، مدعا نگاری، اجتماعیت اور جمہوریت اور وہ جوش جس میں اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے جو ان کے تمام اسالیب پر حاوی ہے۔ سرسید مدعا نگاری اور مقصد نویسی کے بڑے علم بردار تھے انھوں نے مقصد بیان کرنے اور مدعا پر نظر رکھنے کو ثانوی حیثیت دینے اور مضمون پر اصل توجہ صرف کرنے کے اصول پر عمل روا رکھا۔

مولانا حالی نے حیات جاوید میں خوب لکھا ہے:

"سرسید کی تحریروں میں بے رنگی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، بے قرارانہ لکھا ہے اور وہ یوں ہی ہے کہ کسی

شخص کے گھر میں آگ لگ گئی ہو تو وہ لوگوں کو پکارے کہ آؤ اس آگ کو بجھاؤ، اس میں الفاظ کی ترتیب فقروں کی ترتیب کا خیال نہیں ہوتا کیوں کہ ان کے پاس ایک دعوت تھی اس دعوت کو دینے کے لیے انھیں جو بھی الفاظ ملے بیان کر دیئے۔[1]

مولانا حالی:

مولانا حالی کا لاہور میں قیام کا زمانہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ نہ صرف نظم کے نئے موڑ میں معاون و مددگار ثابت ہوتے بلکہ نثری کم زوریوں سے بھی کماحقہٗ واقف ہو گئے۔ گویا دوسرے معنوں میں لاہور کا قیام حالی کے نئے رجحانات کی توفیق کا زمانہ ہے۔

"اس[2] میں کوئی شبہ نہیں کہ آزاد پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۵ر اگست، ۱۹۶۸ء میں لاہور میں انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نئی شاعری اور انگریزی انشاپردازی کے متعلق لیکچر دیئے اور نئی شاعری کو پرکھنے کے جدید نظریے پیش کئے۔ سرسید نے بھی تنقید ادب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تو یہ کہنا درست ہو گا کہ جدید تنقید کے ابتدائی نقوش حالی اور آزاد سے پہلے سرسید کی تحریروں میں تھے۔ مگر ان باتوں کے باوجود یہی نتیجہ درست ہے کہ حالی تنقید جدید کے بانی تھے۔"

مقدمۂ شعر شاعری میں تنقید کے دو حصے ہیں۔ ایک نظریات اصول اور دوسرا عملی تنقید کے نمونے۔ حالی نے ترجموں کی تصحیح کے ذریعہ انگریزی تنقید سے بڑا فائدہ اٹھایا خصوصاً "شعر کی ماہیت" کے سلسلے میں "سوسائٹی کا شعر پر اثر اور شعر کا سوسائٹی پر اثر" یہ وہ نظریات ہیں جو حالی کے دور میں مغرب میں مروج تھے

---

[1] حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۷۹ء (طبع جدید)، ص:

[2] ایضاً، ص:

لیکن ایک حصہ خالص طبع زاد ہے جہاں اُردو شاعری کی اصناف کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ وہ اصناف ہیں جن کے عیب و صواب کو سمجھنے کے لیے حالیؔ کے فطری تفکر نے کام کیا مثلاً غزل، قصیدہ وغیرہ کی تنقید۔ حالی کا یہ صنفی مطالعہ اُردو تنقید میں نئی اور پہلی چیز ہے۔ اپنی شاعری کی صنفوں کے اندر ڈوب کر انھیں معاشرے کی روشنی میں دیکھنا بھی ایک بڑا عطیہ ہے۔

حالیؔ کے اسلوب بیان میں چار عناصر خصوصیت رکھتے ہیں:

۱۔ سادگیِ بیان: مطالب کو سادہ طریقہ سے سادہ الفاظ میں سادہ تجزیے کے ساتھ پیش کرنا۔

۲۔ بے ساختگی اور بے تکلفی۔

۳۔ مدعا نگاری: اِس سے مراد ہے کہ نثر نگار زبان و آرائش و زیبائش کو اہمیت دینے کے بجائے مدعا اور مطالب پر نظر رکھے اور اسے اولیت دے۔ یہ ظاہر ہے کہ مدعا اور مطلب اپنے اسلوب اور اسٹائل کو خود ایجاد کرتا ہے۔

۴۔ عقلیت اور اس کے تقاضے کے طور پر اس کے سانچے میں منطبقت کا ہونا۔

مولانا حالیؔ اردو ادب کے اہم نقاد تھے انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں شاعری کے بنیادی اصولوں پر غور و فکر سے کام لیا ہے۔ مغربی خیالات سے استفادہ حاصل کیا ہے حالیؔ اُردو تنقید کے بانی اور بہترین نقاد ہیں۔ انھوں نے اپنی تنقید میں جن مطالب و مباحث کو پیش کیا ہے، اس سے حالی کی دقت نظر، فکر، علمی دستگاہ، فنی بصیرت اور پختہ تنقیدی شعور کا پتا چلتا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری مشرقی علوم و ادبیات اور ادبی روایات سے گہری واقفیت کی دلیل ہے۔ انھوں نے مغربی تنقید سے جو کچھ حاصل کیا اس کو

بڑے سلیقے سے برتا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری کے مطالب و مباحث سے ہٹ کر جب ہم اس کی زبان و بیان پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حالیؔ نے اُردو تنقید کو جو زبان، انداز بیان اور لب و لہجہ عطا کیا ہے اس کی حیثیت آج تک مثالی ہے۔ وہ زبان میں غیر معمولی آرائش و زیبائش سے کام نہیں لیتے لفاظی اور عبارت آرائی سے اجتناب برتتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ بے رنگ اور بے لطف زبان بھی نہیں لکھتے۔ ان کی تحریر میں حقیقی و ادبی چاشنی ہے اور سچی ادبی شان ہے متین و خوش گوار لہجہ ہے، سنجیدگی و شگفتگی ہے۔ یہ مقدمہ زبان و انداز بیان کی ساری لطافتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوتے ہے۔

آزاد:

آب حیات: ادیب کے ماحول اور حالات کے وسیع پس منظر اور اس کی فنی تخلیقات کے درمیان صحیح رشتہ قائم کرکے ہمیں جو چیز باقی چیزوں پر غالب اور حاوی نظر آتی ہے۔ وہ نقاد کی ذاتی پسند، رائے اور ذاتی مزاج کا عکس ہے یہی کیفیت آزاد کی تنقید کی ہے۔ جو انھوں نے "آب حیات" میں ہمودی ہے۔ جس میں آزاد نے شخصی رنگ پیدا کر دیا ہے۔ اِس شخصی رنگ اور شخصی مزاج کی سب سے بڑی اور حقیقت میں بنیادی خصوصیت اِس کی مشرقیت ہے جس کی وجہ سے "آب حیات" مشرقی مزاج کا بے نظیر اور بے مثال نمونہ بن گیا ہے۔ لیکن اِس مشرقیت کے باوجود پہلا منظم، مربوط اور کئی حیثیتوں سے سائنٹی فک تذکرہ جس میں ماحول، شخصیت اور تخلیق کے باہمی اور لابدی رشتے کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ پہلی مرتبہ خیال اور بیان سے ناگزیر تعلق میں دونوں کے صحیح مرتبے اور حیثیت کی صراحت کی گئی ہے۔ زبان، اسلوب اور خیال تینوں چیزوں کو مربوط کرنے کے باوجود ان کے ارتقاء کا ایک ایسا تصور پیش کیا ہے کہ تین الگ الگ مرقعے پڑھنے والے کے سامنے آجاتے ہیں اور شاعروں کی انفرادی

خدمات کا جائزہ خود ان کی حدود اور ماحول آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

آزاد نے اردو شاعری کے مختلف ادوار کا عہد بہ عہد جائزہ لیتے ہوئے اور شاعری کی نشوونما میں اس کی ارتقائی منزلوں کو سامنے رکھتے ہوئے شاعروں کی انفرادی ادبی خدمات کے متعلق جو کچھ کہا ہے۔ اس میں برائی اور بھلائی دونوں کو مدِ نظر رکھ کر مستقبل کے متعلق حکم لگایا ہے۔ اور یہ دکھایا ہے کہ شاعروں کی انفرادی تخلیقات اور ان کے خاص دور کے مشاعروں کی اجتماعی مساعی سے ادب و شعر کے علاوہ معاشرتی اور قومی زندگی پر کیا کیا اثرات پڑے ہیں۔ اس تبصرے اور تنقید میں اصناف کے مخصوص مزاج، مشاعروں کے انفرادی مزاج اور پھر معاشرتی زندگی اور قومی روایات کے مجموعی مزاج کی خصوصیتوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور ان سب حقیقتوں میں منطق و استدلال اور تاویل و توجیح دونوں کا بڑا صحیح، متوازن اور لطیف امتزاج بھی ہے اور ایسے اخلاق کی پیروی و پابندی بھی جو ہر جگہ اپنی ذاتی پسند اور ذوق اور اس ذوق کے جذباتی و تاثراتی اشاروں کو اپنا رہنما بنا کر بھی دوسروں کی رائے کو احترام کی نظر سے دیکھتا اور اس کے رد و قبول میں حسن توازن سے کام لیا ہے۔ آزاد کی تنقید اور اس کے مزاج کے اس رخ کے مطالعے میں بھی پڑھنے والے کے لیے ایک خوش گوار اثر اور سبق موجود ہے۔

"آب حیات" کا قابل قدر وصف اسلوب انشا پردازی ہے۔ آزاد کا اسلوب تحریر "آب حیات" کی سب سے اہم خوبی اور کم زوری دونوں ہے۔ وہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ دل چسپ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کے مختلف حادثات انجمن سے وابستگی، تعلیمی مصروفیات غیر ملکی سیاست، مذہب سے دل چسپی اور جذب و جنون کی کیفیت ادبی مورخین اور نفسیاتی تنقید کے ماہرین کے لیے وافر مواد مہیا کرتے ہیں۔

غرض کہ مولانا محمد حسین آزاد نے "انجمن پنجاب" کی مجالس میں "آب حیات" قسط وار پیش کرنا شروع کر دی تھی اور یہ اُردو زبان کی پہلی تاریخ تھی جس نے ہمیں حسب ذیل امور سے روشناس کرایا :-

۱۔ لسانی تحقیق کا راستہ دکھایا۔

۲۔ اردو زبان نے فارسی انشا پردازی سے جو فائدے اٹھائے ان کا اعتراف کرتے ہوئے اِن نقصانات کی طرف "آب حیات" ہی نے سب سے پہلے توجہ دلائی جو فارسی کی رنگینی اور تخیلی انشا پردازی کی تقلید سے اردو زبان کو پہنچے۔ تنقید میں سادگی اور اصلیت کی خوبیاں پیدا کیں اور بھاشا کے سادہ ۔ فطری اور پر زور انداز بیان سے مقابلہ کر کے اُردو نثر کی اصلاح کی ضرورت سمجھائی اور بھاشا اور فارسی انشا پردازی کو سمو کر ایک نیا اور بے نظیر طرز پیش کیا۔

۳۔ اردو نثر کی طرح اُردو شاعری کی اصلاح میں بھی "آب حیات" کا بہت کچھ حصّہ ہے۔ اُردو شاعری اور خاص طور پر اُردو غزل کے نقائص کی طرف پہلے آزاد ہی نے توجہ دلائی۔

۴۔ "آب حیات" میں آزاد نے سب سے پہلے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ شاعری کو محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ بلکہ اِس سے سماجی اور سیاسی نظام کی اصلاح یا تبدیلی کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔

۵۔ "آب حیات" ایک طرف اردو شاعری کی تاریخ کا ارتقا پیش کرتی ہے تو دوسری طرف ہماری سوسائٹی بالخصوص اِس کے علمی و ادبی پہلو کا ایسا مکمل نقشہ دکھاتی ہے جس کی مثال کوئی دوسری تصنیف پیش نہیں کر سکتی۔

"آب حیات" کے سلسلے میں آزاد پر ایک عام اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آزاد نے ذوق کو غالب پر ترجیح دے کر بڑی ناانصافی کی ہے۔ بے شک آزاد

کو ذوق سے بڑی عقیدت تھی اور بہت محبت تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کے اردو کلام میں بیشتر اشعار ایسے تھے جن میں اغلاق و ابہام کا عیب تھا، ان کو خارج کر دینے کے بعد ان کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ مرتب کیا گیا۔ اس منتخب مجموعے میں بھی بہت سے شعر ایسے ہیں کہ جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے اور اسی لیے اب تک اس کی دس بارہ شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ آزاد نے حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے لکھا ہے:

اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجہ رفعت پر واقع ہوتے ہیں کہ ہمارے رسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔"[1]

لیکن ذوق کے کلام سے متعلق آزاد نے جو کچھ لکھا ہے اس کا اندازہ قاضی امیر صاحب امیر بدایونی کے ایک طویل مقالے "بہترین غزل گو" سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے "آب حیات" سے اخذ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

[2] اس محترم ہستی نے ملک الشعرا اور خاقانی ہند کے القاب سے دنیائے شاعری میں شہرت پائی۔ سودا اور میر کے بعد غزل اردو کو بلند سے بلند درجے پر پہنچا دیا مشکل سے مشکل مضمون کو اس آسانی سے کہہ دیا کہ دشوار پسند طبیعتیں آج تک حیران ہیں بندشوں میں صفائی کا رنگ دکھایا، مشکل اور سخت قوافی کو اس خوبی سے اپنی جگہ بٹھایا کہ تعقید بھی جو ایسے قوانی کو نظم کرنے میں لابدی ہے بھلی معلوم ہونے لگی۔ ضرب الامثال کے سانچے میں ڈھال کر اپنے کمال کو ثابت کیا۔ فارسی ترکیبوں سے بھی نظم اردو کو زینت دی۔ عشق و حسن اور درد و محبت، تصوف، قدرت، موت و حیات کے

---

[1] آزاد، مولانا محمد حسین، "آب حیات"، لاہور: ، صص ۱۶-۵۱۵

[2] امیر بدایونی، قاضی امیر، "بہترین غزل گو"، صص ۴-۳

مضامین سے غزل کے چمن کو سجا کر دنیائے شاعری میں سیر و تفریح کا سامان مہیا کر دیا۔ اس عہد کے ارباب سخن نے قدر و منزلت کی اور آج تک منصف مزاج، اعتراف کرتے ہیں کہ ذوقؔ اقلیم سخن کا مالک اور غزل اردو کا بادشاہ ہے اس کے کلام نے کبھی الفاظ کی مناسب نشست و برخاست سے سہل ممتنع کا درجہ حاصل کر لیا کبھی مضامین کی ندرت سے محال کو ممکن کر دکھایا۔"

یہاں حسرت موہانی کا ایک قول اور قلم بند کیا جاتا ہے جو انھوں نے آزادؔ کے مرتبہ دیوان کے متعلق لکھا ہے:

غالبؔ کے ہم عصروں میں استاد ذوقؔ سب سے زیادہ محتاط ہیں اور صرف اردو شاعری کے لحاظ سے ذوقؔ کا درجہ غالبؔ سے بلند ہے۔" [۱]

ذوقؔ کی غزل گوئی کو اجاگر کرنے میں آزادؔ کا بہت بڑا حصّہ ہے کہ انھوں نے ذوقؔ کے اشعار اس طرح مرتب کئے کہ ان کی تمام تر خوبیاں پوری طرح عیاں ہو گئیں۔

............+............

---

[۱] حسرت موہانی، فضل الحسین" آج کل"، دہلی: ۱۵ اکتوبر، ۱۹۴۲ء

باب۔ ہفتم

انجمن کی لسانی خدمات

باب۔ ہفتم

انجمن کی لسانی خدمات

جیساکہ ”انجمن پنجاب“ کے قیام اور اس کے مقاصد کے باب میں تحریر کیا جا چکا ہے۔ انیسویں صدی میں انگریزوں نے یہ تحریک شروع کی تھی کہ جگہ جگہ بڑے بڑے شہروں میں ایسی انجمنیں قائم کی جائیں جس میں اعلیٰ حکام کے علاوہ روسا، امراء، ادیب اور اہل اثر پورا حصّہ لیں اور ان کے ذریعہ عوام میں جو بے اطمینانی کی مستقل کیفیت پیدا ہو گئی تھی اِن انجمنوں کے ذریعہ اِس کو ختم کیا جا سکے۔

”انجمن پنجاب“ بھی حکومت کے اشارے پر قائم کی گئی تھی۔ اس وقت پنجاب میں کرنل ہالرائیڈ خود بھی ایک مستشرق تھے انھوں نے ڈاکٹر لائٹنز کو ”انجمن پنجاب“ کا سربراہ مقرر کرنے کی تحریک شروع کی۔ ڈاکٹر لائٹنز اور ڈاکٹر ولز جو صحیح معنوں میں مقامی زبانوں میں دل چسپی لیتے تھے۔ اور اردو زبان سے ان کو خاص لگاؤ تھا ان لوگوں کی مساعی جمیلہ سے انجمن کی کارکردگی شروع ہوئی۔ اس زمانے میں لاہور میں سرکاری بک ڈپو قائم ہو چکا تھا مولانا حالی انگریزی سے اُردو کی ترجمہ شدہ کتابوں کی تصحیح کر رہے تھے۔ اِس کے علاوہ مولانا آزاد وہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر لائٹنز نے اس جوہر قابل کو چن لیا۔ فطرت نے آزاد کو ادب و زبان سے ایک فطری لگاؤ بخشا تھا۔ ان کے ذوق کی تکمیل کا اس سے بڑھ کر اور کون ذریعہ ہو سکتا تھا! وہ انجمن کے کاموں میں غرق ہو گئے۔

۲۱ جنوری، ۱۸۶۵ء کو انجمن قائم ہوئی۔ اِس کا مقصد ہی احیائے علوم مشرقی تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر اور ڈاکٹر ولنز کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ مقامی زبانیں یا پراکرتیں اِس وقت تک ترقی نہیں کر سکتیں جب تک کہ ان کی اصل تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی زبانوں کو زندہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر انھیں فارسی عربی اور سنسکرت کی تعلیم نہ دی گئی تو وہ اپنے ثقافتی ورثے سے محروم ہو کر تہذیب اور اخلاقی قدروں سے نابلد ہو جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اورنٹیل کالج کے ابتدائی نصاب پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے تک اردو پڑھنے والے کے لیے لازمی تھا کہ وہ فارسی اور عربی زبان پر عبور حاصل کرے۔ اِسی طرح ہندی پڑھنے والوں کے لیے سنسکرت پڑھنے کی شرط لازمی تھی اسی طرح طلبا اپنے اِس تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے واقف ہو گئے جو ہندو اور مسلمانوں کے ملے جلے تمدن و معاشرت سے پیدا ہوا تھا۔

"انجمن پنجاب" نے اِس سلسلے میں نثر اور نظم دونوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ہر ہفتے انجمن پنجاب کے جلسۂ خاص اور ہر مہینے میں ایک یا دو جلسے عام منعقد ہوا کرتے تھے۔ اِس انجمن کی ممبر سازی بھی ادبی ذوق پر کی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر وہ شخص جو ادبی ذوق رکھتا تھا چاہے وہ انگریز کمشنر، رئیس، امیر، ادیب، شاعر، ڈاکٹر، استاد یا طالب علم، کاروباری جاگیردار، زمیندار جو بھی ہو اس کا ممبر بن سکتا تھا اور جلسوں میں شریک ہو سکتا تھا۔

جب "انجمن پنجاب" قائم ہو گئی۔ اور اورنٹیل یونی ورسٹی کے قیام کے لیے حکومت وقت سے خط و کتابت ہونے لگی۔ تو نصاب کی ضرورت پیش آئی۔ نثر میں تو ایک حد تک سرمایہ موجود تھا۔ لیکن وہ بھی قصہ کہانی تک محدود تھا۔ لیکن حصہ نظم نصاب کے لیے قطعی ناموزوں تھا۔

نثر کے لیے سب سے پہلے اِن عنوانات کو چنا گیا جن کا تعلق مذہب زبان، اخلاق، اور تہذیب سے تھا۔ لہٰذا انجمن کے جلسوں میں بڑے اہم

مضامین پڑھ کر سنائے گئے۔ جن میں دختر فروشی، دروغ گوئی، اخلاق، تہذیب سے متعلق مضامین پڑھے گئے۔ اِس کے علاوہ جو سب سے اہم کام تھا وہ زبان سے متعلق تھا۔ اگرچہ نمونتاً انشاؔ، میر امنؔ، غالبؔ اور رام چندر وغیرہ کی تصانیف موجود تھیں لیکن یہ محض نمونہ تھیں۔ ان کی زبان سے اب تک وہ لسانی خدمات نہیں لی گئی تھیں جن کی زمانے کو ضرورت تھی۔ لہذا سب سے پہلے مولانا آزادؔ نے اپنا مقالہ ۱۸۶۷ء میں کلام موزوں پڑھ کر سنایا۔ اور ساتھ ساتھ قدیم اُردو شعرا پر تنقید بھی شروع کی۔

یہ طرزِ تحریر اگرچہ نیا نہ تھا لیکن اِس سے اردو زبان کا بنیادی کام نہیں لیا گیا تھا۔ مولانا آزادؔ نے "آبِ حیات"، "سخن دانِ فارس"، "نیرنگِ خیال" اور ڈاکٹر لائٹنر نے "دردستان" اور "سنین اسلام" لکھ کر ایک نئی طرح کی بنیاد ڈالی۔ گویا لسانی اعتبار سے زبان کو صرف اِس قابل ہی نہیں بنایا کہ وہ تمام مضامین پیش کر سکتی ہے۔ بلکہ اپنی تحریروں اور ان کی مقبولیت کے زیرِ اثر اس کا ثبوت بھی فراہم کیا۔

"دردستان" کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مولوی محمد حسین آزادؔ نے اُردو کی تاریخ پر مضامین لکھنے شروع کئے۔ سر سید احمد خاں کے تین مضامین "خوشامد"، "دربابِ رسم و رواج"، "طلبِ علم" پڑھ کر سنائے گئے لیکن سب سے اہم کام جو کیا گیا وہ اردو زبان کے قواعد و ضوابط کو مرتب کرنا تھا کہ اسے ایک ایسی زبان بنا لیا جائے جس میں ہر طرح کے مضامین لکھنے کی گنجائش پیدا ہو جائے۔

صرف و نحو کے سلسلے میں ڈاکٹر گل کرائسٹ، انشاء اللہ خان انشاؔ کے نام یقیناً اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اِس وقت تک سرکاری اور عدالتی کاموں میں فارسی ہی کا سکہ چلتا تھا۔ اس زبان نے ہندوستان کی زبانوں کی نشو و نما میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا اور اردو نے تو سب سے زیادہ اسی زبان سے

سب سے زیادہ استفادہ حاصل کیا تھا۔ اردو میں اکثر اصناف سخن یعنی نظم و نثر دونوں فارسی سے آئی تھیں اور اپنے ساتھ اسالیب الفاظ، اصطلاحات اور تراکیب کا ایک خزانہ ساتھ لائی تھیں جن سے اُردو شعرا اور مصنفین نے اپنے کلام کو زینت بخشی۔ فارسی اور فارسی کے ذریعہ عربی اور ایک حد تک ترکی ایک ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب ان ماخذات کی سیاسی اہمیت بھی ختم ہوتی جارہی تھی۔ اور اس کی جگہ انگریزی زبان لے رہی تھی۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد بنگال کے دیوانی انتظام کے سلسلے میں جو معاہدہ کیا گیا اس میں فارسی کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا تھا۔ لیکن انگریزوں نے اِس معاہدے کو بھی دیگر معاہدوں کی طرح پورا نہ کیا۔ وہ فارسی زبان کو مغلوں کی سلطنت کا ایک زندہ نشان سمجھتے تھے۔ جسے وہ جلد از جلد ختم کردینا چاہتے تھے۔ اور اس کی جگہ انگریزی زبان کو دینا چاہتے تھے لیکن یہ کام اتنا آسان نہ تھا لہٰذا اِس عبوری دور سے گزرنے کے لیے انھوں نے ۱۸۳۵ء میں اردو کو سرکاری اور عدالتی زبان بنایا لیکن ساتھ ہی ہندی کا جھگڑا بھی کھڑا کردیا۔ دوسری طرف انگریزی کی اشاعت کے لیے تمام ممکن ذرائع استعمال کیے۔

اِس انقلاب نے ایک اور تہذیبی مسئلہ بھی پیدا کردیا۔ کیوں کہ قدیم درسِ نظامیہ کا سلسلہ بند کرکے جدید تعلیم کی ترغیب دی جانے لگی۔ اور قدیم علوم کا زوال شروع ہوگیا ادھر مسلمان اپنی تہذیب کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتے تھے۔ ادھر مغرب نے بہت سے جدید علوم و فنون پیدا کیے اور مغرب و مشرق کے تصادم کے نتیجے میں مرحوم دہلی کالج وجود میں آیا لیکن افسوس کہ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی دست برد کی نذر ہوگیا۔

اِس کے فوراً بعد ہی یعنی ۱۸۶۵ء میں "انجمن پنجاب" کے ممبر ادیبوں نے ایسی تخلیقات پیش کیں جن سے اُردو کے علمی سرمائے میں اضافہ ہوا۔ نقل و حمل کی آسانیوں نے ان تخلیقات کو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں پہنچانا

آسان کر دیا۔ اخبارات کی اشاعت اور ترسیل نے انگریزی خیالات اور زبان بڑی تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچا دیا۔ مثلاً ٹکٹ، اسٹامپ بیرنگ، پنشن، اپیل، مجسٹریٹ، کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر، جنٹ صاحب۔ لاٹ صاحب وارنٹ، نج، ہائی کورٹ، کمپنی، ڈائریکٹر، پارلیمنٹ، ممبر، بل اور اخباری الفاظ ایڈیٹر، نوٹ، کالم، پریس، لیتھو وغیرہ اردو میں خود بخود ضم ہو گئے۔ نئی ایجادات اپنے ساتھ نئے الفاظ لائیں۔ ریل، اسٹیشن، ٹکٹ، ٹکٹ کلکٹر، سگنل، انجن، خاص و عام کی زبان پر چڑھ گئے۔ ان تمام الفاظ کو استعمال کرنے اور اصطلاحات بنانے کی ضرورت تھی۔ لہذا سب سے پہلے صرف و نحو پر کتابیں لکھی گئیں اور نئے اسالیب وضع کئے گئے۔ "انجمن پنجاب" کے جلسوں میں ان تمام ضروریات پر بحثیں ہوتی تھیں۔ اور ان پر مقالات لکھے جاتے تھے۔ انجمن اپنا ایک اخبار بھی نکالتی تھی جس میں یہ ضروری مضامین چھاپے جاتے تھے۔

اِدھر حالی پیشتر ہی مبالغہ سے بے زار تھے لیکن اب سرکاری بک ڈپو نے ان کے خیالات کو اور واضح کر دیا جس کے نتیجے میں عنوانی مشاعروں کی ابتدائی نظمیں، اصلاحی غزلیں اور نثر میں مقدمہ شعر و شاعری وجود میں آئے اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد کے بعض مضامین جو خاص طور پر نیرنگ خیال میں نظر آتے ہیں۔

جدید علوم و فنون کے سلسلے میں نئی اصطلاحات کی ابتدا دلی کالج میں ہو چکی تھی۔

دلی کالج کے قواعد کے مرتبین نے بعض اصطلاحیں خود انگریزی اور یونانی اور لاطینی سے لی تھیں لہذا یہ سلسلہ سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے آگے بڑھایا گیا اور اب تک اسی انداز پر عمل کیا جا رہا ہے۔ اُردو آریائی نسل کی زبان ہونے کی وجہ سے ایک طرف سنسکرت وسط ہند آریائی پراکتوں، جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کے عناصر قبول کر چکی تھی۔

دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ عربی، ترکی، فارسی الفاظ اور عناصر بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ فارسی خود تو آریائی نسل کی زبان تھی اور جغرافیائی قرب، نیز سیاسی اور تہذیبی روابط کی وجہ سے مسلمانوں کے دورِ حکومت میں فارسی کے بہت سے عناصر بھی اردو میں شامل ہو گئے تھے۔ اور بالخصوص ادبی اور علمی زبان میں تو ان عناصر کی فراوانی تھی۔ ترکی عناصر نسبتاً محدود تھے لیکن عربی عناصر کا بھی نفوذ خاصا تھا۔ اول تو عربی مسلمانوں کے لیے قرآن حکیم، احادیث اور لٹریچر کی بنیاد تھی۔ اور ان علوم کی تحصیل بغیر عربی ممکن نہ تھی۔ اور دوسرے عربی کے بہت سے عناصر خود فارسی میں اس قدر نفوذ کر چکے تھے کہ فارسی کا جز بن گئے تھے اور فارسی کے ساتھ اردو میں آ گئے۔ عربی سامی خاندان کی زبان تھی۔ اور اس کی ساخت میں لسانی اعتبار سے سامی خصوصیات تھیں لیکن ان میں بعض عناصر ترکیبی اردو اور فارسی دونوں نے قبول کر لیے تھے اور عربی فارسی کے علوم قدیمہ کے ذخیرے موجود تھے۔ یہ زبانیں علمی زبانوں کی حیثیت سے صدیوں سے رائج تھیں علمی زبانوں کی اصطلاحی زبان اور اصطلاحات اور ایک علمی اسلوب بیان میں پیدا ہو گیا تھا۔ دیسی زبانوں میں اس وقت کوئی ایسی زبان نہ تھی جس میں کوئی قابل ذکر علمی یا ادبی ذخیرہ موجود ہوتا۔ اس لیے اردو میں نئے اضافوں کے لیے سوائے عربی اور فارسی کے عناصر سے مدد لینے کے لیے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اصطلاح سازی کے لیے بلا تکلّف ان الفاظ کو قبول کر لیا گیا جو دیسی زبانوں میں مل سکتے تھے۔ نئے عناصر کی تلاش میں فارسی اور عربی بالخصوص سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ اس طرح اگرچہ مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ عربی اور فارسی کی سرکاری اور تہذیبی حیثیت کو ضعف پہنچایا۔ لیکن اس کی علمی اور فنی ضروریات نے نہ صرف اس کو برقرار

رکھا بلکہ اُردو کے ارتقا کے لیے اس کو ناگزیر سمجھا گیا۔[1]

اِس سلسلے میں ڈاکٹر لائٹنر کی مساعی قابلِ قدر ہیں کہ انجمن پنجاب کے قائم کردہ کالج کے نصاب کے لیے جو کتابیں تیار ہوئیں اِن میں خاص طور پر دو کتابیں[2] ایک "عام اصول صرف و نحو" اور دوسری "فارسی صرف و نحو"، مولانا محمد حسین آزاد نے تیار کیں۔ یہ مولانا کی فارسی اور عربی کی علمی بصیرت کی دلیل ہیں۔ جن میں انھوں نے اردو زبان کی ساخت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ کام ڈاکٹر لائٹنر کے زیرِ ہدایت ہوا۔ یہ تجربہ بہت کام یاب رہا۔ لہٰذا مولانا نے اپنی دوسری تصنیف "سخندانِ فارس" کی داغ بیل ڈالی اور اِس میں ہند ایرانی تقابلی لسانیات پر بحث کی۔ اِس بحث سے پہلے آزاد نے لغات اور زبانوں کے فلسفیانہ تحقیقات کے اصول بیان کیے ہیں۔ اِس علم کی ابتدا کے متعلق ان کا خیال ہے کہ "یہ ایک قدیم فن فلاسفہ یونان کا ہے۔"[2] اِس سے مختلف زبانوں کی اصلیں اور ان کا تعلق ایک دوسرے سے معلوم ہوتا ہے۔[3] لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اِس علم کو مختلف زبانوں کے اصلیں ان کا تعلق ایک دوسرے سے معلوم کرنے سے متعلق نہیں سمجھتے تھے۔ افلاطون نے لفظوں کے آغاز پر بحث بھی کی ہے مگر اِس بحث کا مقصد صرف الفاظ اور ان سے موسوم اشیا کے تعلق کی چھان بین تھی۔ کہ یہ محض فطری ہے یا رسمی"۔ . . . . "یہ ایک طویل اقتباس ہے۔

---

[1] ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، "تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند"، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، فروری، ۱۹۷۲ء، (مدیران خصوصی سید فیاض محمود و ڈاکٹر عبادت بریلوی)۔ نویں جلد، اردو ادب (چہارم، ۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)، ص ۶۳۲

[2] آزاد، مولانا محمد حسین، "سخن دانِ فارس"، لاہور: ص ۴

[3] ایضاً

جس کا مقصد یہ تھا کہ لسانیات کا یہ علم یونانیوں کے یہاں قواعد زبان تک محدود تھا۔ آزاد اس علم کو جس انداز سے پیش کرتے ہیں، اس کی ابتدا اور اصل اٹھارویں صدی سے ہوئی۔ اردو لسانیات یا زبان کا علم صحیح معنوں میں اٹھارویں صدی ہی میں ایک مستقبل علم کی حیثیت سے نمودار ہوا اور لسانی عمل کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق شروع ہوئی۔ "سخن دان فارس" میں لسانیات کے علم کو آزاد نے بجائے افادیت کے پہلو کے اس سے روحانی خوشی حاصل کرنے کا ذریعہ ظاہر کیا ہے۔

لسانیات کی افادیت واضح کرنے کے بعد آزاد نے الفاظ پر بحث کی ہے اور واضح کیا ہے کہ لفظ برائے نام خاص چیزوں پر اشارے ہی نہیں کرتے بلکہ ان میں ترقی وتنزل بھی ہوتا ہے وہ سفر بھی کرتے ہیں طبیعت اور رنگ بھی بدلتے ہیں۔ اور ان کی تاریخ تاریخ بھی ہوتی ہے۔ لفظوں کے مقابلے اور مطابقت میں قوموں، نسلوں اور ان کے خاندانی رشتوں کے سرشتے نکل آتے ہیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اسماء حقیقت میں اشیا کے نام ہی ہیں اور جب چیزیں نہیں بدلتیں اور نام بدل گئے تو الفاظ و معانی میں عجب خلط ملط پیدا ہو جاتا ہوگا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں تغیر ضرور ہوتے ہیں مگر یہ قباحت نہیں ہوتی۔

اصول بیان کرنے کے ساتھ ساتھ آزاد نے تغیرات کے اسباب کا بھی جائزہ لیا ہے۔ تغیر الفاظ ہی کے سلسلے میں جینے اور مرنے کی بحث بھی آگئی ہے۔ آزاد کے بقول "زبان کا استقلال اور آئندہ کی زندگی چار ستونوں کے استقلال پر منحصر ہے۔ قوم کا ملکی استقلال، سلطنت کا اقبال اور اس کا مذہب اور تعلیم و تہذیب۔" سنسکرت اور فارسی قدیم ان چار عناصر کے نہ ہونے کی وجہ سے ختم ہو گئیں۔

وحدتِ لسانین کو واضح کرنے کے لیے آزاد نے سنسکرت اور فارسی کے

قریبی رشتہ داروں کے نام، اعضائے بدن کے نام، قدرتی اشیا کے نام، ضروری اجناس کے نام اور انداز پیش کئے ہیں جو ذرا سے تغیر کے ساتھ دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔

مبادلے کے قواعد بیان کرنے سے پہلے آزاد نے یہ واضح کیا ہے کہ اتحاد الفاظ تین قسم کا ہوتا ہے۔ پہلا اتحاد، ابتدائی جب کل عالم کی زبان ایک ہی ہوگی۔ کچھ مدت کے بعد لوگ آبادی کی بہتات اور جگہ کی کوتاہی کی وجہ سے اطراف عالم میں پھیلے ہوں گے اور ان کی زبان میں فرق آگیا ہوگا۔

دوسرے اتحاد کو آزاد نے اتحاد وسطیٰ کے نام سے پیش کیا ہے کہ ایک قوم کے لوگ وطن سے نکل کر پھیلے اور مختلف جگہوں میں جا بسے۔ اِن کی زبان مرور ایام سے بدل گئی لیکن ماہر لسانیات اِس کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔

تیسرا اتحاد دو قوموں کے اتحاد وارتباط سے پیدا ہوتا ہے۔ آزاد نے صرف اتحاد وسطیٰ سے بحث کی ہے۔ پھر دل کا مطلب تصویروں کے ذریعہ ظاہر کیا اور یہی تصویریں رفتہ رفتہ حروف تہجی کی بنیاد بنیں۔ حروف تہجی کی مختصر تاریخ کے ساتھ آزاد نے حروف تہجی کی تشریح بھی کی ہے۔ حروف تہجی کی آوازوں کے دراوڑی، فارسی اور عربی کے الفاظ پر بحث کی ہے اور صوتی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ صوتی تبدیلیوں اور مخارج کی وضاحت کے بعد آزاد نے حرکات کی وضاحت کی ہے۔ اور اِن ہی تینوں زبانوں کی آوازوں اور الفاظ کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس تقابلی مطالعے میں آزاد نے قدیم علمائے لغت کی تقلید کی ہے۔

تقابلی لسانیات کو مقبول بنانے کے سلسلے میں آزاد کا جوازنہ میکس ملر سے کیا جا سکتا ہے جس طرح آزاد نے "سخن دان فارس" کی تیاری کے سلسلے میں لیکچروں کے ذریعہ تقابلی لسانیات اُردو میں مقبول بنانے کی کوشش کی بالکل اِسی طرح علم لسانیات کو عام کرنے میں میکس ملر کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ دراصل تقابلی لسانیات اور مبادلے کے اصولوں کے ضمن میں آزاد نے اپنی جودت طبع سے مشرق و مغرب

کو یک جا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ تقابلی مضامین کا یہ مجموعہ یعنی "سخن دان فارس" اردو میں پہلی مرتبہ پیش کیا گیا۔ اِس میں بعض خیالات مبہم اور بعض گنجلک معلوم ہوتے ہیں لیکن اِن خامیوں کے باوجود "سخن دان فارس" کی اہمیت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔

انجمن پنجاب" میں جو مقالے پڑھے گئے وہ ہر قسم کے قدیم و جدید مضامین پر مبنی تھے۔ مسجع و مقفے زبان ختم ہو چکی تھی۔ اور اردو زبان اب اس موڑ پر پہنچ چکی تھی جہاں اِس میں ایک مکمل ادبی زبان بننے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔

"سخن دان فارس" مولانا آزاد نے لکھی اِس کے بعد انھوں نے اور انجمن کے دیگر مصنفین نے قواعد اور لسانیات پر مضامین اور کتابیں لکھیں۔ مضامین اور کتابوں میں یہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آزاد ہی کا رسالہ" کلام قواعد اُردو" لیکچر در باب اصلیت زبان اردو" خیالات در باب نظم اور کلام موزوں کے اور حال شمس ولی اللہ کا جو موجد شاعری اردو تھا۔" "احوال بوعلی سینا" "حال شاہ ہدایت شاعر"، لیکچر در باب طرز انشا فارسی و اُردو مروجہ" افادات ملک الشعرا خاقانی ہند، شیخ ابراہیم ذوق"، لیکچر بضمن اِس کے علاوہ مسائل فلسفہ تحقیقی و صحیح کیوں کر حاصل ہوتے ہیں اور کیا سبب ہوا کہ کتب عربیہ اور فارسیہ کے مصنف اس راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے پر جا پڑے"

یہ لیکچر دراصل آزاد کی تصانیف کی تیاری تھی۔ جن کا خاکہ اِن کے ذہن میں موجود تھا۔ ان کے علاوہ دیگر حضرات نے یہ کتابیں اور لیکچر تیار کیے:

(۱) "اُردو گرامر"، تحفہ چشتی از نور محمد (۲) قواعد المبتدی (اردو زبان کی صرف و نحو) از مولوی کریم الدین ۱۲۳ صفحات،

(۳) انشائے اردو (کتابی شکل میں)، (۴) تسہیل الکلام مولفہ کپتان ہالرائیڈ، ایک سو دس صفحات، (۵) شارع التعلیم (اس میں پرانے طرزِ تعلیم کے نقائص بیان کیے گئے ہیں اور نئی تعلیم پر آمادہ کیا گیا ہے) حسب الحکم کپتان فلر، (۶) مفید الصبیان یعنی خود افروز حسب الحکم کپتان فلر، (۲۵۰ صفحات) (۷) فرہنگ لغاتِ مستعملہ عدالتِ ہائے گورنمنٹ (کتابی شکل میں)، (۸) گرامر بزبان اُردو از محمد علی صاحب، (۹) شرح الحکمت از الطاف حسین حالی، (۱۰) گرامر بزبان اُردو از مولوی محمد علی، (۱۱) صرف و نحو از مولوی عبداللہ (۱۲) اشاعت علوم (املا کے غلط لفظوں کی تصیح) از نامعلوم، (۱۳) نظم کا تاریخی مضمون موسوم بہ حقیقت سخن از سیف الحق ادیب دیباچہ یادگار سخن، (۱۴) تواریخ ایام جہالت اردو از مولوی محمد دین، (۱۵) ترجمہ ہدایت البلاغت از سید چراغ علی شاہ، (۱۶) کچھ حصہ ٹیلر صاحب کی قدیم تاریخ اردو کا، (۱۷) سراج الہدایت (لڑکیوں کے تعلیمی نصاب سے متعلق) از سراج بیگم صاحبہ۔"

اردو کے علاوہ سنسکرت اور ہندی اور پنجابی ادب کی جدید شکل دینے سے متعلق بھی کئی کتابیں لکھی گئیں جن میں (۱) انڈین بیدک لٹریچر از پنڈت گورو پرشاد، (۲) تواریخ پنجاب بزبان پنجابی از پنڈت بھاونت (۳) منطق کی پہلی کتاب بزبان پنجابی از پنڈت بھاندت، (۴) کتاب نوائے شاستر (سنسکرت سے ہندی میں ترجمہ)، (۵) زبان کو مثل اُردو کے رواج دینا چاہیے۔ اور سنسکرت کے الفاظ کم کر دینے چاہئیں از بابو نوبین چندر رائے، (۶) اردو کے مقابلے میں ہندی کو بھی رائج کیا جائے از پنڈت

رادھا کشن۔

ان کتابوں اور مضامین کے علاوہ انجمن کے جلسوں میں زبان و بیان کے مسئلے پر بھی بحث و مباحثہ ہوتا رہتا تھا۔ خاص طور پر جو متنازعہ فی مسئلہ نوبین چندر رائے اور رادھا کشن نے ہندی کے ترویج و اشاعت کے سلسلے میں شروع کیا وہ نہایت دل چسپ ہے۔

ہندی اور اُردو کا جھگڑا فورٹ ولیم کالج سے اٹھایا گیا تھا۔ اور ہندوؤں کا دل ہاتھ میں لینے کی غرض سے سنسکرت زبان کے احیا کی کوششیں شروع ہوئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سنسکرت ایک ایسی ادبی زبان تھی جس میں معتد بہ مواد موجود تھا۔ لیکن ہندوؤں نے ذاتوں کی درجہ بندی کی وجہ سے اِس کو بے جان کر دیا تھا۔ علوم مشرقی کے احیا کے سلسلے میں کام ہو رہا تھا خود لندن اور دیگر ممالک میں سنسکرت پڑھائی جاتی تھی۔ ہندوستان میں سنسکرت کی سرپرستی خود ڈیوک آف ونڈسر کر رہے تھے۔ لہٰذا اِس موقف نے اردو زبان کی اشاعت کو بڑا نقصان پہنچایا اور اِسے سیاسی اکھاڑے کی شکل دے دی گئی۔

لیکن "انجمن پنجاب" اِس مسئلے کو بڑی خوبی کے ساتھ سرانجام دیا۔ جس وقت بابو نوبین چندر رائے نے اپنا ہندی سے متعلق مضمون پڑھا تو ڈپٹی ھادی حسین، اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، گجرات نے ایک مضمون میں جو ۹ر مارچ سنہ ۱۸۶۵ء کے جلسۂ عام میں پڑھا اس میں اُردو کو رواج دینے کے لیے آسانیاں بہم پہنچانے پر زور دیا۔ اور یہ بھی لکھا کہ اگر دراوڑی زبانوں کے لاحقے اور سابقے اردو میں لگائے جائیں تو اور زیادہ آسانی ہوگی۔[1]

۲۳ر مارچ کو جلسۂ خاص منعقد ہوا۔ اور دیوان بیج ناتھ نے بتایا کہ حال

---

[1] اِس پر تفصیلی بحث باب ہشتم میں دیکھیے۔

ہی میں انھیں گورنر جنرل نے اِس کام پر مامور کیا ہے کہ اردو زبان سے عربی فارسی کے الفاظ نکال دیئے جائیں۔ تاکہ مقرعہ العملہ جس میں کچہری کے محاورات اور اصطلاحات لکھی گیئں ہیں وہ آسان ہو جائے۔ اِس پر انجمن میں بڑی بحث ہوئی کہ انجمن یقیناً اس بات کی ساعی ہے کہ اُردو زبان کو آسان سے آسان تر بنایا جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی شکل کو مسخ کر دیا جائے۔ لہٰذا انجمن کا فیصلہ ہے کہ وہ اِس رسالہ یعنی "مقرعہ العملہ" کی زبان کو ہرگز نہ بدلا جائے۔ اور اگر حکومت کسی قسم کی تبدیلی چاہتی ہے تو اس کا ایک نمونہ لکھوا کر انجمن کو بھیج دیا جائے تاکہ اِس پر بحث کے بعد کسی نتیجے کو پہنچا جا سکے۔ اور ایک ایسا رسالہ تیار کرے جس میں مترادفات موجود ہوں۔ اور اس رسالے کو ہرگز نہ بدلا جائے۔ اور عربی، فارسی اور سنسکرت میں جو اساتذہ کی تصانیف ہیں ان کے مطالعہ کے شوق کو ہرگز پست کرنے کا قصد نہ کرے کیوں کہ اب اس قسم کے رسالہ جات بہت کم لکھے جاتے ہیں اور اِس طرح "مقرعہ العملہ" کاٹ چھانٹ سے بچ گیا۔ یہ انجمن کا ایک بڑا جراتمندانہ قدم تھا۔[1] اس بحث کی وجہ سے بظاہر حکومت کی ایک حد تک اردو دشمنی کم ہو گئی۔

ڈاکٹر لائٹنر نے اِس بحث و مباحثے کے بعد مشورہ دیا کہ تصنیف و تالیف کے علاوہ السنہ شرقیہ کی زبانوں سے کارآمد اور ادبی کتابیں آسان زبان میں ترجمہ کی جائیں اور اسلوب کا خاص طور پر خیال رکھا جائے تاکہ اُردو میں اچھی اور عمدہ کتابیں مہیا ہو سکیں اور اس کے علاوہ اردو زبان ہی کی ذریعہ تعلیم بنایا جائے تاکہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور علوم زندہ رہیں۔ اعلیٰ قابلیت کے مضامین کے متعلق اشتہار دیا جائے اور اعلیٰ

---

[1] اس پر تفصیلی بحث باب ہشتم میں ملاحظہ کیجیے۔

قابلیت رکھنے والوں کو دو سو روپے انعام دیا جائے۔ یہ بڑی ہمت افزائی بات تھی۔ ادیبوں میں اعتماد پیدا ہو گیا۔

اِس اشتہار کا بڑا اچھا نتیجہ برآمد ہوا۔ اخبار اودھ کے مہتمم منشی نول کشور نے اِس سلسلے میں ہر قسم کی اعانت کا وعدہ کیا کہ ہر نئی کتاب جو ان کے مطبع میں شائع ہو گی وہ انجمن کو بھیجیں گے اور انجمن کے مضامین اپنے اخبار میں شائع کریں گے۔ اِس تجویز پر عمل کیا گیا اور انجمن کے ادبی مضامین اب "اودھ اخبار" کے ذریعہ صوبۂ متحدہ میں عام طور پر دل چسپی سے پڑھے جانے لگے۔ اِن مضامین کی زبان و بیان کے اثرات دور دور تک پھیل گئے۔

تاریخی کتابوں کی سنجیدہ اور علمی زبان کے متعلق ایک اور اہم بات یہ ہوئی کہ الفسٹن کی کتاب "اورنگ زیب عالم گیر" پر کریم الدین نے بڑی پاکیزہ زبان لکھی وہ بذاتِ خود ایک سہل، رواں اور نئے اسلوب کا نمونہ ہے۔ اِس کی زبان اور آج کی سو برس کے بعد کی زبان میں بہت کم فرق ہے۔ اگرچہ متن سے اختلاف ہے۔ لیکن نثر کی ترقی کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے۔

دفاتر میں انجمن سے پہلے قدیم زبان رائج تھی لیکن "رسالہ انجمن پنجاب" کے جلسوں کی کارروائی کی تحریروں نے صحافت کے میدان میں بھی ایک قدم آگے بڑھایا۔ اِس کے علاوہ ایک خاص سلیقے سے مضامین اور جلسوں کی کارروائیاں سہل اور رواں زبان میں لکھی جانے لگیں۔

امتحانوں میں اعلیٰ قابلیت دکھانے والوں کے لیے امتحانات کی رقم جمع کی جانے لگی تاکہ طالب علموں کی حوصلہ افزائی ہو خود لیفٹیننٹ گورنر نے عربی، فارسی اور اردو کی اعلیٰ قابلیت پر انعامات دیئے۔ انعام پانے والوں کی تعداد زیادہ دیکھ کر، ۲۷ ستمبر ۱۸۶۵ء میں صرف انگریز حکام نے جلسۂ خاص منعقد کیا اور اہلِ پنجاب خاص طور پر "انجمن پنجاب" کے ممبر دو

ے علمی ذوق اور اردو دوستی کو دیکھتے ہوئے یہ طے کیا کہ وہ بھی انجمن کے جلسوں میں حصّہ لیں گے۔ اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ اب ذریعۂ تعلیم اردو ہوگا جس میں طب انجینئری جیسے مضامین بھی اردو میں پڑھائے جائیں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی طے کیا کہ یونی ورسٹی کے طلبا سے فیس نہیں لی جائے گی بلکہ غریب اور نادار لیکن ذہین طالب علموں کو وظیفہ دیا جائے گا۔

اردو کی اس ہر دل عزیزی سے پہلے کمشنر اور اسسٹنٹ کمشنر صرف انگریز ہوا کرتے تھے۔ لیکن انجمن پنجاب میں ایسے اردو دان موجود تھے۔ جو اس عہدے پر فائز ہو سکتے تھے۔ لہٰذا لاہور کے علاوہ پنجاب میں کمشنر اور اسسٹنٹ اکسٹرا کمشنر کا امتحان بھی اردو ہی میں ہونے لگا۔ اور درجہ اول و دوم میں پاس ہونے والے طلبا کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔

بڑی دل چسپ اور اہم بات یہ بھی ہوئی کہ رانگ ٹن صاحب نے تذکرہ شعرائے اردو لکھنے کی فرمائش کی گویا یہ ضرورت محسوس کر لی گئی کہ نئے انداز کے شعرا جنھوں نے قدیم روش ترک کر دی تھی۔ ان کا تذکرہ یا تاریخ اردو شاعری مرتب کی جائے۔ یقیناً آزاد کے ذہن میں "آب حیات" لکھنے کی تحریک بھی یہی فرمائش تھی۔ آزاد نے اپنا مشہور اور پہلا لیکچر جو اردو شاعری میں انقلاب کا باعث ہوا اس فرمائش کے بعد ہی دیا تھا۔

فارسی اور عربی کے محاورات جو اردو میں منتقل کئے جا رہے تھے۔ ان کی تصحیح کے لیے ایک ذی علم مولوی محمد صالح کو ملازم رکھا گیا تاکہ اردو کی روانی میں فرق پیدا نہ ہو۔ اور اردو میں نئے نئے الفاظ اور محاورات شامل کر کے اس کی لغت اور اصطلاحات میں اضافہ کیا جا سکے۔

اب تک پرنس آف ویلز سنسکرت زبان کی سرپرستی کر رہے تھے لیکن ۱۷/ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو پرنس آف ویلز نے ڈاکٹر لائٹنر کو خط لکھا کہ انجمن کے ذریعے اردو کی تعلیم عام کی جائے۔ اور اردو زبان کی بنیادی زبانوں یعنی

سنسکرت، عربی اور فارسی زبانوں پر توجہ خاص دی جائے۔ یہ بہت خوش آئند بات تھی اور اس طرح اردو زبان اور اس کو ذریعہ تعلیم بنانے کے خود پرنس آف ویلز حامی اور سرپرست بن گئے۔ اس سرپرستی کی وجہ سے "انجمن پنجاب" کے ممبروں اور عوام میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ فقیر شمس الدین نے یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں ایک لیکچر دیا جس میں کہا گیا کہ اُردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں انھیں دور کیا جائے۔

منشی عبداللطیف نے اپنی ایک تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ حکومت جو قواعد و ضوابط مرتب کرتی ہے اسے عوام اور خاص طور پر کاشت کاروں تک پہنچانے کے لیے اردو میں شائع کیے جائیں۔ انجمن نے اس مشورے پر عمل کیا اور اشتہارات اور مختلف آئین و ضوابط اُردو میں مرتب ہونے لگے۔ گویا اب اردو زبان میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی تھی کہ شعر و ادب کے محدود دائرے سے نکل کر عوام کی ترجمانی کرنے لگی تھی اور اسے سرکاری اور دفتری زبان کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔

انجمن کی اِس کارگردگی کا اثر صرف نثر پر ہی نہیں بلکہ شاعری پر بھی مرتب ہوا۔ مولانا آزاد نے ۱۵ اگست، ۱۸۶۷ء میں شاعری کے لب و لہجے میں تبدیلی کا ذکر بڑے زور و شور سے کیا لیکن اِس پر عمل ۱۸۷۴ء میں ہوا۔

عنوانی مشاعروں کو ایک حد تک دبستان لکھنؤ کا ردعمل کہا جا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزاد اور حالی نے لاہور کے مشاعروں میں نفسِ مضمون اور غیر عشقیہ شاعری پر زورِ طبع صرف کیا اور اِن عنوانی مشاعروں کے محرک دراصل کرنل ہالرائیڈ تھے جنھوں نے اِس طرف توجہ دلائی۔ اِن عنوانی مشاعروں میں اکثر و بیشتر طویل مثنویاں ہیں جس میں ہیئت کے تجربے بھی کیے گئے مثنویوں کی مخصوص بحر سے ہیئت کو مسدس، مخمس، مستزاد وغیرہ میں جدید خیالات کا اظہار کیا گیا۔ یہ مثنویاں اس لحاظ سے نہایت دل چسپ ہیں کہ ان میں قدیم و جدید

زبان کے علاوہ قدیم و جدید خیالات ایک ساتھ سمو دیئے گئے ہیں۔ جیسے جیسے جدید اردو شاعری کی اہمیت اور ضرورت سے لوگ واقف ہوتے گئے ویسے ویسے مشکل ردیف و قافیہ ترک کر کے صرف ردیف پر اکتفا کیا گیا کہیں غیر مقفی نظم بھی ملتی ہے لیکن یہ ان کی ابتدائی شکل ہے۔ یہ ابتدائی شکلیں اپنی ضرورت کے لحاظ سے اتنی اہم ہیں کہ ہر ادبی ذوق رکھنے والے حضرات نظم کہنے لگے یہاں تارا چند حلوائی کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو اعلیٰ شعری ذوق کے حامل تھے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے نظمیں بھیجی جاتی تھیں۔ اور انجمن کے جلسوں میں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ پڑھ کر انتہائی مسرت ہوتی ہے کہ جیسے جیسے لوگ شعری اہمیت سے واقف ہوتے جاتے تھے۔ ویسے ویسے آسان گوئی پر مائل ہوتے جاتے تھے۔

اگرچہ یہ مشاعرے ایک سال سے زائد برقرار نہ رہ سکے لیکن انھوں نے جدید اردو شاعری کی ایسی بنیاد رکھی کہ جس کی وجہ سے شاعر انگریزی خیالات بڑی تیزی سے اُردو میں پیش کرنے لگے۔ اور ساتھ ساتھ ہیئت کے تجربے بھی ہونے لگے یہاں تک کہ یہ سلسلہ بیسویں صدی تک پہنچ جاتا ہے۔

"انجمن پنجاب" سنہ ۱۸۸۶ء تک رفتہ رفتہ خاتمے کے قریب پہنچ گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے اُردو زبان کی وہ خدمات انجام دیں جو دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ نے انجام دی تھیں۔ یہ "انجمن پنجاب" کی ہر دل عزیزی اور اُردو کی خدمت تھی جس کی وجہ سے آج پنجاب کے گوشے گوشے میں اردو زبان لکھی پڑھی اور سمجھی جاتی ہے اور جہاں اعلیٰ درجے کا ادب آج بھی تخلیق کیا جاتا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد بھی اِس کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں پنجاب نے جس قدر اہل قلم پیدا کئے وہ خطۂ پاکستان میں کہیں پیدا نہیں ہوئے

اور اب یہ پیشن گوئی کی جا سکتی ہے کہ آئندہ آنے والی نسلیں دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے بعد لاہور کو دبستان اُردو کے خطاب سے نوازیں گی کیوں کہ دلّی اور لکھنؤ کی بربادی کے بعد پاکستان بنا اور پاکستان میں پنجاب ہی کے خطے سے اُردو کا دور ثانی شروع ہوتا ہے۔ اس وجہ یہ ہے کہ کہ "انجمن پنجاب" کے اثرات بڑے دور رس تھے، ہر قصبے اور شہر میں اس کی شاخیں کھلی ہوئی تھیں وہ انجمنیں بھی اس قسم کی مساعی میں اس پر جوش طریقے سے کام کر رہی تھیں، کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف ہو گئیں۔ اس کے علاوہ اورینٹیل کالج اگرچہ یونی ورسٹی سے ملحق کر دیا گیا تھا لیکن اس کا طریقۂ تعلیم اسی طرح قدیم تھا جس طرح روز اول سے تھا یعنی السنہ شرقیہ کا احیا۔ جب ہم ان دونوں اہم تعلیمی اداروں کو جو بظاہر ایک نہیں غائر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سائنس کا شعبہ تو یونی ورسٹی کے حوالے کرنا پڑا تھا۔ جس میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو گیا لیکن فنون کا یہ شعبہ اسی تندھی سے کام کرتا رہا اس کے طالب علموں نے اُردو زبان کی بڑی خدمات انجام دیں جن کے اثرات آج بھی روز بروز روشن اور ترقی پذیر ہیں ان کی کئی وجوہات ہیں۔

مغربی تعلیم سے اثر انداز ہونے کے باوجود انجمن اپنے تہذیبی اور معاشرتی تمدن سے علٰحدہ نہیں ہوئی بلکہ جدید علوم کو اردو زبان میں سمو کر ایک ایسی زبان کی بنیاد رکھی جو بظاہر تجربہ گاہ معلوم ہوتی ہے لیکن وہ اس قابل ہو گئی کہ اس میں جدید علوم اور سائنس کے تمام موضوعات سموئے گئے۔ اور شائق طالب علموں میں اپنی مذہبی اور ملکی ضروریات کے پیش نظر دنیا میں اپنا نام پیدا کیا۔ جو شکوک مغربی تعلیم کی وجہ سے عوام کے ذہنوں میں پیدا ہو گئے تھے وہ دور ہو گئے۔ اگرچہ وہ آج بھی اپنی روز مرہ زندگی میں پنجابی بولتے ہیں لیکن ان ہی لوگوں میں وہ عالم و فاضل بہ گزرے ہیں جن کی قابلیت کے سامنے دنیا کی

دیگر زبانوں نے ان کا اعتراف کیا۔

اِس انجمن کی خصوصیت یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے تعصبات کو دور کرنے اور متنازعہ فیہ معاملات جن سے ملکی اور قومی وقار کو ٹھیس پہنچ سکتی تھی خود کو دور رکھا۔

ادیبوں اور شاعروں نے شعوری طور پر ادب کا رشتہ اپنے زمانے کی سیاست اور سماج سے جوڑ کر اجتماعی زندگی کے مسائل کا عقلی حل پیش کرنا شروع کر دیا۔ زندگی کی مادّی ضرورتوں کو براہ راست قابل توجہ قرار دے کر ارضی زندگی کی ترقی و تکمیل پر زور دیا۔ ادب کے تفریحی و رومانی ذوق کو بدل کر اسے اجتماعی مقاصد سے روشناس کرایا۔ اس ذوق کا رخ تخیلی اور داخلی زندگی سے ہٹا کر واقعیت اور خارجی زندگی کی طرف موڑ دیا اور اِس سے اخلاقی، فطری، سماجی، تہذیبی اور مذہبی اصلاح کا کام لیا جانے لگا۔ اور اِس طرح اس سے ہمہ گیر کام لینے کے لیے ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک شروع کی ادب میں عمرانی و تہذیبی اہمیت کا اندازہ لگا کر اُردو میں مقصدی شعر و ادب میں تخلیق کی روایت قائم کی گئی۔

عنوانی مشاعروں میں حالی چار ماہ تک شریک رہے۔ سرکاری بک ڈپو کا اثر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ لہٰذا جب وہ دلی چلے گئے۔ تو مدوجزر اسلام جیسی اہم تخلیق کی نئی شاعری کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا۔ وہ برابر جاری رہا اور پھیلتا گیا۔ یہ حالی کلامی کا اثر تھا کہ ان کے ہم عصر شعرا نے اردو شاعری کو سماجی زندگی کے تمام میلانات کا آیئنہ بنا دیا حالی کے علاوہ چکبست، اکبر الہ آبادی۔ شبلی۔ اقبال، نظم طبا طبائی، ظفر علی خان کا کلام اِس امر کا شاہد ہے کہ مذہب، معاشرت، ادب، تہذیب، تمدن، معیشت، سیاست اخلاق غرض کوئی پہلو سماجی زندگی کا ایسا نہ بچا جس پر نظمیں نہ لکھی گئی ہوں۔ اِس نئی شاعری کا اولین مطلب اجتماع سے ہے اور اجتماع کے توسط سے افراد۔

اس میں ایک طرح کا منظم اجتماعی احساس اور عمرانی ادراک، اجتماعی طور پر محسوس کئے ہوئے جذبات اور سوچے سمجھے ہوئے افکار قومی مسائل کا بیان اور ان کا علمی اور عقلی حل ملتا ہے یہ شاعری جذبات کی آسودگی سے بڑھ کر ذہن، فکری بیداری و وسعت کو اپنا مطمع نظر بناتی ہے۔

نئے انداز بیان میں آزاد اور حالی کی مثنویوں، قطعات، رباعیات اور دوسری نظموں میں شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، اور ظفر علی خان کی شاعری میں اور اقبال کی ابتدائی دور کی نظموں میں اسی رنگ کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کو بھی اِن ہی عنوانی مشاعروں نے اشارہ کیا اس کے ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔

حب الوطنی کا جذبہ خاص طور پر جو مغربی اثرات اور انگریزی ادب کی وساطت سے اُردو شاعری میں آیا تھا اور مقتضلئے زمانہ سے پوری مطابقت رکھتا تھا۔ اردو میں وطن پرستانہ شاعری کا نقطۂ آغاز ان ہی مشاعروں کا نقطۂ خاص ہے، ستمبر ۱۸۷۴ء میں سارے ہندوستان کو ایک وطن اور اِس میں بسنے والوں کو ہم وطن قرار دیا تھا۔ "حب الوطنی" کا مطلب صرف اپنے مقام پیدائش سے محبت نہیں لیا تھا۔ بلکہ وہ اپنی ذات سے بلند ہو کر وطن اور ہم وطنوں کی خدمت میں تن من دھن سب کچھ نثار کر دینا تھا۔ شاعری میں وطن پرستی کی اِس لے کو آگے چل کر سرور، شبلی، چکبست ظفر علی خان، حسرت موہانی۔ اور اقبال نے خوب تیز کیا۔ سرسید اور حالی نے عہد آفرین مدت کے بعد اُردو میں ملی شاعری کا آغاز ہوا۔ نذیر احمد شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، شوق قدوائی، شرر، اکبر، اقبال، ظفر علی خان، آغا حشر، وغیرہ کی ملی نظمیں اِسی "انجمن پنجاب" کے عنوانی مشاعروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

نشر و اشاعت اور طباعت کی آسانیوں نے اخبارات اور رسائل

کا اجراء آسان کر دیا تھا۔ اور اخبارات و رسائل کے صفحات کو قدرتاً وقتی مسائل اور عصری مباحث سے پُر کرنا ضرور تھا۔ اخبارات میں سماجی علمی، ادبی، تہذیبی، مذہبی اور سیاسی مسائل کی بحث کے لیے خبروں کے علاوہ اِن مضامین کو چنا گیا اور انشائیہ نے رواج پایا۔ آزاد اور ان کے معاصرین نے ان موضوعات کو لکھنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ایک ایک عنوان پر بعض دفعہ دس پندرہ مضامین جمع ہو جاتے تھے۔ اور انھیں رسالہ" انجمن پنجاب" میں شائع کیا جاتا تھا۔ آزاد نے انگریزی انشائیوں کے جو ترجمے اور چربے پیش کئے ان کی ادبی حیثیت مسلّم ہے۔ اگرچہ یہ سب رمزیہ اور تمثیلی انداز میں لکھے گئے ہیں جو اخلاق کی کسی نہ کسی قدر کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن بجا طور پر انھیں اِس صنف کا" معمار اولین کہا جاسکتا ہے ان کے بعد حالیؔ، محسن الملک، چراغ علی، ذکاء اللہ، سلیم، شبلی اور دوسرے مصنفین ہیں جنہوں نے اِس صنف کو عام کیا۔

سوانح عمریاں لکھنے کا شوق بھی اردو میں مغربی اثرات اور نئے حالات کا مرھون منت ہے۔ جس میں اورنگ زیب عالم گیر کی سوانح مصنفہ الفنسٹن جس کی اردو کو مولوی کریم الدین نے درست کیا ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اگرچہ اِس میں معاندانہ رویہ اختیار کیا تھا لیکن اِس کا اثر یہ ہوا کہ لاہور اور اہل پنجاب نے بے شمار سوانح عمریاں لکھ ڈالیں[۱]

مختصر افسانوں کے لیے اتنا لکھنا کافی ہے کہ مولانا آزادؔ نے جس انداز سے نیرنگ خیال لکھی اگر اس کے حصے دیکھے جائیں تو وہ خود ایک مکمل افسانہ نظر آتے ہیں۔

اخبارات کی ابتدا سے بحث کرنا اس وقت ہمارا کام نہیں البتہ ہمیں

---

[۱] دیکھئے ضمیمہ ..... مقالہ ہذا

یہ معلوم ہے کہ "رسالہ انجمن پنجاب" اور اس کی شاخوں نے اور اِس کے علاوہ اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت سے اخبارات اور رسائل نکلے جنھوں نے فنِ صحافت نگاری کو فروغ دیا۔

رفیقِ ہند: یہ اخبار محرم علی چشتی نے ۵، جنوری، ۱۸۸۴ء کو لاہور سے جاری کیا یہ بھی ہفت روزہ تھا۔ اور سرسید کا مخالف تھا۔

"انجمن پنجاب" کی سب سے بڑی سعی اس کی تاریخی اور لسانی تحقیق ہے۔ انجمن کی قائم کردہ اورنٹیل یونی ورسٹی اور اس کے ممبر مصنفین تنقید اور ادبی تجزیے سے زیادہ حقائق کے دل دادہ ہیں ان کا طریقہ کار سائنس دانوں کی طرح رہا ہے۔ وہ مواد کی تلاش میں بڑا وقت صرف کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ اورنٹیل کالج کے مصنفین اور ذی علم ممبر کلاسیکی روایت کے علم بردار اور کلاسیکی ادب کے طالب علم ہیں۔ ان مصنفین کا نصب العین یہ بھی رہا ہے کہ ادب کے ماخذ کو زندہ رکھا جائے اور پڑھا بھی جائے۔ دشوار پسندی ان کی عادت رہی اور بیشتر پا افتادہ مضامین سے ان کو بہت کم لگاؤ ہے۔ "انجمن پنجاب" کی ادبی روایت مغربی مستشرقین کے جدید انداز سے بھی متاثر ہوتی۔ چناں چہ ماخذ کا حوالہ، سنوں کی پوری تاریخ، واقعہ کی ہر ہر جزئی چیز کا مفصل بیان اس انجمن کی تصنیف کی وہ چند خصوصیات ہیں جو مغرب کے اساتذہ سے انھوں نے حاصل کی ہیں۔

"انجمن پنجاب" اور "اورنٹیل کالج" تصنیف و تالیف کے لیے پرسکون فضا پیدا کرنے میں ڈاکٹر لائٹنر اور ڈاکٹر وولز کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان بزرگوں کی شخصیت میں گوناگوں عناصر ترکیبی شامل تھے وہ عالم فاضل ہونے کے علاوہ صاحب اقتدار بھی تھے۔ اور اس اقتدار سے انھوں نے علم و ادب کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ انھوں نے علمی کام کرنے والوں کے لیے ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ جس میں مصنف گرد و پیش کے خطرات سے بے فکر ہو کر اپنی علمی سرگرمیوں میں منہمک رہے۔

باب ہشتم

اخبار انجمن پنجاب اور اس کی روداد

باب۔ ہشتم

اخبار انجمن پنجاب اور اس کی رُوداد

کرنل ہالرائیڈ کی سرکردگی میں ڈاکٹر لائٹنر نے حکومت کے ایما پر انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی۔ اِس انجمن کا پورا نام "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" رکھا گیا۔ امتداد زمانہ کے ہاتھوں اس کا نام صرف انجمن پنجاب رہ گیا اور یہ اسی نام سے مشہور ہوئی۔ اس انجمن کے مقاصد بڑے اہم تھے۔ مثلاً اورینٹل یونی ورسٹی قائم کرنا۔ زراعت، عدالت، کاشت کاری وغیرہ کا کام بھی حکومت اِسی انجمن کے فیصلوں کے مطابق کرتی تھی۔ جدید نظم اور ایک حد تک نثر کی ابتداء بھی اسی ادارے نے کی۔ جب اِس انجمن کا کام پھیلنے لگا۔ تو ایک رسالہ کی فوری ضرورت محسوس ہوئی جو انجمن کی کارکردگی کی اشاعت کرے لہذا مولانا محمد حسین آزاد کی ادارت میں کوہ نور لاہور سے باہتمام سورج بھان پرنٹر اس پرچے کی اشاعت شروع ہوئی۔

رسالہ انجمن پنجاب کے پہلے شمارے میں جنوری، فروری، اور مارچ ۱۸۶۵ء کی کارروائی درج ہے۔ اسی پرچے کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن پنجاب کا پہلا جلسہ سکشا سبھا کے مکان میں ہوا جو کہ ایک ہندوؤں کا مدرسہ تھا۔ اس موقعہ پر ایک مضمون پڑھا گیا جس کا اقتباس یہ ہے:

> "مثل شاہ جہان پور، بریلی، بنارس، کلکتہ، شہر لاہور میں بھی ایک مجلس رئیسان نامی گرامی عالم و فاضل شائق علم و ہنر کی تقرری کی جائے جس میں تنقیح مطالب مفیدہ پنجاب و ترقی علم و ہنر کی تحریر نیز تقریر علم میں آکر بذریعہ چھاپہ تشہیر ہوا کرے۔ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل

ڈاکٹر لائٹنر نے اس کو منظور کیا ہے۔"[1]

امداد صابری نے اپنی کتاب "تاریخ صحافت اردو" جلد دوم مطبوعہ جدید پرنٹنگ پریس ۲۲ کباسان جامع مسجد دہلی میں ص ۲۱۲ اس پرچے کی تاریخ اشاعت ۱۸۶۴ء لکھی ہے جو غلط ہے۔

اس ہفتے وار رسالے میں علم و ادب، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور اردو ادب پر مضامین شائع کئے جاتے تھے اس کے پرچوں میں اجلاسوں کی کارروائیوں کے علاوہ ضمیموں کی شکل میں "گلدستہ" کے نام سے پورے مشاعرے شائع ہوتے تھے اور اصل رسالے کے مضامین رسالہ انجمن مصور کے پرچوں میں شائع کئے جاتے تھے۔ رسالہ "انجمن پنجاب" میں کبھی کبھار ہندی میں ایک مختصر مضمون شائع ہو جاتا تھا اس رسالے کے مضمون نگار بابو چندر ناتھ مترا پنڈت من پھول، مولوی محمد حسین آزاد، منشی دیوان چند، برکت علی خان، مولوی علم دار حسین وغیرہ تھے۔ سالانہ چندہ تیرہ روپے تھا۔

رسالہ مذکور میں جس نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ وہ رسالہ نمبر ۳، بابت ماہان جون، جولائی، اگست و ستمبر ۱۸۶۵ء میں مطبوعہ حسب ذیل عنوانات سے واضح ہوتی ہے:

۱. مضمون ارتباط اختلاط اہل ہند با سلاطین از مولوی محمد حسین
۲. درباب رواج دینے زبان ہندی از بابو نوبین چندر رائے
۳. خط نقص معالجہ بیماروں کے جو نیم حکیم اور کم مایہ طبیبوں سے کرایا جاتا ہے۔
۴. تخفیف اخراجات شادی۔ اور
۵. رواج دینا کلوں کا۔

---

[1] رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۱۔ جلد ۱، بابت ماہ فروری و مارچ ۱۸۶۵ء مطبع کوہ نور میں باہتمام سورج بھان پرنٹر چھپا۔

۱۸۷۴ء میں جب انجمن پنجاب میں عنوانی مشاعرے شروع ہوئے تو رسالہ انجمن پنجاب کے اس ضمیمہ کو "گلدستہ" کے نام سے شائع کیا جانے لگا اور ۱۸۷۵ء میں انجمن پنجاب کا رسالہ انجمن قصور کے ساتھ نکلنے لگا۔

جلد دوم رسالہ انجمن مفید عام ضلع لاہور جو زیر نگرانی مولوی فتح محمد بیگ مہتمم مذکور مطبع قادری پریس انجمن مفیدہ عام قصور میں چھپنے لگا اس کے پہلے صفحے پر "رسالہ انجمن پنجاب و رسالہ قصور" درج ہے یہ حسب معمول انجمن پنجاب کے اجلاسوں کی کارروائیاں اور مضامین شائع کرتا تھا۔ مصنفین حضرات بھی وہی تھے۔ اس طرح ماہ جولائی، ماہ اگست، ستمبر، اکتوبر اور نومبر تک یہ پرچہ اسی نام سے شائع ہوتا رہا لیکن اس کے بعد رسالہ نمبر ۴ فروری ۱۸۷۶ء جلد نمبر ۳ (دو) میں انجمن قصور کا نام نہیں۔ اس پر صرف رسالہ انجمن پنجاب لکھا ہے اور جلسوں کی کارروائیاں درج ہیں۔

۱۸۷۵ء تک اس مخلوط رسالے میں اکثر و بیشتر مضامین ہی شائع کئے جاتے تھے۔ اس مقالے کی تیاری کے سلسلے میں پبلک لائبریری لاہور سے انجمن پنجاب کی ایک رپورٹ دستیاب ہوئی جس میں ۱۸۶۹ء لغایت ۱۸۷۳ء تک کی کارروائیاں محفوظ ہیں۔

اخبار انجمن پنجاب کے مقاصد کا دائرہ نہایت وسیع تھا مثلاً ہندوستانیوں اور خاص طور پر اہل پنجاب نے اخلاق کی اصلاح قدیم بے ہودہ رسوم ترک کرنے پر عوام کی رائے کو مشتہر کرنا، قومی اصلاح و تکمیل۔ تہذیب و شائستگی۔ لوگوں کو جدید ترقیات علمی کی طرف راغب کرنا، علمی نقطۂ نظر کی اصلاح، ادب، و انشائے لیے صحیح ذوق کا پیدا کرنا، اردو کو قومی اجتماعی افکار کا ترجمان بنانا، صوبے میں تعلیم عام کرنے کے لیے یونی ورسٹی کا قیام اور اس سلسلے میں حکومت سے

جو خط و کتابت ہوتی تھی اس کو عوام تک پہنچانا وغیرہ

سب سے اہم کام جس پر اردو زبان و ادب فخر کرتا ہے۔ یعنی عنوانی مشاعروں کو شائع کر کے اہل ذوق کو جدید شاعری پر آمادہ کرنا اس اخبار کا کام تھا۔ جدید اردو شاعری کے متعلق اس قدر لکھا جا چکا ہے۔ کہ اس کا ذکر کرنا لاحاصل ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ عنوانی مشاعروں کی روئداد پڑھ کر روح شاعری کو تبدیل کرنے میں اسی رسالے کا ہاتھ تھا۔ جو لوگ مشاعروں میں شریک نہیں ہو سکتے تھے ان کی نظمیں اس رسالے میں شائع ہوتی تھیں۔

۱۸۸۰ء کے ایک گلدستے کو دیکھ کر یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ رسالہ انجمن پنجاب کا ضمیمہ مسلسل شائع ہوتا رہا۔ عنوانی مشاعروں کے ختم ہونے کے بعد حروف تہجی کے اعتبار سے غزلیں مشاعروں میں سنائی جاتی تھیں اور انھیں اس رسالے کے ضمیمے میں شائع کیا جاتا تھا۔

انجمن پنجاب کے جلسوں میں جو تعلیمی اور ثقافتی مضامین پڑھ کر سنائے جاتے تھے ان پر پہلے سامعین کی رائے لی جاتی تھی اور پھر ان کو رسالے میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ ان مضامین میں سے جو مضامین نصاب سے متعلق ہوتے تھے۔ انھیں کمیٹی منظور کر کے کالج یونی ورسٹی کے لیے کتابی شکل میں شائع کر دیتی تھی۔ یہ مضامین نہایت اہم ہیں، کیوں کہ ان مضامین کی وجہ سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اردو زبان میں تمام مضامین پڑھائے جا سکتے ہیں۔ تاریخ، جغرافیہ، سیاست، انجنیئری، سیاست مدن، علم و ادب غرض کوئی مضمون ایسا نہ تھا جو اس رسالہ میں پہلے شائع نہ ہوتا ہو۔ یہاں تک کہ کالج میں جو مختلف مضامین پر لیکچر دیئے جاتے تھے۔ اور آلات کے ذریعہ ان کو سمجھایا جاتا تھا۔ وہ مضامین معہ آلات کی تصاویر کے اس رسالے میں شائع ہوتے تھے۔ بعض مضامین جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوتے

وہ قسط وار اِس رسالے میں شائع ہوتے۔

علمی مضامین کے علاوہ ادبی مضامین نے بھی اِسی رسالے سے مقبولیت حاصل کی جس میں مولانا آزاد کی "آب حیات"، "نیرنگ خیال"، "سخن دانِ فارس" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہی وہ مضامین ہیں جنھوں نے اردو زبان کو نہ صرف لب و لہجے بلکہ مضامین کی رنگا رنگی اور لغت میں نئے الفاظ کا گراں بہا اضافہ کیا۔

اِس رسالے میں سر سید اور نواب محسن الملک کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اِس کے علاوہ دیگر رسائل سے عمدہ اور کارآمد مضامین چن کر شائع کئے جاتے تھے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں رسالہ انجمن پنجاب ایک لازوال اضافہ ہے۔

رسالہ نمبر۴ میں ابتدائے ستمبر لغایت دسمبر مطبع کوہ نور باہتمام منشی ہرنرائن چھپا۔

رسالہ نمبر۵۔ جلد۲، بابت جنوری، ۱۸۶۶ء مطبع تربلاس باہتمام پنڈت مکند رام مالک کے مطبع میں چھپا۔

رسالہ نمبر۶۔ جلد۲، بابت فروری، ۱۸۶۶ء مطبع ھوپ پریس لاہور میں باہتمام منشی محمد منیر صاحب پروپرائٹر کے چھپا۔

رسالہ نمبر۷، جلد۲۔ بابت ماہ مارچ مطبع جلوۂ انوار منشی غلام محمد پروپرائٹرز میں چھپا۔

رسالہ نمبر۸، جلد۲، بابت ماہ اپریل، ۱۸۶۶ء مطبع کوہ نور منشی ہرنام پرنٹر چھپا۔"

رسالہ نمبر۹، جلد۲، رسالہ انجمن پنجاب بابت مئی، ۱۸۶۶ء مطبع کوہ نور لاہور باہتمام منشی ہرنرائن چھپا۔

رسالہ نمبر۱۰ (آغا محمد باقر نبیرہ آزاد کے پاس موجود نہیں تھا۔)

رسالہ نمبر ۱۱، سنہ ۱۸۶۶ء رسالہ انجمن پنجاب جلد ۲، بابت ماہ جولائی مطبع کوہ نور باہتمام منشی ہرنرائن پرنٹر چھپا۔

رسالہ نمبر ۱۲، رسالہ انجمن پنجاب بابت ماہ اگست، سنہ ۱۸۶۶ء مطبع کوہ نور لاہور میں منشی ہرنرائن کے زیر اہتمام چھپا۔

رسالہ نمبر ۱۳ رسالہ انجمن پنجاب جلد ۲ بابت ماہ ستمبر، سنہ ۱۸۶۶ء در مطبع کوہ نور لاہور میں زیر نگرانی منشی ہرنرائن چھپا۔

رسالہ نمبر ۱۴۔ رسالہ انجمن پنجاب جلد ۲، بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء مرتبہ مطبع کوہ نور لاہور باہتمام منشی ہرنرائن چھپا۔

رسالہ نمبر ۱۵، جلد ۲، رسالہ انجمن پنجاب بابت ماہ نومبر مطبع کوہ نور لاہور میں باہتمام منشی ہرنرائن چھپا۔

رسالہ نمبر ۱۶، جلد ۲ رسالہ انجمن پنجاب بابت ماہ دسمبر، سنہ ۱۸۶۶ء مرتبہ سیکریٹری انجمن (منشی ہرسکھ رائے) در مطبع کوہ نور لاہور میں باہتمام منشی ہرنرائن چھپا۔

رپورٹ سہ سالا سنہ ۱۸۶۶ء، ۶۷، ۶۶۸۔ ۱۵ اپریل، سنہ ۱۸۶۹ء در مطبع گنیش پرکاش لاہور باہتمام منشی ہرسکھ رائے گوبند سہائے چھپا۔

انجمن پنجاب کی فہرست مضامین کا ایک نمونہ :

رسالہ انجمن پنجاب نمبر ۳، بابت ماہ جون و جولائی، اگست، ستمبر، سنہ ۱۸۶۵ء دوسری بار مطبع کوہ نور لاہور میں باہتمام منشی گوری شنکر پرنٹر کے چھپا۔

جلسہ عام پروسیڈنگ :۔

۱۔ مضمون ارتباط و اختلاط اہل ہند یا سلاطین از مولوی محمد حسین۔

۲۔ درباب رواج دینے زبان ہندی از بابو نوبین چندر رائے۔

۳۔ خط نقص معالجہ بیماروں کے جو نیم حکیم اور کم مایہ طبیبوں سے کرایا جاتا ہے۔

۴۔ تخفیف اخراجات شادی۔

۵. رواج دینا کلوں کا۔

رسالہ نمبر ۴ میں ابتدا سے ۱۵ ستمبر لغایت دسمبر، ۱۸۶۵ء مطبع کوہ نور لاہور میں باہتمام منشی ہرنرائن پرنٹر چھپا۔

جلسہ عام ۱۵ ستمبر، ۱۸۶۵ء:

۱. مضمون زیادتی دروغ گوئی۔

۲. پنچایت کی ضرورت از پنڈت رادھا کشن۔

۳. اظہار نقص تقرر پنجاب و تصنیف مقدمات مروجہ حال واسطے مقرر ہونے کمیٹی بطور پنچایت کی ضرورت از حکیم دیوان چند،

۴. درباب نقص علاج ناخواندہ طبیبوں کے۔

۵. درپیشی شکایت دوا فروش از فقیر رکن الدین.

۶. خط سر سید احمد خان سکریڑی سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ

الشعراء تلامیذ الرحمٰن

رسالہ انجمن مشاعرہ "بیت العلوم" المعروف بہ "گلدستہ سخن" نمبر ۵ بابت ماہ اپریل، ۱۸۸۰ء، حسب الارشاد ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائٹنر صاحب بہادر، رجسٹرار پنجاب یونی ورسٹی کالج لاہور۔ مطبع انجمن پنجاب لاہور میں چھپا۔

فہرست گلدستہ سخن	صفحہ
۱. شیخ الٰہی بخش صاحب رفیق	۱ + ۲۰
۲. رام سہلاتے صاحب سنہا	۲
۳. محمد ظہور الدین صاحب، ظہور	۳
۴. حامد علی صاحب، حامد	۳ × ۹
۵. مولوی فیض الحسن صاحب، فیض	۴ × ۱۰
۶. قاضی فضل حسین صاحب، قاضی	۴ × ۱۱
۷. مولوی علاء الدین صاحب، عالی	۵ × ۵ × ۱۶ × ۲۱

باب۔ نہم

انجمنِ پنجاب کے اثرات

باب۔ نہم

انجمن پنجاب کے اثرات

انیسویں صدی برصغیر کے لیے درحقیقت بحث و مناظرہ کی صدی ہے۔ اِس میں مشرق و مغرب قدیم و جدید بدعت و سنت، شاہی و جاگیرداری مذہب اور سائنس جبلت و عقل غرض ہر شعبۂ زندگی میں ایک تصادم نظر آتا ہے۔ برصغیر میں مذہبی تصادم کی جدید تحریکوں کے اولین علم بردار عیسائی مشنری تھے۔ ان سرگرمیوں کا اصل محرک مذہب تھا۔ اور اسلام پر مشنریوں کے حملے کی زد بہت زیادہ منظم اور سخت تھی۔ اسلام اور عیسائیت دونوں کی بنیادی اصطلاحات کسی حد تک متحد اور باہم مانوس ہونے کے علاوہ عقائد اور ارکان ایک حد تک مشترک تھے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کو مغالطے میں ڈالنے کی کوشش کامیاب ہو سکتی تھی۔ برصغیر میں اسلامی سلطنت کے اثرات دور کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان کے دینی اور مذہبی احساس کو مٹا دیا جائے۔ تاکہ دینی ابتری کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی یک جہتی کو ختم کیا جا سکے۔

عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے مسلمانوں میں فرقہ بندی کی جنگ شروع ہوئی۔ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے نے ہندو دھرم کی قدیم روایات کو ایک حد تک خیرباد کہہ کر ایک نئے سلسلے خیال کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ تمام مذہب اصلاً ایک ہیں۔

پنجاب میں سوامی دیانند نے ہندوؤں میں بھارتی کی روح کو بیدار کرنے کے لیے آریہ سماج کی تشکیل کی لیکن اِس تحریک کی زد میں عیسائیت ہی نہیں بلکہ اسلام بھی تھا۔

اسلام کے لیے سب سے خطرناک آزمائش انیسویں صدی میں یورپ کے علمی افکار کی صورت میں ہندوستان میں نازل ہوئی۔ یورپ میں علوم کی اجتماعی ترقی کے ساتھ ساتھ نقل محض کے علاوہ سائنس کے تجربات و مشاہدات بھی تھے۔ اِن حربوں کے ساتھ عیسائیت نے اسلامی عقائد کی بنیاد پر شدید حملے کیے اور اسلام کو حقیقی خطرات سے دو چار ہونا پڑا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے جدید تعلیم کے نام سے تعلیمی تحریک شروع کی جس کی غرض و غایت سرکاری ملازم تیار کرنا اور کارندے مہیا کرنا تھا۔ اِسی تعلیمی تحریک کو ۱۸۵۷ء کے بعد حکومت برطانیہ نے جاری رکھا اور جدید سائنسی علوم کو ہندوستان میں بروئے کار لا کر یہ بتایا گیا کہ وہ جاہل محض ہیں۔

۱۸۵۷ء سے پہلے ۱۷۹۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ڈائریکٹر چارلس گرانٹ نے تعلیم کی تائید میں ایک رسالہ لکھنا شروع کیا جس میں اس نے لکھا ہے۔ کہ حکومت انگلستان کو چاہیئے کہ وہ ہندوؤں کو بتدریج ہماری زبان سکھائے اور ہمارے علوم و فنون کی تعلیم دے۔ یہ تعلیم خاموشی کے ساتھ تمام غلط باتوں کی عمارت کی بیخ کنی کر کے بالآخر اسے گرا دے گی جو اہم تعلیم ہندوؤں کو ہم اپنی زبان میں دیں اس سے وہ ہمارے مذہب سے مانوس ہو گئے اِن کے کم زور دل میں آزادی حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہو گی۔ اور وہ ہمارے مفادات کو نقصان نہ پہنچائیں گے۔

ابتدا میں اس رسالے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا لیکن ۱۷۹۹ء میں لارڈ ولزلی کی سرپرستی میں انگلستان سے دو پادری آئے۔ یہ اپنے طور پر عیسائیت کی تبلیغ کرتے رہے۔ ان میں سے ایک پادری مسٹر کیری کو فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر بنا دیا گیا اور دوسرے کپتان آرون کو عربی اور فارسی کا نصاب تیار کرنے پر مامور کیا۔ ادھر بنارس میں سنسکرت کالج قائم کیا گیا۔ اِن دونوں کالجوں

کی غرض و غایت قانونی اور عدالتی کاموں کے لیے ہندو اور مسلمان افسر تیار کرنا تھا۔

سنہ ۱۸۱۱ء میں لارڈ منٹو نے وائسرائے ہند کو ایک عرض داشت بھیجی جس میں مطلع کیا تھا کہ ہندو مسلمانوں میں مذہبی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے جرائم کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ لہٰذا مزید کالج کھولے جائیں۔ اس سفارش پر پہلی اور آخری بار ایک لاکھ روپے کی منظوری دی گئی۔ لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ ہندوؤں کے علوم اور خاص طور پر سنسکرت کی سرپرستی کی جائے لیکن دس سال تک اس رقم کو خرچ نہیں کیا گیا بلکہ پادریوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ انھوں نے برصغیر میں جگہ جگہ مدرسے کھولے اور چارلس گرانٹ کے منصوبوں پر عمل شروع کر دیا۔ سنہ ۱۸۱۶ء، سنہ ۱۸۱۷ء میں راجہ رام موہن رائے نے انگریزی کالج جو "ودیالہ" کہلاتا تھا قائم کیا۔ سنہ ۱۸۲۱ء میں پونا میں ایک ہندو کالج، سنہ ۱۸۲۳ء میں آگرہ کالج۔ کلکتہ مدرسے جیسے ادارے کھولے گئے۔ اور ۲۹ ستمبر سنہ ۱۸۳۰ء میں پہلی مرتبہ کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اس پالیسی کا اعلان کیا کہ انگریزی زبان کو تمام محکمہ جات سے رفتہ رفتہ جاری کر دیا جائے۔

راجہ رام موہن رائے نے اس کوشش پر کہ مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی میں تعلیم دی جائے سنہ ۱۸۳۴ء میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا اجلاس ۷ مارچ سنہ ۱۸۳۵ء کو منعقد ہوا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ لارڈ میکالے کو اس کمیٹی کا صدر چنا گیا۔ اس کمیٹی کی رائے میں اختلاف تھا۔ ایک فریق انگریزی زبان میں تعلیم دیئے جانے کا مخالف تھا۔ تو دوسرا اس کا حامی۔ جب رائے لی گئی تو دونوں فریقوں کے ووٹ برابر نکلے اس موقع پر لارڈ میکالے نے اپنے صدارتی ووٹ سے کام لے کر انگریزی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ بظاہر تو اعلان کیا کہ ہمیں ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہیے

جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق کے اعتبار سے انگریز ہو۔ لیکن حقیق رائے اس نے اپنے والد کو لکھ کر بھیجی جس میں لکھا تھا کہ بہت جلد یہ لوگ مذہب تبدیل کر کے یا تو موحد بن جائیں گے یا عیسائی۔

۱۸۳۷ء میں مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں کو تاکید کی کہ اپنے اپنے صوبوں میں بجائے فارسی کے صوبائی زبانوں کو فروغ دیں اور اسے سرکاری زبان کے طور پر استعمال کریں۔

اِس حکم پر تعلیم یافتہ لوگوں نے مخالفت کی وجہ یہ بتائی کہ انگریزی تعلیم ضرور دی جائے لیکن اسے تبلیغ کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اِس سلسلے کا پہلا احتجاجی مراسلہ صرف کلکتہ سے آٹھ ہزار دستخطوں سے لارڈ ولیم بینٹنگ کو پیش کیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم کے لیے مخصوص کردہ رقم صرف انگریزی تعلیم پر خرچ کی جانے لگی اور عربی کے مدرسوں کو جو تھوڑی بہت امداد ملتی تھی وہ اِس سے بھی محروم کر دیئے گئے۔ اور جہاں عیسائی مدرسے قائم تھے وہاں دوسرے مدرسے کھولنے کی ممانعت کر دی۔ اس پر اہل مدراس نے جس میں تمام مذہب و ملّت کے لوگ شریک تھے ۱۸۵۲ء میں پارلیمنٹ میں گورنر مدراس کے خلاف ایک عرضداشت کے ذریعہ سخت احتجاج کیا کہ سرکاری روپیہ عیسائی بنانے میں خرچ کیا جا رہا ہے۔ اِس موقعہ پر حکومت نے غیر جانب داری کا اعلان کر دیا۔

مذہب عیسوی کی اشاعت تبلیغ اور مذہب میں مداخلت کا سلسلہ بڑھتا رہا اور رعایا کے دلوں میں بدگمانیاں بڑھتی گئیں۔ دو مرتبہ مدراس اور بارکپور میں سپاہیوں نے بغاوت کی آخر کار ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔

۱۸۳۲ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اردو زبان کو عدالتی اور دفتری زبان قرار دیا تھا۔ تو دراصل اس کا مقصد فارسی زبان یعنی مغل حکومت کی بچی کھچی نشانی کو ختم کرنا تھا اہل ہند اور خاص طور پر مسلمانوں نے اس کو

ہی غنیمت سمجھا اگرچہ اس حکم کے نفاذ کی مدت صرف چھ ماہ تھی لیکن مذہبی کشمکش کے باوجود علوم جدیدہ کی اشاعت ہوئی۔ اگرچہ اِس تعلیم کا مقصد بھی برطانوی سلطنت کا استحکام اور مسلمانوں کی اشک شوئی تھا لیکن اہل برطانیہ نے اہل ہند کو تعلیم دی اور خود بھی مشرقی علوم سے آشنا ہوئے۔ زبان اُردو کے لیے یہ زمانہ بڑا ساز گار ثابت ہوا اِس میں سب سے اہم اردو پریس کا قیام ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد دہلی کالج نے اردو زبان کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا اور ان کالجوں کے اساتذہ کی ترجمہ اور تصنیف کردہ کتب اردو پریس کے ذریعہ طبع ہو کر ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئیں۔ قانونی اصطلاحات اردو کے قالب میں ڈھل گئیں۔ مولوی نذیر احمد کی خدمات اِس سلسلے میں ممتاز ہیں جن کے قانونی تراجم کی مدد سے ہزارہا الفاظ خواص و عوام کی زبان میں رائج ہو گئے۔

بہت سی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں اور اُردو کے طرز بیان اور محاورے میں انگریزی کی صاف گوئی اور روانی کو رواج پانے کا موقع ملا۔ مقفی اور مسجع عبارت کی جگہ سیدھا سادا انداز پیدا ہوا نصابی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں بڑی کثرت سے بیش بہا تراجم ہوئے، چوں کہ یہ کتب خالص علمی اور ادبی مباحث سے متعلق تھیں۔ لہٰذا رفتہ رفتہ زبان میں یہ صلاحیت پیدا ہونے لگی کہ سنجیدہ اور ٹھوس مضامین پر قلم اٹھایا جا سکے۔

۱۸۳۵ء میں پریس ایکٹ نافذ ہوا جس سے اخباروں کو آزادی دی گئی۔ مولانا آزاد کے والد مولوی باقر نے دہلی سے اُردو اخبار جاری کیا۔ پھر سر سید اور ان کے بڑے بھائی کی کوششوں سے "سید الاخبار" جاری ہوا۔

شاہ عبد العزیز نے انگریزی تعلیم سے استفادے کا فتویٰ دیا جس

کی وجہ سے مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے اور طالب علم جدید نقطۂ نظر سے طبیعات، کیمیا، ہیئت، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سیاستِ مدن، فلسفہ و اخلاق، صحافت، لغت سازی، تذکرہ و ترجمہ، ادب نسواں، مقالہ نگاری، مکتوب نویسی سے واقف ہوتے. اور ان علوم کو اردو کے ذریعہ حاصل کرنے اور ان کی اہمیت اور ضرورت سے واقف ہوتے.

جدید اردو ادب کے بانیوں میں سرسید، نذیر احمد، ذکاء اللہ، پیارے لال آشوب، محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال. مولانا حالی، شبلی اور غالب کا نام سرفہرست ہے.

لیکن اس اتحاد کے پارہ پارہ کرنے کی انگریزوں نے پوری پوری کوشش کی۔ اس موقع پر قصداً اردو کو ناگری رسم الخط میں لکھ کر اردو اور ہندی کے شعبوں کو علیحدہ علیحدہ کرکے انھیں ہندو اور مسلمانوں کی زبان کہہ کر ان کے دلوں میں مخالفت اور نفاق کا بیج بو دیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد سرسید نے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھ کر انگریزوں پر ثابت کردیا کہ انھوں نے اہل ہند کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی. ۱۸۶۶ء میں سرسید نے علی گڈھ میں ایک ادارہ "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے قائم کیا جس کا مقصد دونوں ملکوں کی مشترک اغراض کی ترقی تھا. سرسید ہی اس ایسوسی ایشن کے سکرٹری بنائے گئے.

۱۸۶۷ء میں اس ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک ورناکلر (اورینٹیل) یونی ورسٹی قائم کرنے کے لیے گورنر جنرل کو درخواست بھیجی۔ یہ بڑی اہم اور دوررس انقلابی تحریک تھی۔ درخواست میں تعلیم کی غرض و غایت بیان کی اور مروجہ طریقہ ناقص اور غیر کافی بتایا اور اردو ذریعہ تعلیم کی درخواست کرتے ہوئے لکھا:

"..... یہ کب ہوسکتا ہے کہ ہم خدائے تعالیٰ کی اس

قدرت کے برخلاف عمل کر سکیں جو بابل کے مینار پر اس نے
دکھائی۔ پس اگر یہ بات ممکن نہیں تو بجز اس کے کوئی علاج
اور تدبیر نہیں کہ اہل یورپ کی روشن ضمیری اور ان کا علم و فضل
لوگوں کو علی العموم سکھانے کیلئے دیسی زبان کو ذریعہ ٹھہرایا جائے۔"

اس درخواست میں سول انجینئرنگ کالج رڑکی اور میڈیکل کالج آگرہ کی بھی مثال دی گئی تھی۔ جہاں شاخ اردو کے طالب علموں کو اردو کے ذریعہ اور انگریزی سے اردو ترجموں کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ یہ طالب علم بعض اوقات انگریزی طالب علموں پر سبقت لے جاتے تھے۔

اس درخواست کا مقصد یہ تھا کہ یا تو اس غرض کے لیے یونی ورسٹی قائم کی جائے جس میں وہ تمام علوم وہ فنون جو کلکتہ یونی ورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں اس درس گاہ میں دیسی زبان کے ذریعہ پڑھائے جائیں ویسے ہی امتحان ہوں اور سندیں دی جائیں یہ حقیقت ہے کہ ایسی کتابیں موجود نہ تھیں لیکن جو کتابیں یونی ورسٹی کے نصاب میں تھیں ان کا ترجمہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس تجویز کو نامنظور کر دیا گیا۔

سرسید نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اور اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے ایک بار پھر کوشش کی "کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان" کی ایک منتخب کمیٹی میں تعلیم کے متعلق ایک بڑی تجویز پیش کی اور "مدرسۃ العلوم" (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) کے قیام پر زور دیا کمیٹی نے تفصیل پیش کی کہ:-
یہ تین مدرسوں پر مشتمل ہوگا۔ اول انگریزی، دوم اردو، سوم عربی فارسی، اردو کے متعلق یہ تجویز پیش کی کہ مجوزہ یونی ورسٹی میں تمام علوم و فنون اردو میں پڑھائے جائیں گے البتہ
مجوزہ یونی ورسٹی میں تمام علوم و فنون اردو میں پڑھائے جائیں گے البتہ
ہر طالب علم کو تینوں زبانوں میں سے ایک زبان بطور خاص مضمون کے اختیار کرنی ہوگی۔ اس یونی ورسٹی کا تعلیم یافتہ لڑکا اٹھارہ برس کی عمر تک

تمام سائنسی علوم اِس حد تک حاصل کرے گا جس قدر درجہ بی اے کے لیے مقرر ہیں۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں "کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر یہ تجویز نظر انداز کر دی گئی اور اس کے تجربے کا موقع نہیں ملا۔" ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے مندرجہ بالا تجویز میں کچھ ترمیمات کیں اور تجویز پیش کی کہ یہ یونی ورسٹی ایسی جگہ قائم کی جائے کہ سوائے نگرانی کرنے کے حکومت کسی قسم کی مداخلت نہ کرے۔ لیکن اِس تجویز کو بھی حکومت نے نامنظور کر دیا اس پر سرسیّد اور ان کی کمیٹی نے یونی ورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ ترک کر دیا اور معمولی کالج کے لیے امداد لینے پر مجبور ہو گئے جو کلکتہ یونی ورسٹی کے امتحان کی تیاری کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے مسلمانوں کو زندگی ہر شعبے میں لاچار و بے بس کر دیا تھا۔ انگریزوں کا پورا عتاب مسلمانوں پر تھا۔ ہندو ہر طرح انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ راجہ رام موہن رائے کی علمی تحریک کے بہتر نتائج سامنے آچکے تھے۔ حکومت کے ہر شعبے میں ہندو چھا چکے تھے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی زبان فارسی کو ختم کیا اور اس کے بدلے تھوڑے سے عرصے کے لیے اردو کو رائج کیا۔ مسلمان اِس تبدیلی سے خوش تھے۔ لیکن سرسید کو شک پیدا ہو چکا تھا۔ کہ اگر ذریعہ تعلیم اُردو کر دیا گیا تو مسلمان یورپ کے جدید علوم سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں انھوں نے اُردو یونی ورسٹی قائم کرنے پر زور دیا لیکن جب پنجاب یونی ورسٹی کی مثال ان کے سامنے آئی جس میں تمام رائج علوم کا کامیاب ترجمہ کیا جا رہا ہے، حالاں کہ یہ ابتدائی کوشش تھی۔ لیکن شک یہ کیا جا رہا ہے۔ کہ افادیت کے لحاظ سے وہ کم ہیں اور جن کے متعلق یہ شک تھا کہ ملک کی سیاسی اور اجتماعی فلاح کے کام میں تیز رفتار نہیں تھے۔ (حالاں کہ تجربہ اس کے برخلاف تھا) اسی لیے سرسید

نے اپنا نقطہ نظر تبدیل کر دیا اور انگریزی زبان و علوم پڑھنے پر زور دیا۔

اِن تمام تحریکوں کا مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا معاشرتی نظام جنم لے جو سیاسی طور پر بیدار ہو۔ برصغیر پاک و ہند میں اصلاحی اور تعمیری تحریکات کے فروغ میں اردو اخباروں اور رسالوں نے نمایاں حصّہ لیا۔ اِس سلسلے میں سر سید احمد خاں کے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق" نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ جن سے مسلمان قوم میں بیداری کے احساسات ابھر کر سامنے آئے۔ سر سید نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ قوم کا اس سے پہلے دو مختلف معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ ایک مطلب قوم کا ایسی جماعت تھا جو ایک شخص کی اولاد یا نسل میں ہوں اور ایک اور تصور قوم کا یہ تھا کہ ایک خاص ملک میں رہنے والوں کو ایک قوم شمار کیا جاتا تھا۔" سر سید نے لکھا ہے": قوم کا ایک تصور وہ ہے جو اسلام نے بخشا ہے۔ اِس میں نسل و رنگ یا جغرافیائی اساس کے بجائے قوم کی بنیاد ایک عقیدے لا الٰہ اللہ محمد الرسول اللہ پر ہے۔" یہ وہی تصور ہے جو بعد میں تفصیل کے ساتھ اقبال کے قوم کے تصور کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور جس کی بنیاد پر برصغیر پاک و ہند میں دو قوموں کے نظریے کو فروغ ہوا۔ اور جس کے نتیجے کے طور پر پاکستان اور ہندوستان کی دو آزاد اور خود مختار مملکتیں وجود میں آئیں۔

سر سید کی تحریک کو دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ مسلمانوں نے تعلیمی میدان میں جو کچھ سیاسی اور سماجی ترقی کی ہے وہ علی گڈھ یا اس کے اثر سے قائم ہونے والے دوسرے اداروں اور بعض مخلص مستشرقین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان مستشرقین میں بعض ایسے انگریز اعلیٰ افسران تھے جو دل سے اہل برصغیر پاک و ہند کے بہی خواہ تھے۔ یہ خود مشرقی زبانوں میں نہ صرف مہارت تامہ رکھتے تھے بلکہ اہل مشرق کی ثقافتی، تہذیبی اور معاشی ضروریات سے کما حقُہ واقف تھے۔ ان میں چند تو صوبہ پنجاب میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور چند

مرحوم دہلی کالج سے وابستہ تھے۔ جو دہلی کالج کے برباد ہو جانے کے بعد شمالی ہند میں آ گئے۔ خود انگریز حکام کی پالیسی بھی یہی تھی کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے مستفید ہونے کے لیے عوام اور خواص میں حسب ضرورت کارندے تیار ہوں لیکن ان مستشرقین کی پوری ہمدردیاں اہل ہند سے وابستہ تھیں یہی وجہ تھی کہ لارڈ میکالے کی سرکردگی میں ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں انگریزی اور اردو دونوں کے لیے برابر ووٹ حاصل ہوئے تھے۔ ان تعلیمی ضروریات نے تحریکوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور حکومت کے ناپسندیدہ ہونے کے باوجود ان تعلیمی تحریکات نے پورے ہندوستان میں سیاسی، اقتصادی اور سماجی بیداری پیدا کر دی تھی جن سے انگریز حکام خائف تھے۔ اِن تحریکات کو آگے بڑھانے میں ڈاکٹر لائٹز، ڈاکٹر ولز اور پروفیسر آرنلڈ وغیرہ کی ہمدردیاں شامل تھیں۔

ڈاکٹر لائٹز کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور ان کے علمی اور تعلیمی کارنامے بہت پہلو دار ہیں کہ ان کا جائزہ لینے کے لیے اِس وقت چند پہلوؤں کے بارے میں محض اشارات سے کام لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر لائٹز علم و عمل کے علاوہ ضابطہ پسند منتظم اور ایک ہمدرد شفیق استاد تھے۔ وہ مشرق و مغرب کی پچیس زبانیں لکھ پڑھ سکتے تھے اور ان پر گفتگو کر سکتے تھے۔ لسانیات اور صوتیات کے تحقیقی کارناموں کا اعتراف دیا نا کی بین الاقوامی حلقوں نے کیا تھا۔ مشرقی علوم و السنہ کے وہ ایک جید عالم تھے اس کے علاوہ خاص بات یہ تھی کہ وہ ایک ایسے ماہر تعلیم تھے جو کسی ملک کی تہذیب و روایات اور وہاں کے باشندوں کی نفسیات اور مزاج کے مطابق تعلیمی نظریات کی تشکیل کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر لائٹز کی شخصیت کا یہ رخ ایسا ہے جس نے برصغیر کی تعلیمی تاریخ میں گہرے اثرات چھوڑے۔

ڈاکٹر لائٹز ایسے وقت یہاں پہنچے جب برصغیر سیاسی محکومی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اور یہاں کے فکر و ذہن کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لیے

ایک ایسے تعلیمی سلسلے کا آغاز ہو چکا تھا جو یہاں کے محکوم باشندوں کو علم کے صحیح مرتبے و مقام پر پہنچانے کے بجائے علم کا سطحی تصور پیش کرتا تھا جس کا آغاز لارڈ میکالے نے کیا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اس سامراجی نظام تعلیم کے خلاف زبردست جہاد کیا اور حقیقی معنوں میں سرزمین پنجاب اور شمالی ہند میں آزادیٔ فکر کا سنگ بنیاد رکھا جو مشرق و مغرب قدیم و جدید کی ذہنی کاوش کا صحیح امتزاج تھا۔

ڈاکٹر لائٹنر جب لاہور پہنچے تو اس وقت شمالی ہند اور پنجاب میں کلکتہ یونی ورسٹی کا اقتدار مسلط تھا جو یہاں کی ذہنی فضا سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ انھوں نے پنجاب اور شمالی ہند کے نصابات کو ان کا صحیح مقام دلانے میں پرزور جدوجہد کی اور وہ اِس میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ یہاں کے لوگ حکومت وقت کے احکامات پر تنقید کرنے کے لائق ہو گئے جس پر گورنر کی طرف سے انھیں تہدیدی خط لکھا گیا۔ اور ڈیوک آف ونڈسر کی آمد پر انھیں القاب و اعزاز سے محروم رکھا گیا۔ انجمن پنجاب کی بنیاد جو اگرچہ انھوں نے حکومت کے ایما پر ہی ڈالی تھی۔ لیکن یہ انجمن بہت جلد پنجاب کے اھل فکر و نظر کی نمائندہ بن گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر اپنی ذات میں یہاں ایک ایسی قوت بن گئے تھے جس کے ارکان حکومت خواہ وہ مرتبہ میں ان سے برتر ہوں یا فروتر خائف رہتے تھے لیکن پنجاب کے عوام کے وہ محسن تھے۔ انھوں نے یہاں رہ کر ان کے لیے تہذیبی جنگ لڑی تھی۔ طرح طرح کی مشکلات کے باوجود حکومت سے مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کی اہمیت کو تسلیم کروالیا۔ یہ ڈاکٹر لائٹنر کی مسلسل جدوجہد اور ہمت و استقامت کا نتیجہ تھا۔ کہ پنجاب یونی ورسٹی نے اپنے مقاصد میں اسی تہذیبی عنصر کو سر عنوان بنالیا۔ جس میں دیسی زبانوں کی ترقی و مشرقی علوم والسنہ کے فروغ کو بنیادی اہمیت دی گئی۔

ایسے ہی ایک اور مستشرق ۱۸۸۸ء میں آرنلڈ۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڈھ میں پروفیسر مقرر ہو کر ہندوستان آئے۔ علی گڈھ کے زمانۂ قیام میں ان کی شخصیت پر اسلامی علوم و فنون کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ علامہ شبلی نے اور آرنلڈ نے ایک دوسرے سے استفادہ حاصل کیا۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں آرنلڈ محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے اور ۱۱ر فروری، سنہ ۱۸۹۸ء سے گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں اورنیٹل کالج کے قائم مقام پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر اے۔ ڈبلیو۔ اسٹرائن جب اورنیٹل کالج کے پرنسپل بن کر آ گئے۔ تو آرنلڈ واپس گورنمنٹ کالج میں اپنے منصب پر چلے گئے۔ ڈاکٹر اسٹرائن کے انتقال پر ۲۳ر اگست، سنہ ۱۹۰۲ء کے بعد آرنلڈ اورنیٹل کالج لاہور میں دوبارہ پرنسپل کی حیثیت سے کام کرنے لگے حتیٰ کہ سنہ ۱۹۰۳ء کے بعد مسٹر اے سی وولز کالج کے مستقل پرنسپل مقرر ہوئے اور آرنلڈ پھر گورنمنٹ کالج میں چلے گئے۔ یہ ہر دل عزیز پروفیسر تھے ڈاکٹر اقبال ان سے بہت متاثر تھے۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں پروفیسر آرنلڈ انڈیا آفس لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے چلے گئے۔ تھوڑے دن بعد یونی ورسٹی کالج لندن میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں انڈیا آفس نے انھیں انگلستان میں ہندوستانی طلباء کا مشیر بھی مقرر کیا۔ اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی اہم خدمات انجام دیتے رہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں پروفیسر آرنلڈ کو سر کا خطاب ملا۔

اسی طرح ڈاکٹر اے۔ سی۔ وولز نے اورنیٹل کالج اور پنجاب یونی ورسٹی کی تنظیم و ترقی کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیں وہ برِاعظم کی تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ جس وقت وہ یہاں آئے اس وقت اورنیٹل کالج اور یونی ورسٹی کے کسی دوسرے ادارے کی اپنی عمارت نہ تھی

لیکن اے۔ سی۔ ولز کے عہد میں اورنیٹیل کالج، لا کالج، ھیلی کالج، آف کامرس کی اپنی عمارتیں بن چکی تھیں۔ اِن ہی کے عہد میں یونی ورسٹی لائبریری دیگر ادارے اور پنجاب یونی ورسٹی صحیح معنوں میں برعظیم کی ایک باوقار یونی ورسٹی بن چکی تھی۔۔ ڈاکٹر ولز پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی بنائے گئے۔ یہ پہلا بڑا اعزاز تھا جو اورنیٹیل کالج کے ایک پرنسپل کو ملا تھا۔ اِن مناصب کے علاوہ پروفیسر ولز ابتدا ہی سے انٹر یونی ورسٹی بورڈ کے سرگرم رکن رہے۔ ۳۰-۱۹۲۹ء میں وہ اِس بورڈ کے چیرمین تھے سنہ ۱۹۲۸ء میں حکومت ہند نے مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ کی اصلاح و تنظیم کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں۔ یونی ورسٹی لائبریری کی رکینت کے علاوہ انھوں نے کچھ عرصہ لائبریرین پنجاب یونی ورسٹی کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ ڈاکٹر ولز لنگوسٹک سوسائٹی آف انڈیا کے رکن، پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے بنیادی رکن اور منروا کلب کے بانی اپنی انتہائی اہم ذمہ داریوں کے باوجود تدریسی تحقیقی اور علمی کاموں میں باقاعدہ حصّہ لیتے رہے اور نہایت خوش اسلوبی سے انھیں سرانجام دیتے رہے۔ وہ بین الاقوامی علمی شہرت کے مالک تھے۔ غرض ڈاکٹر ولز ۳۳ برس تک اورینٹیل کالج اور پنجاب یونی ورسٹی کی خدمات انجام دیتے رہے اور بروز منگل ۷، ار جنوری سنہ ۱۹۳۶ء کو لاہور ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

انجمن پنجاب بھی دیگر ادبی تحریکوں کے انداز کی ایک تحریک تھی لیکن اِس تحریک میں ہمہ گیری اور ہمہ جہتی پائی جاتی ہے۔ دیگر ادبی تحریکوں کی بہ نسبت یہ ایک فعال تحریک تھی۔ ادبی نقطۂ نظر سے اگر اس زمانے کے اُردو ادب پر ایک غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے پہلے اردو شاعری اور نثری تصانیف کا ایک بڑا حصہ خیالی مضامین پر مشتمل تھا۔ اِن ادبی تخلیقات کا معیار اِن کا اسلوب، طرز ادا اور زبان دبیان کا حسن تھا۔

اور اس کا مقصد محض ادب برائے ادب تھا۔ مشاعروں اور ادیبوں کے سامنے ادب کی تخلیق کا کوئی سماجی یا تعلیمی یا اصلاحی مقصد نہ تھا۔ شاعری میں خیالی مضامین کی تکرار نے ایسی بے لطفی پیدا کر دی تھی کہ حالی نے انھیں شعر و قصائد کے ناپاک دفتر کہا۔ نثر کا یہ حال تھا۔ ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی طویل داستانوں کے سلسلے میں لکھے گئے تھے۔ ان کی یہ اہمیت ضرور ہے کہ ان کی وجہ سے ہمیں اس زمانے کے خیالات و رجحانات اور میلانات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور لسانی اعتبار سے ایک واقعہ یا سانحہ کو بیان کرنے کے لیے لاکھوں الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اس طرح اس زمانے میں اردو زبان کا ایک بڑا ذخیرہ ان داستانوں اور کہانیوں میں محفوظ ہو گیا۔ ادب برائے زندگی کی کوشش میں انجمن پنجاب نے بڑی گراں قدر خدمات دی ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد برصغیر پاک و ہند میں جو معاشی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی بدحالی پھیل چکی تھی ان کی از سر نو تنظیم کے سلسلے میں انجمن نے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ انگریز حکام اور عوام کے درمیان یہ سب سے بڑا واسطہ بن گئی۔ اور اصلاح معاشرہ کے لیے اہم اقدامات کیے۔ انجمن پنجاب اب محض ادبی انجمن نہ تھی بلکہ اس کے ممبر ادیبوں اور شاعروں نے شعوری طور پر ادب کا رشتہ اپنے زمانے کی سیاست اور سماج سے جوڑ کر اجتماعی زندگی کے مسائل کا عقلی حل پیش کرنا شروع کر دیا زندگی کی مادی ضرورتوں کو براہ راست قابل توجہ قرار دے کر ارضی زندگی کی ترقی و تکمیل پر زور دینے لگے ادب کی تفریحی و ذوقی حیثیت بدل کر اسے اجتماعی مقاصد سے روشناس کرایا۔ اس کا رخ تخیل اور داخلی زندگی سے ہٹا کر واقعیت اور خارجی زندگی کی طرف موڑ دیا۔ اس سے اخلاقی، فکری، سماجی، تہذیبی اور سیاسی اصلاح کا کام لینے لگے۔ اسی طرح انجمن اور اس کے اراکین نے پہلی مرتبہ ادب کی عمرانی و تہذیبی اہمیت کا اندازہ

لگا کر اردو میں مقصدی شعروادب کی تخلیق کی روایت قائم کی۔ مقصدیت اور اصلاح پسندی کا رویہ شعرا اور مصنفین میں معاشرتی ذمہ داری کا احساس انجمن پنجاب کے بعد اردو ادب کی ہر صف میں صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد اہل ہند خود اس بات کو محسوس کرنے لگے تھے کہ اب ہندوستان میں ایک کامیاب اور باعزت زندگی کے حصول کے لیے علوم مشرقی کے علاوہ جدید علوم وفنون کی تحصیل اور زندگی کے ہر گوشے میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ ان میں اس بات کا بھی احساس پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اِن مقاصد کی تکمیل میں حکومت کی امداد اور تعاون سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ چناں چہ انجمن پنجاب کے قیام کے بعد پنجاب، سرحد، اور شمالی ہند کے متعدد شہروں میں انجمن پنجاب کی شاخیں قائم ہوئیں۔ انجمن کے ممبر جو سرکاری عہدوں پر فائز تھے جب لاہور سے تبدیل ہو کر کسی اور جگہ جاتے تو انجمن کی شاخیں کھولتے۔ اور انجمن کے ممبر بناتے یا کسی شہر کے عہدے دار خود انجمن کی کارکردگی سے متاثر ہو کر کسی بھی سربراہ شہر کی سرکردگی میں انجمن کی شاخ کھول لیتے۔ ہندوستان کے مختلف ریاستوں اور رؤساء کی طرف سے انجمن کو ماہانہ یا سالانہ چندے کتابیں اور نمائش کے موقع پر نوادرات مصنوعات فراہم کرتے۔

جیسا کہ اِس سے پیشتر لکھا جا چکا ہے انجمن پنجاب نے پہلا کام جو کیا وہ کالج یونی ورسٹی کا قیام تھا۔ لیکن نصاب کے لیے کتابیں موجود نہ تھیں لہذا انجمن نے ادبی نشستوں کا اہتمام کیا اور اشتہار کے ذریعہ انعامات کا اعلان کیا۔ اس کے نتیجے میں اردو زبان میں پہلی مرتبہ بہترین نصابی اور علمی مضامین فراہم ہو گئے۔ ان مضامین کو جلسۂ عام میں پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ اور صاحب علم کو ان پر تنقید کرنے کا پورا پورا موقعہ دیا جاتا تھا۔ اگر مضمون ناقابل

اشاعت ہوتا۔ تو اراکین اسے مسترد کر دیتے ورنہ وہی مضامین نصاب میں شامل کر لیے جاتے۔ چوں کہ اِس کالج کے قیام کا مقصد ہی السنہ شرقیہ کا احیا، تھا لہٰذا فارسی، سنسکرت، ہندی، اور اردو میں مضامین وصول ہوتے تھے اور انھیں حسب شعبہ تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون مثلاً سائنس، طب، سیاست مدن، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ ہر مضمون میں وافر مضامین لکھے گئے اور نصاب میں شامل کر کے اردو ذریعہ تعلیم کے وسیلے سے انھیں عوام و خواص میں مقبول بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مضمون پر وافر مواد مہیا ہو گیا۔ حالاں کہ سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی نے بھی سائنسی علوم پر کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں لیکن اِس کی حیثیت ایک تجربہ گاہ سے بڑھ کر نہیں تھی۔ لیکن انجمن کے اِن مقالوں نے یہ ثابت کر دیا کہ تمام جدید علوم اُردو میں منتقل ہو کر بہتر تعلیم کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

ترجموں کے علاوہ طبع زاد مقالوں کی اہمیت اِس لیے اور زیادہ ضروری اور مستحکم ہو گئی کہ انگریزی کو بطور لازمی زبان کے پڑھایا جاتا تھا۔ اِس طرح مصنفین نہ صرف نئے موضوعات سے واقف ہوتے تھے بلکہ نئے نئے اسالیب سے واقف ہو جاتے تھے۔ اِس کے علاوہ لِسانی اعتبار سے بھی اردو زبان میں نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہوا۔ نئے الفاظ اور سائنسی تکنکی اصطلاحات کے متعلق انجمن کے جلسوں میں پہلے بحث کی جاتی تھی پھر انھیں استعمال کی اجازت ملتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا جو الفاظ، اصطلاحات یا اسالیب نصاب میں شامل ہوتے وہ فوراً رسالہ انجمن پنجاب میں شائع کر دیتے جاتے تھے۔ اور وہ برصغیر کے کونے کونے میں پہنچ جاتے تھے۔ اگر مولانا آزاد کے علمی مقالوں کو بغور پڑھا جائے تو طویل استعاروں میں جدید افسانے کے خاکے بھی مل جاتے ہیں۔ ان مقالوں اور نصابی مضامین کے علاوہ علمی اور ادبی انشائیے بھی بکثرت لکھے گئے جنھوں نے مستقبل کے لیے انشا پردازی کی مثالیں پیش کیں۔ اس طرح اُردو

کے علمی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا اور دوسرے علاقوں کے مقابلے میں پنجاب میں علوم جدیدہ کا رواج جلد ہوا۔

اُردو شاعری میں قطب شاہی خاندان اور دکنی شعرا کے علاوہ شمالی ہند میں ناسخ کے زمانے تک اردو شاعری میں مختلف الفاظ تراکیب مرکب الفاظ اور اصنافِ سخن میں طرح طرح کے قیمتی اضافے ہوتے رہے لیکن ان اضافوں میں کہیں رطب یابس بھی شامل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ جرأت انشا اور مصحفی کا زمانہ شاعری کے زوال کا زمانہ ہے شاعری کی روح اور تاثر ختم ہو گیا لیکن ناسخ نے لسانی اعتبار سے صنفِ غزل اور دیگر اصناف سخن میں ایسے بہت سے الفاظ ترک کر دیئے جواب بے روح ہو چکے تھے۔ ناسخ کی زبان کا واضح اثر غالب کی زبان و بیان میں پایا جاتا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ نے بڑی غیر معیاری اور مضحکہ خیز روش اختیار کر لی تھی۔ ۱۸۵۷ء سے کچھ عرصہ قبل کا زمانہ اِس قدر مختصر اور اس کے شاعر اِس قدر کم تھے کہ دبستانوں کا فرق بالکل ختم نہ ہو سکا۔ اِسی زمانے میں صنفِ غزل نے یقیناً بڑی ترقی کی لیکن یہ زمانہ ایسا نہیں تھا کہ جس میں کھل کر دل کی بات زبان پر آجاتی پھر بھی بہت محتاط طریقے پر غزل میں زمانے کی غیر یقینی حالت اور مستقبل کے اِشارے نظر آتے ہیں۔

اِن مشاعروں سے پہلے نظیر پہلے عوامی شاعر ہیں جن کی شاعری ادب برائے زندگی کی علم بردار ہے۔ لیکن اِس رجحان کا کیا کیا جائے جس نے انھیں شاعر ماننے ہی سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے کلام میں وہ تمام لوازمات معہ الفاظ اور اسالیب کے موجود ہیں جو عوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔

البتہ انجمن پنجاب میں جدید اردو شاعری کا آغاز عجیب طریقے سے ہوا۔ چوں کہ نصاب تیار کرنے کے سلسلے میں جب حصہ نظم کو جانچا گیا تو اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ چناں چہ جن موضوعات کی ضرورت تھی انھیں عنوان کا درجہ دے

کر نئی طرز کے مشاعروں کا آغاز ہوا یہ مشاعرے اُردو شاعری میں نئے رجحانات کے علم بردار ہیں۔ حالی اور آزاد کے ہاتھوں یہ مشاعرے پروان چڑھے۔ ان عنوانی مشاعروں کی خصوصیت یہ ہے کہ عربی اور فارسی کے مشاہیر کے ساتھ برصغیر اور یورپ کے نامور کردار بھی اردو شاعری میں رواج پا کر روایت بن گئے۔ اِن کے ساتھ معہ شاعرانہ لوازمات کے لِسانی اعتبار سے بھی ان نئی روایات، الفاظ اور شاعرانہ اسالیب مثلاً حب الوطنی کے جذبات منظر نگاری، حقیقت نگاری، سادگی صفائی اور برجستگی بھی اپنے پورے آہنگ کے ساتھ اردو شاعری میں رچ بس گئی۔ شاعرانہ نقطہ نظر سے یہ مشاعرے تجربے سے زیادہ نہیں اِن میں بعض نظموں میں شاعرانہ لطافت مفقود ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر صاحب ذوق اور ہر صوبے کا شاعر اِن مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔ ورنہ اپنا کلام لکھ کر بھیج دیتا تھا۔ اور ان کی نظمیں مشاعروں میں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں۔ اِن لوگوں میں سے تارا چند حلوائی اور مدراس کے طلسم حیرت اخبار کے مہتمم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ طویل نظمیں مسدس، مخمس، مستزاد وغیرہ کی شکل میں لکھی گئیں یہ پیمانے پرانے تھے لیکن جدید خیالات سے لبریز۔

اِس کے علاوہ لِسانی اعتبار سے اور موضوع کے لحاظ سے بھی ان نظموں میں انگریزی اور ہندی کے الفاظ بڑی بے تکلفی سے استعمال کئے گئے ہیں اگرچہ یہ مشاعرے ایک سال کے اندر ہی ختم ہو گئے لیکن ان کی گونج نے برصغیر پاک و ہند کے شعرا کے ذہنوں کو بدل کر رکھ دیا۔ اور اِس جدید شاعری کی بنیاد پڑ گئی جس سے آج اُردو زبان مالا مال ہے۔ اِس موضوع پر اِس قدر لکھا جا چکا ہے کہ مزید کچھ لکھنا لا حاصل ہے لیکن یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جدید اردو شاعری کا سنگِ بنیاد رکھنے والے جہاں آزاد اور حالی جیسے جید عالم ہیں وہاں ہند کے عام آدمی بھی موجود ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اب شاعری کا رخ بدل چکا ہے اور وہ بھی ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ یہ انجمن پنجاب ہی کا

فیض تھا کہ حالی نے اپنی معرکتہ الآرا نظم مدوجزر اسلام کہہ کر مسلمانوں کو اِن کی عظمت رفتہ کا آئینہ دکھایا اب مفکرین کے سامنے اپنی راہیں ہموار کرنے کے لیے زبان وبیان کے انداز موجود تھے۔ انجمن نے پنجاب میں ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ سیالکوٹ سے علامہ اقبال جیسی بزرگ ہستی پیدا ہوئی جنھوں نے، شمع وشاعر، ذوق وشوق اور ساقی نامہ جیسی نظمیں کہہ کر بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور مسلمانوں میں آزادی حاصل کرنے کی لگن پیدا کر دی۔

۱۸۶۵ء سے پنجاب پر اثر انداز ہونے والے تمام اقدامات انجمن پنجاب کا خاص تعلق رہا ہے مقالہ نگاری اور مشاعروں کے علاوہ نہایت اہم کام پبلک لائبریری کا قیام تھا جس وقت انجمن کے عام اجلاس میں لائبریری کے قیام کی تجویز منظور ہوئی اِسی ہفتے انجمن کے ممبروں نے اپنے ذاتی کُتب خانوں سے لائبریری کے لیے کتابیں عارتیاً بھیج دیں اور اِس طرح اہل ذوق کے ذاتی کتب خانوں کی اہم اور نایاب کتابیں اور رسائل پبلک لائبریری میں جمع ہو گئے۔ یہاں لاہور اور صوبہ پنجاب میں شائع ہونے والے تمام اخبارات اور رسائل اب عوام کے علمی ذوق کی تسلی کے لیے مہیا کر دیئے گئے تھے۔

انجمن ہر سال ایک میلۂ مویشیاں اور فن زراعت اور ایک میلۂ دستکاری کا منعقد کرتی تھی۔ میلہ مویشیاں کا افتتاح صوبے کا گورنر خود کرتا تھا اور عوام میں اپنے صوبے کی زراعت زیادہ کرنے اور مویشی پالنے اور نسل بڑھانے کا شوق پیدا ہوا۔ کیوں کہ اچھے تندرست مویشیوں اور عمدہ زراعت پر انعامات تقسیم کیے جاتے تھے اس کے علاوہ لوگوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے اور خرید و فروخت کے اچھے مواقع میسر آجاتے تھے۔ اِسی طرح میلے کے موقع پر فن زراعت پر کتابچہ شائع کر کے اور فصل کی عمدہ ترکاریاں اور اناج

پیدا کرنے کا شوق بڑھایا جاتا تھا۔

انجمن پنجاب چوں کہ ہر شعبۂ زندگی سے منسلک تھی لہٰذا دہی زندگی میں بھی ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ گھر گھر تعلیم کے چرچے کے ساتھ ساتھ پنچائت کے فرسودہ نظام کی از سر نو تشکیل کی گئی۔ ہر کسان کی استطاعت اتنی نہ تھی کہ وہ مخالف جماعت یا فرد کے خلاف عدالت تک پہنچ سکے لہٰذا ہر گاؤں کی چوپال میں مکھیا کے ساتھ پنچوں کا تقرر ہوا اور ایک دفتر رکھا گیا جہاں فیصلے مندرج ہوتے تھے۔ پنچائیت کے علاوہ انجمن نے کسانوں کو حقوق مزارعانہ بھی دلواتے جس کی وجہ سے بڑی حد تک کسان زمینداروں کے دست نگر نہ رہتے پنچائیت میں جو فیصلہ نہ ہو سکتا تھا وہ حکومت کے ملازم رکھے ہوئے منشی کی معرفت عدالت دیوانی میں جاتے تھے۔ اور فیصلہ کیا جاتا تھا۔ یہ تمام کارروائی اردو میں ہوتی تھی۔

اس کے علاوہ قصور میں صنعتکاری کا مدرسہ قائم کیا گیا یہاں مختلف دست کاریاں سکھلائی جاتی تھیں۔ اور پھر ان کی سالانہ نمائش ہوتی تھی جس میں ایک مرتبہ تمام گورنروں کے علاوہ گورنر جنرل ہند بھی شریک ہوئے۔

انجمن پنجاب کے ممبر چوں کہ اکثر و بیشتر حکومت وقت کے ملازم روساء اور اہل علم تھے لہٰذا ان لوگوں کا جہاں بھی تبادلہ ہوتا وہ وہاں جا کر انجمن کی شاخ قائم کرنے اور وہاں بھی اسکول زراعت پنچائیت اور دست کاری میلے وغیرہ کا انتظام کرتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے شمالی ہند میں یعنی پنجاب صوبۂ سرحد، اور کشمیر تک اس کی شاخیں پھیل گئیں۔ اب حکومت ہند اور عوام کے درمیان انجمن پنجاب ایک اہم ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے روشن خیالی عام ہوئی۔ انجمن پنجاب کی روئداد اس کے رسالے میں شائع کی جاتی تھی اور یہ رسالہ ہندوستان کے تمام شہر اور مطابع میں بھیجا جاتا تھا۔ اس کے بدلے ہر شہر کے مشہور رسائل یہاں پہنچتے تھے۔ جس کی وجہ سے حکومت اور عوام کے درمیان

افہام و تفہیم کا راستہ صاف ہو گیا۔ لوگوں میں ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی سوجھ بوجھ نئے انداز اور نئے رجحان کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ حکومت وقت نے انجمن کو اس قابل سمجھا کہ اکثر و بیشتر کتابیں جو مذہب یا زبان سے متعلق ہوتیں وہ انجمن کے ممبروں سے مشورہ طلب کرتی مثلاً حقوق نسواں کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ عورتوں کو بموجب شرع کے حصہ ملنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ تاریخی کتب پر خاص طور پر اور رنگ زیب پر جو کتاب لکھی گئی اور جو اپنے موضوع اور سیاسی اسلوب کی وجہ سے بڑی اہمیت کی حامل تھی بڑی صاف گوئی سے اس پر رائے زنی کی گئی۔

لسانی مسائل کے لیے بھی حکومت نے نئی اصطلاحات اور قدیم حروف مثلاً سائنسی اصطلاحات اور ٹ۔ ڈ۔ ڑ کے استعمال کے لیے قاعدے مقرر کئے جو پورے ہند میں شائع ہوئے۔

انجمن نے اپنی کوششوں سے کتابوں پر جو محصول لیا جاتا تھا اسے حکومت سے معاف کرایا اب کتابوں کا لین دین آسان سے آسان تر ہو گیا۔ اس کے علاوہ پاگل خانوں میں پاگلوں سے طرح طرح کی مشقت لی جاتی تھی اس مسئلے کی طرف حکومت کو متوجہ کیا جس کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد ہوا۔

باہر کی دنیا میں انجمن نے اپنی اصلاحات کو جاری نہ رکھا بلکہ گھروں میں بھی اسی طرح اپنی اصلاحات جاری رکھیں لہذا سب سے پہلے تو زنانہ مدرسے کھولے اس کے ساتھ ہی عورتوں کی دستکاری کے اسکول بھی قائم کئے اس کے علاوہ ہندو مسلمانوں میں شادی بیاہ کے موقع پر یا کسی کے انتقال پر جو رسوم ادا کی جاتی تھیں ان پر بھی بڑی کڑی تنقید کی۔ ادیبوں نے مضامین لکھے اور جلسوں میں سنائے گئے اور رسالے میں شائع کروائے گئے۔ ساتھ ساتھ ممبروں نے یہ بھی طے کیا کہ وہ خود سب سے پہلے ان پر عمل کر کے مثال قائم کر دیں گے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی پنجاب کی سادگی اور سادہ لوحی کی مثال

دی جاتی ہے۔

یہ انجمن پنجاب ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ آج بھی اکثر گھرانوں میں السنہ شرقیہ کے کتب خانے موجود ہیں اور تمام صوبوں سے زیادہ پنجاب ہی میں اردو زبان بولی اور سمجھی اور پڑھی لکھی جاتی ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں بہت سی تحریکیں اٹھیں اور وقت کے ساتھ ختم ہو گئیں لیکن انجمن پنجاب ایک ایسی فعال ہمہ جہتی اور ہمہ گیر تحریک تھی کہ اس کے باقیات الصالحات آج بھی اورینٹیل یونیورسٹی پبلک لائبریری۔ عجائب گھر اور خود پنجاب کی تہذیب اس کی نشان دہی کرتی ہے۔

ضمیمہ

ضمیمہ

اورینٹیل کالج

درسی کتب[1]

اورینٹیل کالج میں نصابی کتب یہ تھیں :

(اول) صیغۂ اردو :

(الف) امتحان پروفیشنسی اِن آرٹس۔

علوم ریاضی :

۱. برنرڈ سمتھ صاحب کی کتاب حساب (مطبوعہ)

۲. ٹاڈہنٹر صاحب کی کتاب جبر و مقابلہ، (مطبوعہ)

۳. ٹاڈہنٹر صاحب کی کتاب اقلیدس، (مطبوعہ)

۴. ٹاڈہنٹر صاحب کی کتاب علم مثلث، (مطبوعہ)

۵. ٹاڈہنٹر صاحب کی کتاب علم سکون جو زیرِ اشاعت ہے۔

تواریخ :

۶. ٹیلر صاحب کی تواریخ متقدمین اِس کے خلاصے کا ایک نسخہ زیر طبع ہے۔

۷. بلین فورڈ صاحب کا جغرافیہ طبعی تیار تھا مگر اِس کی اشاعت بوجہ

---

[1] "رپورٹ کالج علوم مشرقی"، لاہور : ۳۰ جون، ۱۸۷۸ء، بابت سال ۱۸۷۷-۷۸ء، ص ۱۷

اِس کے کہ سررشتہ تعلیم میں بھی وہ شائع ہوا مسدود ہے۔

۸۔ جغرافیہ عام۔ مفتاح الارض سابق کا چھپا ہوا ہے۔

علم الہیات:

۹۔ فولر صاحب کا رسالہ منطق منتج، (مطبوعہ)

۱۰۔ سیاست مدن سپینسر صاحب کے رسالہ کا ترجمہ آگے ہی علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی شائع کر چکی ہے اور ایک چھوٹا سا رسالہ اسسٹینٹ پروفیسر ترجمہ کر رہا ہے۔

علوم طبعی:

۱۱۔ علم کیمیا مصنفہ راسکو صاحب (مطبوعہ)

۱۲۔ علم زمین درسالہ کوک صاحب کا ترجمہ ہو رہا ہے۔

(ب) علوم ریاضیہ:

۱۔ علم حرکت مصنفہ بابو ساسی بھوشن مکرجی صاحب تیار۔

۲۔ علم نجوم۔ جو خاص کر لاکیر صاحب کی کتاب کا ترجمہ ہے پنجاب یونی ورسٹی کے دفتر میں موجود ہے۔

۳۔ علم سکون مائیعات و سیالات۔ مصنفہ بیٹ صاحب ترجمہ اسسٹینٹ پروفیسر نے شروع کر دیا ہے۔

۴۔ علم مثلث کروی مصنفہ ٹاڈ ہنٹر صاحب۔ مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب ترجمہ کر کے شائع کر چکے ہیں۔

۵۔ ہندسہ یا الجبرا۔ مصنفہ ٹاڈ ہنٹر صاحب۔ محمد ذکاء اللہ صاحب شائع کر چکے ہیں۔

۶۔ ٹاڈ ہنٹر صاحب کی کتاب اقلیدس مجسم۔ ابھی ترجمہ نہیں ہوئی مگر غالباً دیسی کتب میں سے نکال دی جاوے گی۔

تواریخ و جغرافیہ:

۷۔ الفنسٹن صاحب کی تواریخ ہند، اِس کا ترجمہ پہلے ہی سین ٹیفک سوسائٹی علی گڈھ شائع کر چکی ہے۔

۸۔ ہیوم صاحب کی تواریخ ہند۔ اِس کا ابھی ترجمہ نہیں ہوا لیکن کالیر صاحب کی تواریخ انگلستان کا ترجمہ موجود ہے جو اسسٹینٹ پروفیسر کی طرف سے زیادہ تواریخی حالات کے ساتھ فی الحال اِستعمال ہو سکتی ہے۔

جغرافیہ طبعی:

۹۔ بیین فورڈ صاحب کا ترجمہ استعمال ہوتا ہے۔

سیاستِ مدن:

۱۰۔ سیاستِ مدن۔ مل اور سپنسر صاحبان کی کتابوں کا ترجمہ موجود ہے۔

علوم طبعی:

۱۱۔ علم کیمیا۔ مصنفہ راسکو صاحب ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

۱۲۔ علم زمین مصنفہ پیج صاحب۔ ابھی ترجمہ نہیں ہوا۔

دُوم۔ صیغہ ہندی

(الف) پروفیشنی ان آرٹس

علوم ریاضی:

۱۔ حساب برینڈ سمتھ صاحب۔ ابھی ترجمہ نہیں ہوا۔ مگر ہندی میں حساب کی کار آمد کتابیں موجود ہیں۔

۲۔ جبر و مقالہ۔ مصنفہ ٹاڈ ہنٹر صاحب۔ انٹرنس کی تعلیم تک ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور باقی ماندہ ہو رہا ہے۔

۳۔ اقلیدس ترجمہ ہو کر شائع ہو گیا ہے۔

۴۔ علم مثلث ۔ اِس کا رسالہ بابو لکشمی شنکر آگے ہی شائع کر چکے ہیں۔

۵۔ علم سکون ۔ ترجمہ ہو گیا مگر چھپا نہیں۔

تواریخ و جغرافیہ :

۶۔ ٹیلر صاحب کی تواریخ متقدمین کا ترجمہ چھپ رہا ہے

۷۔ جغرافیہ طبعی ۔ مصنفہ ہیج ۔ ترجمہ ہو رہا ہے۔

۸۔ جغرافیہ عام ہندی میں چھپ چکا ہے۔

الٰہیات :

۹۔ منطق منتج ۔ مصنفہ نولو ۔ ترجمہ ہو کر چھپنے کے لیے تیار ہے۔

۱۰۔ سیاستِ مدن ۔ مصنفہ فاسٹ اور نیز ایک چھوٹا سا رسالہ ترجمہ ہو کر چھپنے کے لیے تیار ہے۔

علوم طبعی :

۱۱۔ کیمیا مصنفہ راسکو ۔ اُردو ترجمہ ہندی میں نقل ہو رہا ہے۔

۱۲۔ علم زمین ابھی ترجمہ نہیں ہوا۔

(ب) ھائی پروفیشنی ان آرٹس :

علوم ریاضی :

۱۔ علم حرکت ۔ مصنفہ بابو ساسی بھوشن مکرجی چھپنے کے لیے تیار ہے۔

۲۔ علم نجوم ۔ مصنفہ منیر ترجمہ ہو کر چھپنے کے لیے تیار ہے۔

۳۔ علم سکون ماہیت و سیالات مصنفہ بنیٹ صاحب ۔ ہائی پروفیشنی کے تعلیم تک ترجمہ ہو گیا۔

۴۔ علم مثلث کروی صرف ایک حصہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

۵۔ علم ہندسہ بالجبر ۔ مصنفہ ٹاؤ ہنٹر ترجمہ ہو کر چھپنے کے لیے تیار ہے۔

۶۔ ٹاؤ ہنٹر کی کتاب اقلیدس مجسم ۔ ابھی ترجمہ نہیں ہوئی مگر غالباً کتب درسی میں سے خارج کی جاوے گی۔

۷۔ ٹاڈ ہنٹر کا علم مثلث۔ آخری حصہ ترجمہ ہو رہا ہے۔ باقی ماندہ چھپا ہوا مل سکتا ہے۔

تواریخ و ترجمہ:

۸۔ الفنسٹن صاحب کی تواریخ ہند۔ جس کا ترجمہ ابھی نہیں ہوا مگر اُردو سے فوراً ہندی میں لکھی جا سکتی ہے اور نیز ایک سالہ مصنفہ راجہ شیو پرشاد صاحب انسپکٹر مدارس ممالک مغربی و شمالی۔

۹۔ ہیوم صاحب کی تواریخ انگلستان۔ اِس کا ہندی میں خلاصہ کیا گیا ہے۔

کتابیں جو شائع ہو رہی ہیں

فولر صاحب کی کتاب منطق بزبان اُردو مصنفہ مدن گوپال صاحب ایم اے

علم حرکت بزبان اُردو مُصنفہ بابو ساسی بھوشن صاحب مکرجی ایم۔ اے۔

علم سکون بزبان ہندی مصنفہ پنڈت کرپا رام صاحب۔

علم سکون بزبان اُردو مصنفہ لالہ آیا رام صاحب۔

ٹیلر صاحب کی تواریخ متقدمین بزبان ہندی مصنفہ بھائی گورمکھ سنگھ صاحب۔

سنین اِسلام حصہ اول مصنفہ ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر صاحب (بار دوم)

حکیموں کی جماعت کے لیے درسی کتابیں یہ ہیں:

الف حکیم حاذق کی جماعت کے لیے:

۱۔ قانونچہ (مقالات علمی)

۲۔ موجز (مقالات علمی)

۳۔ طب اکبر (مقالات علمی)، معہ رسائل نبض، قارورہ، دبجران۔

۴۔ تشریح الابدان۔

۵۔ قرابادین، دربیان ادویہ مفرد و مرکبہ۔

(ب) عمدۃ الحکما کی جماعت کے لیے:

(۱) اقصرائی، (۲) سدیدی، (۳) تشریح الافلاک، (۴) مفرح القلوب، (۵) حدود الامراض، (۶) بحرالجواہر۔

(ج) زبدۃ الحکما کی جماعت کے لیے:

(۱) شرح اسباب (۲) نفیسی، (۳) کلیات قانون بوعلی سینا معہ شرح، (۴) حمیات قانون شیخ بوعلی سینا، (۵) تلخیص جالینوس مصنفہ بقراط متحشی جالینوس۔

(مندرجہ بالا خاص کارروائی کی کتابیں ہیں جس سے تمام حکیموں کے لیے کامل طور پر واقفیت ضروری ہے۔)

بزرگوں کی جماعتوں کے لیے مندرجہ ذیل کتب مقرر ہیں:

(الف) امتحان بیدک پنجاب یونی ورسٹی کالج:

شارنگھدر سنگتا، مادھو ندان، مدن پال، نرگھنٹ دو پدیش شتک، کوٹ لاگر۔

(ب) امتحان بھیکھک:

بھاولبرکاش، بنگ سین، چکردت، جواتر بھاسکر، سنیات چندرکا۔

(ج) امتحان مہا بھیکھک:

چرک، سکتہ، شنشرت، واگ بہت، ھر ہماسکتا (منتخبات)
ھر بیتی سکتا، منتخبات)

--------+.......----

امتحانات آرٹس کی کتب درسی کی فہرست

صیغۂ علوم مروجہ

اوّل جماعت اِنٹرینس

۱۵ طلباء

مضامین	کتب درسی مطبوعہ یا قلمی	معلم
ریاضی	بارنارڈ سمتھ کے حساب کی کتاب (اردو) ٹاڈہنٹر صاحب کا جبر و مقابلہ (اردو) ٹاڈہنٹر صاحب کا اقلیدس (اردو) ٹاڈہنٹر صاحب کا مساحت (اردو) لمترح صاحب کی تواریخ (اردو) کولیر صاحب کی تواریخ انگلستان (اردو)	مولوی غلام مصطفی بائی پروفیشنی
تواریخ جغرافیہ	لمہترح صاحب کی تواریخ (اردو) کولیر صاحب کی تواریخ انگلستان (اردو) جغرافیہ عام، مفتاح الارض (اردو) جغرافیہ ہند بلین فورڈ صاحب کا جغرافیہ طبعی (اردو)	مولوی دلاور علی پروفیشنی اِن آرٹس
علم طبعی۔	تدریسات علم طبعی مترجمہ ڈاکٹر امیر شاہ	ڈاکٹر امیر شاہ

پہلی اور دوسری جماعت ہائے انٹرینس کو جس میں ۶۴ طلبا ہیں مولوی فاضل محمد غضنفر (انٹرینس) اور منشی فاضل میراں بخش (پروفیشنی) تعلیم دیتے ہیں

دُوم جماعت ہائے پرُوفیشنی

مضامین	کتب درسی مطبوعہ یا قلمی	معلم
منطق قیاسی۔	مصنفہ فاولر صاحب (مطبوعہ)	محمد حسین آیچ۔ ای۔
	مصنفہ مسٹر فاسٹ صاحب (قلمی)	
ریاضی	ٹاڈ ہنٹر صاحب کا علم مثلث (مطبوعہ اردو میں)	مولوی غلام مصطفیٰ
	ٹاڈ ہنٹر صاحب کا علم سکون (مطبوعہ اردو میں)	
	ٹاڈ ہنٹر صاحب اقلیدس (مطبوعہ اردو میں)	
	ٹاڈ ہنٹر صاحب کا جبر و مقابلہ (مطبوعہ اردو میں)	
	ٹاڈ ہنٹر صاحب کا حساب (مطبوعہ اردو میں)	
تواریخ و جغرافیہ	ٹیلر صاحب کی تواریخ متقدمین کا جغرافیہ طبعی (کتاب سے لیکچر طلبا کو لکھا دیتے جاتے ہیں)	دلاور علی شاہ
علم طبیعات	علم کیمیا مصنفہ راسکو صاحب، (مطبوعہ)	ڈاکٹر امیر شاہ
	علم طبعی مصنفہ بالفور سٹوارٹ (قلمی)	

سوم جماعت ہائے ہائی پروفیشنی (۸ طلبا)

مضامین	کتب درسی مطبوعہ یا قلمی	معلم
	علم سکون مائیات و سیالات، مولفہ بجنٹ صاحب مطبوعہ	
	علم نجوم۔ مصنفہ مین صاحب (جو تیار ہوتا جاتا اور چھپتا جاتا ہے۔	
	علم حرکت۔ مولفہ بابو شانمشتی کبنوشن لل مطبوعہ	علم...
	علم مثلث۔ مصنفہ ٹاڈ ہنٹر صاحب (مطبوعہ)	

ہندسہ بالجبر۔ مصنفہ ٹاؤہنٹر صاحب (مطبوعہ)
اقلیدس مجسم ۔ مصنفہ ٹاؤہنٹر صاحب، (مطبوعہ)
منطق مصنفہ فاؤلر صاحب نصف سے زیادہ ترجمہ
استقراری ہو کر چھپ گئی ہے۔ اور باقی تیار ہو رہی ہے۔ محمد حسین
اور کتاب سے لیکچر طلبا کو لکھا دیتے جاتے ہیں

مضامین	کتبُ درسی مطبوعہ یا قلمی	معلم
تواریخ	تواریخ ہند مصنفہ الفنسٹن صاحب (مطبوعہ) ہیوم صاحب کی تاریخ انگلستان۔ اِس کتاب سے لیکچر لکھوائے جاتے ہیں۔ مصنفہ فاسٹ (قلمی) مصنفہ مسٹر ل وسینئیر (مطبوعہ۔)	

چہارم جماعت انٹرینس (تواریخ) ۲ طلبا

۱۔ تواریخ انگلستان گرین صاحب کی تواریخ کلاں۔
۲۔ تواریخ ہند۔ جس میں ہندوستانی مورخوں کی تاریخوں سے بھی واقفیت ہو مثلاً پرایچ ایکیٹ صاحب کی کتاب جس میں ہندوستانی مورخوں کا بیان ہے۔
۳۔ کن سٹی ٹیوشن آل ہسٹری یعنی تواریخ انتظام ملک۔
۴۔ جیارج سوم کے عہد کی کامل ومفصل تاریخ جیسا کہ سے صاحب کی تواریخ انگلستان متعلقہ عہد جارج سوم۔ والیس صاحب کی تواریخ یورپ اور برمین صاحب کی کتاب جس میں جیارج کے عہد کے عالماں کا ذکر ہے اور بیر دین صاحب کا بیان نسبت اراکین سلطنت متعلقہ عہد جیارج سوم کے مطالعہ سے واقفیت ہوتی ہے۔ اِس عہد کی تواریخ انتظام ملک کا آرسکین می صاحب کی

تواریخ ملک سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔

۵۔ سیاستِ مدن } سپرنٹنڈنٹ صاحب لیکچر دیتے ہیں اور عمر بخش
۶۔ تاریخ ترقی شائستگی } بی۔اے کتب درسی کا ترجمہ کرتا ہے

(ب) کتبُ ہندی

جماعت انٹرینس (۱۰ طلبا)

مضمون	کتب درسی یا مطبوعہ یا قلمی	معلم
ریاضی	کتاب حساب مصنفہ بارنارڈ صاحب لیکچر	بابو (ایچ۔اے)
	جبر و مقابلہ۔ مصنفہ ٹاؤ ہنٹر صاحب	
	اقلیدس مطبوعہ آگرہ۔	
	علم مساحت مصنفہ ٹاؤ ہنٹر صاحب۔	
تخمینہ:	طلبا کو اور کتب ریاضی مثل تصنیفات بابو دیو شاستری وغیرہ پڑھنے کو مل جاتی ہیں اور جس بات کی پھر بھی کمی رہ جاتی ہے اِس کی تکمیل لیکچروں کے ذریعہ ہو جاتی ہے۔	
تواریخ	لیتھرج صاحب کی تواریخ ہند۔	
جغرافیہ	لیتھرج صاحب کی تواریخ انگلستان۔	
	تمر ناسک یعنی تواریخ ہند مصنفہ راجہ شو پرشاد طلبا کو پڑھائی جاتی ہے۔	بابو پنجاب (ایچ۔ای)
	جغرافیہ طبعی مصنفہ مکین فورڈ صاحب (لیکچر)	
	جغرافیہ عام مصنفہ کلارک صاحب (لیکچر)،	
	مصنفہ لچھمی شنکر	
علم طبعی	تتو بودھ	ڈاکٹر امیر شاہ

انٹرینس جماعت کے دوسرے درجے کو جس میں بائیس طلباء ہیں

پنڈت ہرمکند شاستری (انٹرینس) تعلیم دیتے ہیں۔

جماعت ہائے پروفیشنی (۴ طلبا)

مضامین	کتب درسی مطبوعہ یا قلمی	معلم
علم ریاضی	جبر و مقابلہ مصنفہ ٹاؤنہنٹر صاحب، لیکچرر	بھائی گورمکھ سنگھ ایف۔ اے
	علم مثلث مصنفہ لچھمی شنکر مصر،	بابو پنچانن، ایچ۔ ای
	علم سکون (قلمی) مصنفہ ٹاؤنہنٹر صاحب	بھائی گرمکھ سنگھ
	اقلیدس مقالہ چھٹا و گیارہواں مولفہ کرپارام	
تواریخ و جغرافیہ	تواریخ قدیم مصنفہ ٹیلر صاحب (یونان کے عہد تک چھپ چکی۔)	بابو گرمکھ سنگھ
	جغرافیہ طبعی مصنفہ: بیچ صاحب۔	
منطق	فاولر صاحب کی کتاب منطق۔ قلمی۔	بابو پنچانن
	سیاست مدن۔ مصنفہ فاسٹ برائے ہندیاں۔	گرمکھ سنگھ
علم طبعی	علم کیمیا مصنفہ راسکو صاحب۔	ڈاکٹر امیر شاہ

جماعت ہائے پروفیشنی (۲ طلباء)

ریاضی	علم حرکت مصنفہ ٹاؤہنٹر۔ قلمی۔
	علم سکون آب مصنفہ بینسٹ قلمی۔
	علم نجوم مصنفہ مین صاحب، قلمی۔
علم ریاضی	علم ہندسہ بالجبر مصنفہ ٹاؤہنٹر (قلمی)
	علم مثلث مجسم مصنفہ ٹاؤہنٹر (قلمی)
	علم مثلث مصنفہ لیس صاحب۔
تواریخ	سوم صاحب کی تاریخ انگلستان۔ (مختصر قلمی)

انفنسٹن صاحب کی تاریخ ہند تا عہد اکبر (قلمی)
تواریخ ہند مصنفہ مکفرلیین یا مارس مین صاحب حصّہ دوم لیکچر
تواریخ متقدمین و متاخرین (مصنفہ ٹیلر صاحب)
تواریخ قدیم میں سے عہد یونان تک چھپ گئی ہے۔
تواریخ قدیم میں رومن کا عہد اور کل تاریخ متاخرین قلمی تیار ہے۔
جغرافیہ طبعی مصنفہ پیج صاحب قلمی۔
سیاست مدن مصنفہ فاسٹ صاحب قلمی۔

(ج) جماعتِ انٹرینس (گرمکھی) ۱۱ طلبا

حساب (ریدہ حصہ اول و گنت منجری، ایک اور رسالہ چھپ رہا ہے
جبر و مقابلہ (اردو لیکچر و بیج گنت۔
اقلیدس۔ (ریتہاس تمر ناسک)

تاریخ انگلستان لیکچر	جوگی شیونا تھ و شارو
جغرافیہ عام	بھوگول درپن (انٹرینس)

مضامین برائے خاص جماعت ہائے قانون

(الف) اصول علم فقہ۔ کتاب مولفہ بابو شاشی بھوشن ایم اے پی ایل پلیڈر ہائی کورٹ کلکتہ۔ قوانین متعلقہ سیاست ملک دگورنمنٹ واجبان قوانین ہند کا ظہور اور اس کے اختیارات، صیغہ جات سرکاری، اور ملک کے عام کفایت شعاری کے قانون۔

(ب) قانون مال۔ (آئین سرکارات اور احکام و متعلقہ مال
(ج) قانون دیوانی۔ (جس میں حقوق ذاتی و جائداد و مشاہرہ شامل ہیں)

(د) قانون فوجداری اور مجموعہ فوجداری — لیکچر صاحب لیکچرار قانون پنجاب
(ہ) قانون شہادت و معیاد اسٹامپ وغیرہ — یونی ورسٹی کالج دیتے ہیں۔

. . . . + ...

سِول سَروِس کے امتحانات کے لیے قوانین اور نصابات

(ہمصفحہ ۱۱۲) - نمبر ۱۵ - مضمون بابت ترمیم قواعد سول سروس کے۔

مصنفہ جی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر صاحب بہادر پریسیڈنڈنٹ انجمن پنجاب۔

بروز چہار شنبہ انجمن کا جلسۂ عام منعقد ہوا۔ اِس میں اِن قباحتوں کا ذکر کیا جو لندن جانے کے سلسلے میں طلبا کو پیش آسکتی تھیں۔ لہٰذا اِس پر غور کیا گیا اور مندرجہ ذیل طریقے اپنانے کی تجویز پیش کی گئی۔

تدبیر تجدید طریقہ سول سروس کے

اوّل اِمتحان سے عہدہ ہائے معتمد کا ملنا اور طریقہ امتحان

پیروی تدبیر کمشنران سول سروس کے جو کہ فی الحال ولایت میں جاری ہے علی الخصوص بہ نسبت منتخب امیدواران کی اکثر باتوں میں۔ وہی قائم رکھی جائے لیکن امتحان داخلہ جس کے سبب سے ایک آدمی مقرر ہو سکتا ہے حسب ذیل ہونا چاہیئے اور یہ مطالب اختیاری ہوں:

نمبر ہائے مطالب اختیاری بموجب ذیل کے ہیں:

زبان اور انشا انگریزی اور تاریخ انگلینڈ	۱۰۰۰
ترکیب عبارت انگریزی	۵۰۰

زبان ھائے عتیق:

زبان اور تصنیفات یونانی اور تاریخ یونان	۷۵۰

زبان اور تصنیفات لاطینی اور تاریخ روم قدیم ۷۵۰

زبان اور تصنیفات عربی و تاریخ ۷۵۰

زبان اور تصنیفات سنسکرت و تواریخ ۷۵۰

زبان ھائے جدید :

زبان اور تصنیفات فرانسیسی اور تاریخ فرانس ۳۷۵

زبان اور تصنیفات جرمنی اور تاریخ جرمن ۳۷۵

زبان اور تصنیفات اٹلی اور تاریخ اٹلی ۳۷۵

زبان اور تصنیفات ہندوستانی اور تاریخ ہند ۳۷۵

زبان اور تصنیفات فارسی ۳۷۵

علوم ریاضی ۱۲۵

علوم زباندانی یعنی فلالوجی ۷۵۰

علوم طبعی مندرجہ ذیل سے کوئی تین ہوں :

علم حیوانات، علم نباتات، علم معدنیات ۷۵۰

علم طبیعات زمین، کہربا، علم کیمیا وغیرہ ۷۵۰

علم مابعد الطبیعات وعلم اخلاق بمعہ دیسی اخلاق وغیرہ ۵۰۰

امیدوار کو کم سے کم چہارم ان اعداد کا حاصل کرنا واجبات سے ہوگا فائدہ اس تدبیر کا یہ ہے کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے واسطے یکساں مناسبت رکھی گئی ہے۔ اگر ہندوستان میں امتحان کا لیا جانا تجویز کیا جائے تو یہ تدبیر ہندوستان میں بآسانی اجرا پاسکتی ہے۔ اور بیان ذیل سے اس تدبیر کی خوبی واضح ہوسکتی ہے۔

یہ تجویز انگریزوں اور ہندوستانیوں کے لیے یکساں ہے۔

ریاضیات	۱۲۵۰
علوم طبعی	۷۵۰
علوم اخلاق و مابعد الطبیعات	۵۰۰
علوم زبان یعنی کمپیرتف گرائمر وغیرہ	۷۵۰

زبان ہائے عتیق جو صرف انگریزوں کے لیے ہیں:

زبان لیٹن	۷۵۰
گریک، یونانی	۷۵۰

یہ زبان ہائے عتیق صرف ہندوستانیوں کے لیے ہیں:

عربی	۷۵۰
سنسکرت	۷۵۰

زبان ہائے عتیق مغربی خواہ مشرقی میں اگر استعداد امیدواروں کی مساوی ہے یعنی امتحان میں برابر نمبر ملے ہوں تو درجہ بھی ہر ایک امیدوار کا برابر ہونا چاہیے۔

یہ زبان ہائے جدید انگریزوں کے لیے ہیں:

فرانسیسی زبان	۳۷۵
زبان اٹلی	۳۷۵
جرمنی	۳۷۵

یہ زبان ہائے جدید علمی دیسی لوگوں کے لیے ہے:

ہندوستانی	۳۷۵
فارسی	۳۷۵

قواعد امتحانات

امتحان زبان ہائے دیسی علوم مشرقی، سنسکرت، عربی، فارسی، اُردو ہندی، بھاشا، ۲۴ر فروری، ۱۸۶۵ء کے جلسے میں ممبروں کی اتفاق رائے

امتحانات کی متعلق معلوم کی گئی۔ یہ تجویز پسند کی گئی۔ ۳ر مارچ، ۱۸۶۵ء کو تجویز پیش کی گئی۔ ۶ر جولائی، ۱۸۶۵ء میں اس کا نفاذ ہوا۔

کمیٹی امتحان عربی:

ڈاکٹر لائٹنر و فقیر سید شمس الدین	پریذیڈنٹ
مصر رام داس	ممبر
مولوی علم دار حسین	ممبر
مولوی محمد حسین	ممبر

ان کے علاوہ سیکریٹری کو ممبر بڑھانے کا اختیار ہے۔

قواعد زبان عربی (اعلیٰ):

اس زبان کا امتحان تین درجوں میں ہوگا۔ اعلا، اوسط، ادنا ہر درجے میں چند مراتب ہوں گے۔ مندرجہ ذیل میں امتحان لیا جائے گا:

(۱) صرف و نحو، (۲) علم و ادب، (۳)، انشاء (۴) املا، (۵) خوش خطی، (۶) تلفظ،

امتحان درجہ اعلیٰ:

۱۔ صرف و نحو میں شافیہ و شرح ملّا جامی تک کے سوالات ہوں گے اس سے اوپر کوئی بات نہیں پوچھی جائے گی۔

۲۔ علم و ادب:۔ تاریخ تیموری و نصف دیوان متن کی کچھ عبارات و اشعار کا ترجمہ عبارت سلیس اردو میں کرایا جائے گا اور بعض الفاظ و لغات کی تحقیقات لغوی بھی پوچھے جائیں گے۔

۳۔ انشاء :- کوئی مضمون بنا کر اس کا جواب عربی میں لکھوایا جائے گا۔ اور ترجمہ اردو سے عربی میں کروایا جائے گا۔

۴۔ املا :- کچھ عبارت غلط اور بے ربط دی جائے گی اس کو حسب قاعدہ صرف و نحو فصاحت و بلاغت کے صحیح کرنا ہوگا۔ اور زبانی بتائی ہوئی عبارت لکھنی ہوگی۔

۵۔ خوش خطی :- اگرچہ امتحان خوش نویسی کا نہ ہوگا لیکن اسلوبی اور بد اسلوبی تحریر دیکھی جائے گی۔

۶۔ تلفظ :- کسی کتاب کو پڑھوا کر تلفظ دیکھا جائے گا اور کچھ گفتگو بھی کی جائے گی۔

اِمتحان درجہ اوسط

۱۔ "مراح الارواح" تک صرف میں اور کافیہ تک نحو میں سوالات ہوں گے۔ یعنی جو سوالات ہوں گے اِن ہی کتابوں کے اور ان سے پیچھے کی کتابوں کے اندر ہوں گے یا ہر نہ ہوں گے۔

۲۔ دیوان حیدر کرار و انشاء عجب العجابات کی کچھ عبارت کا سلیس اُردو میں ترجمہ کرایا جائے گا۔

۳۔ کچھ آسان اردو کا عربی میں ترجمہ کرنا ہوگا۔

۴۔ عربی کی غلط عبارت کو صحیح کرنا ہوگا اور کچھ زبانی عبارت کو صحیح لکھنا ہوگا۔

۵۔ اگرچہ خوش نویسی کا امتحان نہ ہوگا لیکن اسلوب اور غیر اسلوب تحریر دیکھی جائے گی۔

۶۔ کچھ عبارت پڑھوائی جائے گی اور کچھ زبانی سنی جائے گی۔

امتحان درجہ ادنیٰ

۱۔ پنج گنج و دستور المبتدی تک صرف میں اور ہدایت النحو تک نحو میں سوالات ہوں گے۔
۲۔ منتخبات عربی اور دس رات الف لیلیٰ کی۔ کچھ عبارت کا ترجمہ سلیس اردو میں کرنا ہوگا۔
۳۔ چند چھوٹے چھوٹے فقروں، پند سود مند اردو کا عربی میں ترجمہ کرنا ہوگا۔
۴۔ کچھ غلط عربی کی عبارت کی تصیح کرنا ہو گی۔
۵۔ خوش نویسی کا امتحان نہ ہوگا لیکن اسلوبی اور غیر اسلوبی عبارت دیکھی جائے گی۔
۶۔ عبارت پڑھوا کر تلفظ سنا جائے گا۔

کمیٹی امتحان بزبان فارسی

۱۔ نواب نوازش علی خان،	پریذیڈنٹ
۲۔ نواب عبدالمجید خان،	ممبر
۳۔ پنڈت من پھول،	ممبر
۴۔ سید رضا شاہ	ممبر
۵۔ شیخ فیروزالدین،	ممبر
۶۔ محمد برکت علی خان،	ممبر
۷۔ ملک پھرایا لعل	سیکرٹری

کمیٹی کو ممبروں کے اضافے کا اختیار ہے۔

قواعد امتحان زبان فارسی

اِس زبان کا امتحان چھ مراتب مندرجہ ذیل میں لیا جائے گا:

(۱) صرف و نحو، (۲) علم وادب، (۳) انشاء، (۴) املا، (۵) خوش خطی، (۶) تلفظ۔

۱۔ صرف و نحو کا امتحان کتاب چار گل زار میں ہوگا۔

۲۔ علم وادب:۔ علم وادب کا امتحان ہرسہ دفتر ابوالفضل، قصائد عرفی، میں ہوگا اور کچھ عبارت ان دونوں کتابوں کے کچھ حصے کا ترجمہ زبان سلیس اردو میں کرنا ہوگا۔

۳۔ انشاء:۔ کوئی مضمون بنا کر جواب فارسی میں لیا جائے گا جس سے قوت ذہنی اور طاقت زبان دانی معلوم ہو۔ دوم کچھ عبارت اردو سے فارسی میں ترجمہ کرائی جائے گی۔

۴۔ املا:۔ نحو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے کچھ عبارت غلط دی جائے گی۔ اسے درست کرنا ہوگا۔ کچھ عبارت زبانی دے کر لکھوائی جائے گی۔

۵۔ خوش خطی:۔ اسلوبی اور غیر اسلوبی عبارت لکھوائی جائے گی۔

۶۔ تلفظ:۔ کچھ عبارت پڑھوا کر سنی جائے گی اور زبانی گفتگو کی جائے گی۔

کمیٹی امتحان زبان اردو

دیوان بیج ناتھ، پریذیڈنٹ،

پنڈت من بھول۔ ہرسکھ رائے۔ ڈاکٹر رحیم خان، ممبران۔

پنڈت سورج بھان، سیکرٹری

(کمیٹی کو ممبر بڑھانے کا اختیار ہوگا)

قواعد امتحان اُردو

اِس زبان میں امتحان کے سات مراتب ہوں گے :

(۱) صرف و نحو، (۲) علم و ادب یعنی زبانی دانی،
(۳) تاریخ دانی، (۴) انشاء، (۵) املا،
(۶) خوش خطی، (۷) تلفظ

۱۔ صرف و نحو :- صرف اِس قدر صرف و نحو عربی فارسی کی پوچھی جائے گی جو اردو کے لیے لازمی ہے۔

۲۔ علم و ادب :- عبارت نظم و نثر اردو کے معنی اور بعض فقروں کی ترکیب اور بعض الفاظ کی اصل اور بعض الفاظ کا تاریخی حال اور جو مضامین قصہ طلب ہوں گے ان کا مفصل قصہ دریافت کیا جائے گا۔

۳۔ تاریخ :- تاریخ مصر، مرتبہ سائنٹیفک سوسائٹی، علی گڈھ میں سے سوالات ہوں گے

۴۔ انشا :- دو ایسے مضمون دے کر ان کے جواب اردو میں ہی لیے جائیں گے۔ مثلاً ایک یہ کہ علم تاریخ کے کیا کیا فائدے ہیں۔ دوسرا یہ کہ مثلاً تجارت، بیوپار وغیرہ سے کیا کیا منافع ہے۔

۵۔ اِملا :- کچھ عبارت زبانی بتلا کر لکھوائی جائے گی کچھ عبارت کی تصحیح کروائی جائے گی۔

۶۔ خوش خطی :- تحریر کا اسلوب اور غیر اسلوب دیکھا جائے گا۔

۷۔ تلفظ :- کچھ عبارت پڑھوا کر تلفظ دیکھا جائے گا۔

کمیٹی اِمتحان سنسکرت

پنڈت رادھا کشن، پریذیڈنٹ

پنڈت رام دت۔ بابو نوبین چندر۔ بابو شیاما چرن، ممبران۔

قواعد امتحان سنسکرت

اِس زبان کا امتحان دو درجے کا ہوگا:

(اول) اول درجے کے امتحان میں ایک خاص مضمون اِس باب میں لکھنا ہوگا کہ اپنی گرہست میں انسان کو اپنے رشتہ داروں سے کس طرح برتاؤ کرنا چاہیئے؛ اور رشتہ دار کیسے کیسے ہوتے ہیں اور گھروں میں کیا کیا بات واجب اور غیر واجب ہے۔ دوسرے بیاکرن اور رگھوسین اور بربودہ چندر اودے ناٹک اور سرب درشن سنگرہ پستونگ میں سوالات کے جوابات لیے جائیں گے۔

(دوم) درجہ میں جو سوالات دیئے جائیں گے اِسی وقت ان کا جواب دینا ہوگا۔ کچھ ترجمہ سنسکرت بھاشا کا ہندی بھاشا میں اسی وقت کرایا جائے گا۔ سنسکرت میں سنسکرت مالا سنسکرت پٹھواوپکارک سے ترجمہ ہندی بھاشا میں کرنا ہوگا۔

کمیٹی امتحان ہندوی بھاشا

بابو نوبین چندر رائے، پریذیڈنٹ،

بابو چندر ناتھ، پنڈت بسنت رام، ممبران۔

اِس امتحان کے دو اقسام ہوں گے:

(۱) ہر ایک انسان کو لازم ہے کہ حتی الامکان اپکاریکا یعنی بیگانے کا میں شدھی کرے یا اپنے ہم جنس کو فائدہ پہنچائے۔ پس دلائل سے ثابت کیا جائے کہ پراوپکار کتنی طرح ہو سکتا ہے۔

(۲) راست بازی کی ضرورت اور اس کے فوائد دلائل سے ثابت کئے جائیں

اِن دونوں میں سے ایک مضمون ٹیٹھ ہندی میں لکھنا ہوگا۔ جس میں ایک لفظ بھی فارسی عربی کا نہ آئے۔

قسم دوم۔ امتحان کے وقت ایک پرچہ سوالات کا دیا جائے گا۔ جس میں سوالات آسان چاری بیدانت اور نیت شاستر کے ہوں گے۔ اور جواب

اسی وقت لکھنا ہوگا۔ زبانی امتحان بھی ہوگا۔

۳۔ چند اشلوک بہت آسان ایک پرچہ میں دیئے جائیں گے۔ آسان بھاشا میں اس کا ترجمہ کرنا ہوگا۔

..........+..........

کتابیات

ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر
"تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"،
لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، (اردو ادب)، نویں جلد (چہارم
۱۹۱۴ء - ۱۸۵۷ء)

ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر
"غزل اور متغزلین"، لاہور: اردو مرکز، ۱۹۵۴ء
(طبع اول)

ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر
"معیار شعر و سخن" (مضمون)، "نگار"
کراچی: ۱۹۴۶ء، (انتقاد نمبر)

اختر رضوی (مترجم)
"تاریخ سندھ المعروف بہ معصومی" از میر محمد معصوم بھکری،
حیدرآباد (پاک)" سندھی ادبی بورڈ، سن ندارد

اسمٰعیل پانی پتی، شیخ (مرتب)
"مقالات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، سن ندارد،
حصص ہفتم و ہشتم

اکرم، شیخ محمد
"رود کوثر"، لاہور: سن ندارد، اشاعت سوم، (طویل اضافوں

کے ساتھ)

امیر بدایونی، قاضی

"بہترین غزل گو"

آزاد، مولانا محمد حسین

"آبِ حیات"، لاہور: شیخ مبارک علی،

آزاد، مولانا محمد حسین

"تقریر"، جلسہ منعقدہ، ۱۵ اگست، سنہ ۱۹۶۸ء

آزاد، مولانا محمد حسین

"سخن دان فارس"، لاہور:

آزاد، مولانا محمد حسین

"نظم آزاد"، لاہور: لکشمی مینشن، دی مال،

آغا افتخار حسین، ڈاکٹر

"یورپ میں اردو"، لاہور: مرکزی اردو بورڈ،

باری،

"کمپنی کی حکومت" لاہور: مکتبہ اردو، سنہ ۱۹۴۰ء

باسو میجر

"تاریخ التعلیم"

باسو میجر،

"تاریخ باسو"، جلد پنجم

بروس، ایف، جی،

"اے ہسٹری آف دی یونی ورسٹی آف دی پنجاب"، لاہور: سنہ ۱۹۳۳ء

ٹینس،

"سوانح راجہ رام موھن رائے (انگریزی)"، بحوالہ

"مسلمانوں کا روشن مستقبل"

چٹرجی، ایس۔ کے،
"بھارتیہ آریہ بھاشا اور ہندی"، دہلی: راج پرکاش، ۱۹۵۲ء

حالیؔ، خواجہ الطاف حسین،
"حیات جاوید"، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۳۹ء

سید محمود،
"تاریخ التعلیم"،

سید محمود،
"درباب اشاعت وموجودہ حالت اعلیٰ تعلیم انگریزی کی مسلمانوں میں بعہد انگریزی سو برس کے گزشتہ زمانے میں یعنی من ابتدائے ۱۷۹۳ء ۔ ۱۸۹۳ء" (لیکچر)
آگرہ: مفید عام پریس، سن ندارد

صدیق الرحمٰن قدوائی،
"ماسٹر رام چندر" دہلی: ادبی پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۱ء
سن ندارد

طالب، محمد فدا علی (مترجم)
"تاریخ فرشتہ"، از محمد قاسم فرشتہ، حیدرآباد دکن: سن ندارد

طفیل احمد منگلوری،
"مسلمانوں کا روشن مستقبل"، بدایوں: نظامی پریس، ۱۹۴۰ء۔

عباد اللہ کیانی،
"گرو گرنتھ اور اردو"، لاہور: مرکزی اردو بورڈ

عبادت بریلوی، ڈاکٹر،
"اردو تنقید کا ارتقا"، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،

سنہ ۱۹۶۱ء، (طبع ثانی)

عبادت بریلوی، ڈاکٹر،

"جدید اردو شاعری"، (مضمون)، "اردو دنیا"، کراچی:

عبدالحق، ڈاکٹر مولوی،

"سر سید احمد خان۔ حالات و افکار"، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان)، سنہ ۱۹۵۹ء

عبدالحمید صدیقی (مترجم)

"نظام تعلیم کا اساسی تخیل" (یادداشت از لارڈ میکالے)

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر

"تاریخ یونی ورسٹی اورینٹیل کالج، لاہور"، لاہور: جدید اردو پریس، سنہ ۱۹۶۲ء

فرخی، ڈاکٹر محمد اسلم،

"محمد حسین آزاد"، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان) حصہ اول،

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر،

"اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" لاہور: مجلس ترقی ادب،

کلیم الدین احمد،

"اردو تنقید پر ایک نظر"، بانکی پور پٹنہ: دائرہ ادب، (طبع اول)

گارسین دتاسی،

"مقالات" دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) سن ندارد، حصہ دوم

محمود خان شیرانی

"پنجاب میں اُردو"، لاہور: مکتبہ معین الادب،

سن ندارد، (طبع سوم)

محمود خان شیرانی، (مرتب)

"مجموعہ نغز"، لاہور: کریمی پریس، ۱۹۳۳ء

وفا راشدی،

"بنگال میں اردو"، حیدر آباد (سندھ): اشاعت اُردو،

ہلال احمد زبیری (مترجم)

"برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف، جامعہ کراچی، ۱۹۶۷ء

"اردوئے معلیٰ"، لاہور: مجلس ترقی ادب،

"کیلنڈر یعنی دستور العمل پنجاب یونی ورسٹی کالج، بابت ۷۵-۱۸۷۴ء،

لاہور: مطبع انجمن پنجاب، (باہتمام: نظام الدین)

"مکاتیب آزاد"

"مکتوبات آزاد"

"منشورات"

"ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے"، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، سن ندارد

رسائل

* رسالہ ا

"رسالہ انجمن پنجاب"، لاہور: مطبع کوہ نور، فروری و مارچ، ۱۸۶۵ء

جلد ا، نمبر ا (باہتمام: سورج بھان، پرنٹر)

" "رسالہ انجمن پنجاب"، لاہور: مطبع کوہ نور، اپریل، ۱۸۶۶ء، جلد ۲،

نمبر ۸ (باہتمام: منشی ہر نرائن، پرنٹر)

"رسالہ انجمن پنجاب"، لاہور: مطبع کوہ نور، مئی، ۱۸۶۶ء، جلد ۲، نمبر ۹

(باہتمام: منشی ہر نرائن پرنٹر)

"رسالہ انجمن پنجاب" لاہور: مطبع کوہ نور، اگست، ۱۸۶۶ء، جلد ۲،
نمبر ۱۲، (باہتمام: منشی ہر نرائن، پرنٹر)
"رسالہ انجمن پنجاب" لاہور: مطبع کوہ نور، ستمبر، ۱۸۶۶ء، جلد ۲،
نمبر ۱۳، (باہتمام: منشی ہر نرائن، پرنٹر)
"رسالہ انجمن پنجاب"، لاہور: مطبع کوہ نور، اکتوبر، ۱۸۶۶ء، جلد ۲،
نمبر ۱۴ (مرتبہ سیکریٹری مطبع کوہ نور و باہتمام: منشی ہر نرائن، پرنٹر)
"رسالہ انجمن پنجاب"، لاہور: مطبع کوہ نور، نومبر، ۱۸۶۶ء، جلد ۲، نمبر ۱۵،
(باہتمام: منشی ہر نرائن، پرنٹر)
"رسالہ انجمن پنجاب"، لاہور: مطبع کوہ نور، ستمبر لغایت دسمبر، ۱۸۶۵ء،
جلد ۲
"رسالہ انجمن پنجاب"، لاہور: اپریل، ۱۸۶۹ء، جلد ۵، نمبر
"رسالہ انجمن پنجاب"، لاہور: جون، ۱۸۶۹ء، جلد ۵، نمبر ۱
"رسالہ انجمن پنجاب"، لاہور: مطبع ترپلاس، جنوری، ۱۸۷۰ء، جلد ۶،
نمبر ۵
"رسالہ انجمن پنجاب"، لاہور: جون، ۱۸۷۰ء، جلد ۶، نمبر ۱
"رسالہ انجمن مفید عام، قصور، ضلع لاہور" قصور: قادری پریس،
جون تا نومبر، ۱۸۷۵ء، جلد نمبر ۲، شمارہ جات ۶، ۷، ۸، ۹،
۱۰، ۱۱ (زیر نگرانی: مرزا فتح محمد بیگ)
"رسالہ انجمن قصور"، قصور: اکتوبر، ۱۸۸۰ء، جلد ۷، (پروسیڈنگ
برائے ۱۸۸۰ء)
"رسالہ انجمن قصور"، قصور: نومبر ۱۸۸۰ء، جلد ۷، نمبر ۱۱، (پروسیڈنگ
برائے ۱۸۷۶ء)
"ضمیمہ اخبار پنجاب"، لاہور: یکم جون ۱۸۷۶ء، نمبر ۲۲

ضمیمہ اخبار انجمن پنجاب یعنی مشاعرہ انجمن پنجاب"، لاہور: انجمن پنجاب، جولائی، ۱۸۷۴ء، نمبر ۲۵
ضمیمہ اخبار انجمن پنجاب یعنی مشاعرہ انجمن پنجاب"، لاہور، اگست ۱۸۷۴ء، نمبر ۳
ضمیمہ اخبار پنجاب یعنی مشاعرہ انجمن پنجاب"، لاہور: انجمن پنجاب، ستمبر، ۱۸۷۴ء، (رجسٹر نمبر ۱۵)، ص نمبر ۴
ضمیمہ اخبار پنجاب یعنی مشاعرہ انجمن پنجاب"، لاہور: مطبع انجمن پنجاب، اکتوبر، ۱۸۷۴ء، (رجسٹر نمبر ۱۵)، نمبر ۵
ضمیمہ اخبار پنجاب، یعنی مشاعرہ انجمن پنجاب" لاہور: مطبع انجمن پنجاب، نومبر و دسمبر، ۱۸۷۴ء، (رجسٹر نمبر ۱۵)، نمبر ۷
ضمیمہ اخبار پنجاب، یعنی مشاعرہ انجمن پنجاب" لاہور: مطبع انجمن پنجاب، جنوری، ۱۸۷۵ء، نمبر ۷
"ضمیمہ اخبار پنجاب، یعنی مشاعرہ انجمن پنجاب"، لاہور: مطبع انجمن پنجاب، مارچ ۱۸۷۵ء، نمبر ۸
"آج کل"، دہلی: ۱۵/ اکتوبر، ۱۹۳۳ء
"تہذیب الاخلاق"، علی گڈھ: جلد دوم،
"سراج الاخبار"، لاہور: سراج المطابع، ۶/ ستمبر، ۱۸۶۶ء، روز دوشنبہ، جلد ۲، نمبر ۳۶۔
"سول اینڈ ملٹری گزٹ"، (روزنامہ)، لاہور: ۱۰/ جون، ۱۸۷۸ء
"کوہ نور"، لاہور: روز دوشنبہ، ۱۱/ مارچ ۱۸۵۰ء، نمبر ۹
"گزٹ"، لاہور: ۱۹/ فروری، ۱۹۵۰ء
"گلدستہ" نمبر ۲
"نگار"، کراچی: جنوری، ۱۹۳۶ء، (انتقاد نمبر)

"نگار"، کراچی: حصہ دوم، (سرسید نمبر) (مضمون: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

مختلف رپورٹیں و رُودادیں

او۔سی۔ ہوم بلیک۔ جنوری، ۳۱، ۱۸۷۵ء، نمبر ۲۲

"پروسیڈنگ برائے، ۱۸۷۹ء، بحوالہ "رسالہ انجمن قصور"، بابت نومبر، ۱۸۸۰ء

"پروسیڈنگ برائے ۱۸۸۰ء"، بحوالہ "رسالہ انجمن قصور"، بابت اکتوبر، ۱۸۸۰ء

"رپورٹ" بابت سال ہائے ۶۸۔ ۱۹۶۶ء" لاہور: مطبع گنیش پرشاد ۱۷ اپریل، ۱۸۶۹ء (باہتمام: منشی ہر سکھ رائے و گوبند سہائے)

Memorial of the Anjuman to Government regarding the use of vernacular as the medium of instruction by order of the honourable Governor R. G. Thomson
Office Junior Secretary to Government of Punjab

A Ristory of the University of the Punjab by F. J. Bruce (M. A. Oxon & Syd) University professor of Ristory (Lahore 1933. pages 43-48-92-70